اندازے

فراق گورکھپوری



اسلم کمال

اندازے

ح خالنا

اندازے

فراق گورکھپوری

اِدارۂ فروغِ اُردو، ایبک روڈ (انارکلی) لاہور

قیمت 10/-

بار اول ۱۹۵۶ء

بار دوم ۱۹۶۸ء

محمد طفیل پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر شائع کی

میں یہ کتاب اُن اہلِ نظر حضرات کے نام معنون کرتا ہوں جو ادب پر محض بُری بھلی رائے ظاہر کرکے بیٹھ نہیں جاتے بلکہ جو ادب میں زندگی کی رمزئیت اور زندگی کی دعوت میں فکروتامل پاتے ہیں۔ اور جو زندگی اور ادب میں تبدیلی، ترقی اور انقلاب کی طرف بڑھتے ہوئے بھی گذشتہ ادب اورگذشتہ زندگی کی قدروں کا زندہ احساس کرنا چاہتے ہیں۔

فراق

پیش لفظ

مشہور امریکی ادیب و مفکر امرسن کہتا ھے کہ جب کوئی نئی کتاب مشہور ھوتی ھے اس وقت اپنے مطالعہ کے لئے میں ایک پرانی کتاب اٹھا لیتا ھوں - جس وقت امرسن نے یہ فقرہ لکھا تھا اس وقت وہ ادھیڑ عمر کا ایک آسودہ دماغ اور پختہ کار ادیب بن چکا ھو گا - نئی عمر والے نئی کتابوں پر زیادہ ٹوٹتے ھیں اور امرسن کے بیان کے باوجود کوئی معقول وجہ نہیں کہ ادھیڑ عمر والے بھی شوق سے نئی کتابیں کیوں نہ پڑھیں - نئی کتابیں دو طرح کی ھوتی ھیں - ایک وہ جنہیں نو عمر لکھیں - دوسرے وہ جنہیں ادھیڑ عمر والے لکھیں - ملٹن کی فردوس گم شدہ ، دیوان غالب ، سعدی کی گلستان ، تلسی داس کی رامائن ، ٹیگور کی گیتا نجلی ، اقبال کی ضرب کلیم یہ کتابیں جب نئی نئی نکلی تھیں تو ان کے مصنف سفر زندگی کی آدھی سے زیادہ منزلیں طے کر چکے تھے -

آج اردو دنیا تیزی سے بدل رھی ھے جس کا کم سے کم مجھے افسوس نہیں ھے - میں نئے ادب کا خیر مقدم کرتا ھوں - اسے لبیک کہتا ھوں اس کی طرف تپاک سے اپنے ھاتھ بڑھاتا ھوں - ایک چیز البتہ میں نہیں چاھتا ، وہ یہ کہ ھمارے نوجوان نئے ادب اور نئی شاعری کے سیلاب کی رو میں اس طرح نہ بہہ نکلیں کہ پرانے ادب اور پرانی شاعری سے بالکل بے خبر رہ جائیں - کچھ دنوں پہلے تک اردو شاعری کے لئے ھمارا شوق آزاد تھا - ہزار ھا حلقوں میں شعر و شاعری کے چرچے رھتے تھے - خوش مذاق کے ساتھ یا بدمذاق کے ساتھ - اب صورت حال بدل گئی ھے - اب اسکولوں میں اردو جبریہ سبجکٹ ھے

اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اور کچھ بڑے سرکاری عہدوں کے امتحانوں میں آردو اختیاری موضوع ہے - گھروں اور انجمنوں میں ادب و شاعری کے چرچے کم از کم اس طرح نہیں ہوتے جس طرح پہلے ہوتے تھے - شعرش مرا بمدرسه کہ برد والی بات درپیش ہے - پرانے شاعروں کے کلام سے دو تین غزلیں اور ایک آدھ نظمیں نصاب میں داخل کر دی جاتی ہیں اور بس - لیکن پرانی شاعری کی فضا سے روشناس ہونے کے لئے یہ کافی نہیں - پہلے کے لوگ کم سے کم دس بیس دیوان و کلیات شروع سے آخر تک پڑھ جاتے تھے، کئی چیزیں بار بار پڑھتے تھے، دھراتے تھے، گنگناتے تھے، سنتے اور سناتے تھے اور پرانی شاعری ان کے دل و دماغ میں رس بس جاتی تھی - لیکن اب اهل ملک کی مصروفیتیں بڑھ گئی ہیں - اب نئی نسل کو پرانی شاعری سے روشناس اسی طرح اور صرف اسی طرح کرایا جا سکتا ہے کہ دلی سے لے کر حسرت موہانی تک کے دواوین سے چھ سات سو صفحوں کا ایک جلد میں ایک انتخاب غزلوں کا شائع کر دیا جائے - جس میں اندازاً پندرہ ہزار اشعار ہوں - اسی طرح شروع سے لے کر حالی، اکبر اور اقبال کی بانگ درا تک کی نظموں کا ایک انتخاب شائع کر دیا جائے - ۱۹۳۰ء کے بعد کی شاعری کے لئے ایسے انتخابوں کی ابھی چنداں ضرورت نہیں ہے اور اگر ہے تو یہ مجموعہ یا انتخاب الگ شائع ہو پرانی شاعری سے قابل اطمینان طور پر مانوس ہونے کے لئے درجنوں دواوین و کلیات پڑھنے کی فرصت اکا دکا آدمی کو ہو سکتی ہے لیکن عام طور پر نئی نسل کو اب اتنی فرصت کہاں - دوسرا طریقہ پرانی شاعری سے نئی نسل کو اجنبی اور بے خبر رہنے سے بچانے کا پرانی شاعری پر دلچسپ، قابل اعتماد، اورسیر حاصل تنقید و تبصرے ہیں اس طرف کچھ اهل قلم کی توجه ہو چلی ہے اور محمد حسین آزاد کے جلائے ہوئے چراغ سے چراغ جلتے چلے جا رہے ہیں -

پرانی شاعری کو اچھا یا برا کہہ کر ٹال دینے سے کام نہیں چلتا غور و تامل سے اسے پڑھنا ہے اور اس سے مانوس ہونا ہے خاص کر پرانی غزلوں سے جو شخص اچھی طرح مانوس نہیں اس نے آردو کیا پڑھی اور وہ نیا اردو ادب بھی کیا سمجھے گا؟ خوش نصیب ہیں نئی نسل والوں میں اور نئے ادب کے قدر شناسوں میں وہ لوگ جو پرانی

غزلوں کے سمندر میں ڈوب کر ایسے ایسے موتی نکال لاتے ہیں ، جن کی آب و تاب کو وقت دھندلا نہیں سکا - ایسے اشعار میں کیا نہیں ہے - نفسیاتی تجزیہ و تحلیل ، زندگی کے عقدوں کی ترجمانی ، حیات و کائنات کے سب مسائل پر نہ سہی لیکن کئی اہم مسائل پر تنقید ، تالیف قلب کے سامان ، انسان کی انسانیت کو سجانے اور سنوارنے کی کوشش ، شعور عشق و شعور حسن کی بیداری کے سامان ، غرضیکہ انسانی اور آفاق کلچر کے بہت سے قیمتی عناصر غزلوں کے کئی اشعار میں ہمیں ملتے ہیں - نئی پود کو اپنی جڑیں سوکھ جانے دینا کوئی قابل فخر بات نہیں اور یہ جڑیں وقت کے سینے کی ان گہرائیوں تک پہنچتی ہیں جن کا پتہ متقدمین کی شاعری سے چلتا ہے - پرانی شاعری کل کی کل برائے بیت نہیں تھی مشاہدے اور تجربے سے قدما یکسر بے بہرہ نہیں تھے - اگلوں کو بھی سچ بولنا آتا تھا - اگرچہ تلاش حق میں یہ کارواں کئی بار چال چوک جاتا تھا - اگر آپ قدما کو جھوٹا ہی مانتے ہیں تو یاد رہے کہ کبھی کبھی جھوٹے لوگ بھی سچ بول جاتے ہیں اور بہت قیمتی سچ - ٹالسٹائی کے خیالات و فکریات سے آج کا روس بالکل متفق نہیں ہے لیکن جس انہماک سے آج کروڑوں ترقی پسند روسی ٹالسٹائے کی تصنیفات کو پڑھتے ہیں اس طرح شاید وہ روس بھی جوٹا لسٹائے کو پوجتا تھا ٹالسٹائے کی کتابیں نہیں پڑھتا تھا - نئے انگریزی ادب کا پیش امام ٹی - ایس - ایلیٹ جس نے انگریزی شاعری کی لغت - اسلوب بیان ٹکنیک اور خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا - پرانے انگریزی ادب کو اپنے اندر جذب کر چکا ہے اسے مردہ چیز سمجھ کر نہیں جیتی جاگتی بولتی چالتی چیز جان اور مان کر - یہی حال آڈین اور اسپنڈر کا ہے جو شاعری میں مارکسیت ، اشتراکیت اور انقلاب کے علمبردار ہوتے ہوئے قدیم انگریزی ادب کی بنیاد پر نئے ادب کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں - اقبال - اکبر - جوش - مجاز - زیدی اور جذلی اور ہماری نئی شاعری کے کئی اور نمائندے ہماری قدیم شاعری سے کم مستفید نہیں ہیں - لیکن نثر نگاروں ، شاعروں اور پڑھنے والوں کی نئی نسل عجلت اور سہل پسندی کا غالباً شکار ہو گئی ہے - قدیم ادب سے منہ موڑ چلی ہے - لیکن یاد رہے کہ پرانی شاعری میں بہت نئی چیزیں ہیں - تسلسل تاریخ انسانی و تاریخ ادب کا اٹل قانون ہے - ماضی سے بے خبری ترقی پسندی نہیں ہے نہ ماضی کی قدر شناسی رجعت پسندی اور قدامت پرستی ہے -

اس کتاب کو پیش کرنے میں میری غرض و غایت کیا ہے میں اس خیال سے بہت کم متفق ہوں کہ مشاعروں کی تعریف یا شاعر و شاعری کی صحبتوں کی تعریف تنقید نہیں ہے بسا اوقات یہ تنقید بہت پتے کی ہوتی ہے۔ اور کئی موقعوں پر خطوط، یا تذکروں یا عام بات چیت میں ضمنی طور پر شعر و ادب کے بارے میں جو باتیں قلم یا زبان سے اضطراری حالت میں نکل جاتی ہیں وہ تیر بہ ہدف ہوتی ہیں اُردو ادب کی تاریخ میں بالالتزام مفصل تنقید و تبصرہ لکھنے کا رواج نیا ہے لیکن قدما کا ایک تنقیدی شعور تھا۔ ان کے کچھ جمالیاتی نظریے تھے ورنہ اُن کی شاعری اس قابل ہوتی ہی نہیں کہ جدید تنقید نگاروں کو اُن میں اتنے محاسن نظر آسکیں۔ اور ان کے کلام سے اتنے نکات نکل سکیں۔ ہاں تو میری غرض و غایت اس کتاب کی تصنیف میں یہ رہی ہے۔ کہ جو جمالیاتی وجدانی اضطراری اور مجمل اثرات قدما کے کلام کے میرے کان، دماغ دل اور شعور کی تہوں پر پڑے ہیں انہیں دوسروں تک اس صورت میں پہنچادوں کہ ان اثرات میں حیات کی حرارت و تازگی قائم رہے۔ میں اسی کو خلاقانہ تنقید یا زندہ تنقید کہتا ہوں۔ اسی کو تاثرانہ تنقید بھی کہتے ہیں۔

میں نے اب سے اندازاً تیس برس پہلے اردو شاعروں پر انگریزی تنقیدی مضامین و مقالے لکھنا شروع کئے۔ وہ مضامین کئی انگریزی رسالوں میں نکلے بھی۔ غالب پر ایسٹ اینڈ ویسٹ میں جو میرا مضمون شائع ہؤا تھا اُس کا بہت بڑا حصہ حوالہ دے کر رام بابو سکسینہ نے اپنی تاریخ ادب اردو میں شامل کیا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک غم شاعری و غم عشق درماندگی کی حالت میں رہے۔ پھر مجنوں گورکھپوری سے میل جول کا موقع آیا۔ شاعری اور تنقید کا ذوق پھر چمک اُٹھا لیکن اردو میں ایک ہی آدھ تنقیدی مضامین لکھنے کی نوبت آئی۔ اپنی صحبتوں میں میں اور مجنوں باتوں باتوں میں کئی تنقیدی تجربات اور جملے بول جاتے تھے اور اس طرح دماغ کا نشو و نما جاری رہا۔ اس زمانے میں میں نے عزیز لکھنوی، آزاد انصاری، اقبال، مولانا محمد علی جوہر اور پریم چند پر ہندی رسالوں میں تنقیدی مضامین شائع کئے۔ اس طرح دس بارہ برس گذر گئے۔

پھر نیاز فتحپوری سے تعارف و قربت نے میرے ذوق تنقید کو

آکسایا اور ۱۹۳۲ء سے آردو میں تنقیدی مضامین لکھنے کی طرف میں مائل ہؤا اور آل انڈیا ریڈیو سے تقریر کی دعوتوں نے یہ صورت پیدا کر دی کہ اس سات آٹھ برس کے اندر اندازاً سات آٹھ سو صفحات میرے تنقیدی مضامین کی ضخامت ہو گئی - میری تنقیدی تحریروں کی کتابی صورت میں یہ پہلا مجموعہ ہے - میرے مذاق تنقید پر دو چیزوں کا بہت اثر رہا ہے، ایک تو خود میرے وجدان شعری کا دوسرے یورپین ادب اور تنقید کے مطالعے کا - مجھے اردو شعرا کو اس طرح سمجھنے سمجھانے میں بڑا لطف آتا ہے جس طرح یوروپین نقاد یوروپین شعرا کو سمجھتے اور سمجھاتے ہیں اس طرح ہمارے ادب کی مشرقیت آجاگر ہو سکتی ہے اور اس کی آفاقیت بھی - میں یہ نہیں مانتا کہ اردو ادب و شاعری یا مشرق ادب و شاعری ان اصولوں کے مطابق جانچی پرکھی نہیں جا سکتی - جن اصولوں کے مطابق مغربی شاعری کا جائزہ لیا جاتا ہے -

میں تنقید اسلوب یا اسٹائل (انشا پردازی یا طباعی کے مظاہرہ کے لئے نہیں) کی اہمیت کا قائل ہوں - میری رائے میں نقاد کو یہ کرنا چاہیئے کہ تنقید پڑھنے والے میں بیک وقت لالچ اور آسودگی پیدا کر دے - اسی کے ساتھ ساتھ حیات کے مسائل و کائنات اور انسانی کلچر کے اجزا و عناصر کو اپنی تنقید میں سمو دے - جس شاعر پر قلم اٹھائے اس کی انفرادیت کے خط و خال نمایاں کر دے اور دوسرے شاعروں سے اس کی مشابہت و غیر مشابہت بھی آئینہ کر دے شاعر کے مزاج اور اس کی شخصیت کی زندہ تصویر کھینچ دے اور اس کی شاعری کی قدروں کو حساس زبان میں حیات و نفسیات کی اصطلاحوں میں ایک پوری زندہ اکائی کی شکل میں دکھا دے - تنقید محض رائے دینا یا میکانکی طور پر زبان اور فن سے متعلق خارجی امور کی فہرست مرتب کرنا نہیں ہے بلکہ شاعر کے وجدانی شعور کے بھید کھولنا ہے ناقد کو احساسات اور بصیرتیں پیش کرنا چاہیئے نہ کہ رائیں - اور یہ باتیں تنقید میں بغیر اسلوب یا اسٹائل کے نہیں آ سکتیں - رنگین بیانی یا عبارت آرائی والی اسٹائل میں نہیں بلکہ حساس لہجہ میں سچ بولنے والی اسٹائل کی تنقید میں جچی تلی سچائی کی توفیق آسانی سے نہیں ہوتی - بسا اوقات نقاد کو خود اپنی اور اپنے تاثرات کی تنقید کرنی پڑتی ہے - تنقید کا اثر یہ ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والا ناقد کے بیانوں کی صداقت بھی

محسوس کرے اور چونک بھی جائے اور خود بھی سوچنے اور غور کرنے پر مجبور ہو جائے۔ شاعر کے کلام کے مرکز پر جم کر اس کی نظر وسیع بھی ہو جائے شاعری سے حقیقی معنوں میں کچھ پانے کے لئے بہت رچی ہوئی سماعت کی ضرورت ہے۔ دل ، دماغ ، شعور ، تحت الشعور ، لا شعور سب کان کے پردوں سے جب لگ جائیں تو شاعر کا راز کھلے۔ اسی کو ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ۔ سماعی تخئیل کہتا ہے۔ ایک بات اور۔ اس کتاب میں قریب قریب تمامتر کچھ شعرا کی غزل گوئی کے تنقیدی اندازے ہیں۔ غزل کے مفرد اشعار اور ان کے صوتی اثرات کے تجزیہ سے یہ اندازے شروع ہوتے ہیں پھر پوری غزل کی فضا اور پھر شاعر کی متعدد غزلوں یا پورے دیوان اور سینکڑوں اشعار سے جو مجموعی اثر پیدا ہوتا ہے جو اس کی نفسیات کی جلوہ گری ہوتی ہے جو شخصیت جنم لیتی ہوئی نظر آتی ہے اس پر جا کر یہ اندازے ختم ہوتے ہیں۔

میں نے جس تنقیدی نظریہ کو پیش کیا ہے کہاں تک اسے برتنے میں خود مجھے کامیابی ہوئی ہے یہ میرے کہنے کی بات نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہونگا کہ اس کتاب کے ہر مضمون کا قریب قریب ہر خیال اور اس خیال کے اظہار کے لئے جو الفاظ و فقرے مجھے ہاتھ آئے وہ سب میرے لئے ایک دریافت (Discovery) کی حیثیت رکھتے تھے۔ شاعر کی انفرادیت کی جستجو اور پھر شاعر کو ''پالینا'' دلچسپ لیکن دق کر دینے والی کاوش کا کام ہے۔ اپنے آپ کو شاعر کے کلام میں تحلیل کر دینا ہوتا ہے۔ شاعر اور اس کی شاعری کے متعلق بسا اوقات برسوں تک اپنے آپ سے سوال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی شاعر کے اشعار کا مطلب سمجھنا اتنا مشکل نہیں ، جتنا کسی شاعر کی شاعری کا مطلب سمجھنا۔ تنقید اجمالی اور وجدانی چیز ہے جزویاتی چیز نہیں بقول ھیگل کے میزان (Total) اعداد سے پہلے وجود میں آتا ہے۔

اس کتاب میں ریاض پر مضمون اب سے بیس برس پہلے کی چیز ہے اور مضامین حال کے ہیں۔ مصحفی پر مضمون رسالہ نگار کے مصحفی نمبر میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں بہت کم ترمیم و اضافہ میں نے کیا ہے۔ ذوق پر مضمون کا پہلا حصہ یوم ذوق پر انڈیا

ریڈیو دھلی سے نشر ھؤا تھا اور نگار میں بعد کو شائع ھؤا تھا ۔ دوسرا حصہ ابھی کچھ ھفتے ھوئے لکھا گیا اور پہلی بار شائع ھو رھا ھے ۔ حالی پر مضمون کا پہلا حصہ حالی ڈے پر لکھنؤ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ھو کر نگار میں شائع ھؤا ۔ دوسرا حصہ ابھی لکھا گیا ھے ۔ ''غالب پھر اس دنیا میں'' پہلے پہل لکھنؤ آل انڈیا ریڈیو سے نشر ھو کر نگار میں شائع ھؤا تھا ۔

یونیورسٹی بلڈنگس
۸/۴ بینک روڈ ۔ الہ آباد
۵ مئی ۱۹۴۴ ء

فراق گورکھپوری

مصحفی

میرے ایک نوجوان دوست ہیں جنہوں نے آردو کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی لیکن انگریزی کے ایم - اے ہیں اور ہندی اٹریچر کے ماہر - باتوں باتوں میں ان سے ذکر آیا کہ مصحفی پر کچھ لکھنے کی فکر میں ہوں تو انہوں نے کہا ''کیا مصحفی اور مصحفن والے مصحفی''؟ یہ سن کر مجھے خیال آیا کہ محمد حسین آزاد نے آب حیات لکھ کر کم از کم اتنا تو کیا کہ آردو شاعروں کے قصے کہانیاں بھلائے جانے سے بچا لئے - سچ پوچھئے تو ''مصحفی اور مصحفن'' کے فقرے میں آس موڑ کا بھید چھپا ہوا ہے جہاں سے وہ دلی کی غزل گوئی کی طرف پھر جاتی ہے - یہ فقرہ دلی اور لکھنؤ اسکول کے سنگم کو ظاہر کرتا ہے - یہ کیسے ؟ سنیے :-

دلی اسکول میں قریب قریب تمامتر ذکر عاشقی کا ہوتا ہے اور لکھنؤ اسکول میں معشوق کا - دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ دلی والے داخلی شاعری پر جان دیتے تھے اور لکھنؤ والے خارجی شاعری پر مٹے ہوئے تھے - مصحفی اور مصحفن کو یکجا کر دینا دونوں اسکولوں کے میل کا شگون ہے - انشا کی جس پھبتی کو نقل کرکے آزاد نے مصحفی کو زندۂ جاوید کر دیا ہے اس میں معاملہ بندی اور خارجی شاعری کی وہ شان چھپی ہوئی ہے جو دلی کی شاعری کو لکھنؤ کی شاعری کی طرف لے جا رہی ہے اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ دلی اسکول میں خارجیت بالکل نہیں ہے ، لیکن یہ ایک داخلی قسم کی خارجیت ہے جیسی لکھنؤ اسکول میں ، ایک خارجی داخلیت پائی جاتی ہے - میر کے یہ اشعار لیجیے جن میں خالص داخلیت پائی جاتی ہے :-

ناسرادانہ زیست کرتا تھا میر کا طور یاد ہے مجھ کو

وصل اُس کا خدا نصیب کرے   میر دل چاھتا ھے کیا کیا کچھ

لیکن ذیل کے اشعار داخلی خارجیت کی مثال میں پیش کئے جا سکتے ھیں :-

کھلا جو نشہ میں پگڑی کا پیچ اُسکے میر   سمند ناز پر اک اور تازیانہ ھوا

کیونکہ نقاش ازل نے نقش ابرو کا کیا   کام تھا اک منہ پہ تیرے کھینچنا شمشیر کا

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے   جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

میر ان نیم باز آنکھوں میں   ساری مستی شراب کی سی ھے

دوسرے شعر میں پر تصنع خیال کے ساتھ زبان کی رنگینی کو دیکھئے - لیکن دلی اسکول کا وہ شاعر جس کے یہاں داخلیت کے ساتھ خارجیت بھی کافی نمایاں ھے ، سودا ھے - کہا جا سکتا ھے کہ داخلی شاعری دل کی شاعری ھے اور خارجی شاعری دماغ کی - اگر یہ تقسیم صحیح ھے تو ھم کہہ سکتے ھیں کہ دل کی شاعری میر کا خاص حصہ ھے جس میں اس کا دماغ بھی حل ھو کر رہ گیا ھے ؛ لیکن ھاں اس عہد کے صف دویم کے شعرا (جیسے یقین ، اثر ، قائم وغیرہ) ضرور صرف دل کے شاعر تھے اور اسی لئے میر سے ملتی جلتی ھوئی باتیں کہتے ھوئے بھی میر کی گہرائی اور گیرائی اپنے نغموں میں پیدا نہ کرسکے - سوز البتہ اپنے خالص فطری احساس کی وجہ سے یقین ، اثر اور قائم سے بڑھ جاتے ھیں اور درد نے چونکہ روحانیت کا سہارا لیا اس لئے ایک نمایاں شستگی اور سنجیدگی ان کے لہجے میں آگئی ھے -

ھاں تو ایک سودا کو چھوڑ کر اس زمانے کے دھلوی شعرا تمام تر داخلی رنگ میں غرق تھے - سوز و گداز ، درد و غم ، سپردگی و خستگی ان کی شاعری کی تنہا خصوصیت تھی اور ان کے تغزل پر کوئی خیالی تصویر آنکھوں کے سامنے نہ آسکتی تھی ؛ لیکن میر البتہ اپنا ھمہ گیر تخیل رکھتا تھا کہ اس نے خارجی شاعری کو بھی زیر نگین کر لیا اور غالباً اردو کے کسی غزل گو شاعر کے یہاں تصویر کھینچنے کے قابل اتنے اشعار نہ ملیں کے جتنے میر کے یہاں ؛

اور باوجود اس کے کہ داخلی شاعری میں عاشق زیادہ تر پیش نظر ہوتا ہے ، لیکن پھر بھی معشوق کی جتنی ادائیں ، اس کے جتنے جلوے ، اس کی جتنی تصویریں کلیات میر میں ملتی ہیں ، اتنی سودا کے یہاں نہیں ملتیں -

سودا کے کلام میں داخلیت کی چاشنی ہوتے ہوئے بھی خارجیت نمایاں ہے ، لیکن اس کے یہاں داخلیت نے سوز و ساز اور درد و غم کا گہرا رنگ اختیار کرنے کے بجائے شگفتگی ، البیلا پن ، سرمستی ، نشاط اور رنگینی اختیار کرلی ہے ؛ کیونکہ جب داخلیت بجائے غم کے نشاط کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو نشاط کی فطری وسعت شاعر کے دل کو دنیا کی رنگا رنگ بزم آرائیوں کی طرف لے جاتی ہے اور صحیح معنی میں خارجی شاعری کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے - پھر یہ نشوونما محض خیال و مضمون تک پہونچ کر نہیں رک جاتا بلکہ زبان و بیان پر بھی نمایاں اثر ڈالتا ہے -

بے اعتدالی ، تصنع یا دوسرے نقائص ، داخلی اور خارجی شاعری ، دونوں میں پائے جا سکتے ہیں ؛ لیکن فرق یہ ہے کہ داخلی شاعری میں یہ خرابی ایک گھنونے قسم کا مرثیہ پن پیدا کر دیتی ہے اور خارجی شاعری تو بگڑ کر نہ جانے کتنی شکلیں اختیار کر لیتی ہے - چنانچہ انشا ، ناسخ ، امانت اور شاہ نصیر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہوئے بھی اسی بگڑی ہوئی خارجی شاعری کی روشن مثالیں ہیں - داخلی شاعری ہو یا خارجی شاعری ، شاعرانہ خلوص بڑی مشکل چیز ہے - شاعرانہ خلوص میں جس نازک توازن اور جس رکھ رکھاؤ کی ضرورت ہے وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں -

مصحفی سے پہلے دلی کے مشہور شعرا کا نام لیا جا چکا ہے - اسی زمانہ میں مصحفی نے اپنے وطن امروھہ ضلع مراد آباد کو خیر باد کہہ کر دلی میں غزل سرائی شروع کی اور اسی رنگ میں جو اس وقت وھاں مقبول تھا - مصحفی کے یہاں کثیر تعداد میں اشعار داخلیت لئے ہوئے ملیں گے لیکن سوزوگداز کم کم ہے - یعنی جو خارجی رنگ طبیعت سودا کا تھا وہ مصحفی کے یہاں کچھ زیادہ ابھر آیا ہے - اس میں شک نہیں کہ مصحفی کو تقلید اور انتخابیت کا حیرت انگیز ملکہ حاصل تھا لیکن میر کا سوزوگداز یا تو مصحفی نے پیدا کرنا نہیں چاھا

یا آن سے پیدا نہ ہوسکا - اب رہ گئے میر سے کمتر درجہ کے شعراء ، سو آن کی کون سی بات مصحفی کے یہاں نہیں پائی جاتی - وہی زبان و بیان کی نرمی اور وہی خاموش سپردگی بلکہ اسی کے ساتھ ایک خاص قسم کی لطافت جو خالص داخلی رنگ کے شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے -

اسی معتدل ، متوازن اور ہموار انداز میں مصحفی کی یہ غزل ملاحظہ ہو :-

دیکھ اس کو اک آہ ہم نے کرلی حسرت سے نگاہ ہم نے کرلی
کیا جانے کوئی کہ گھر میں بیٹھے اس شوخ سے راہ ہم نے کرلی
جب اس نے چلائی تیغ ہم پر ہاتھوں کی پناہ ہم نے کرلی
نخوت سے جو کوئی پیش آیا کج اپنی کلاہ ہم نے کرلی
دی ضبط میں جبکہ مصحفی جان
شرم اس کی گواہ ہم نے کرلی

اگر ان اشعار کے صوتی اثرات اور وجدانی کیفیات کا صحیح احساس ہم کرسکیں تو پتہ چلے گا کہ مصحفی کی شاعری محض انتخابیت ، تقلید اور تتبع کا معجزہ نہیں ہے - بظاہر اس غزل میں میر کی تقلید معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقتاً اس میں میر کی دلبرشتگی ، درد کی کم سخن سنجیدگی اور سوز کی سادگی سب شامل ہیں - مصحفی نے میر کی پیروی کی ہے ، لیکن ہمیشہ ذرا کترا کے کی ہے - میر کہتا ہے :-

ہوگا کسو دیوار کے سایہ میں پڑا میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو
کہتا تھا کسو سے کچھ تکتا تھا کسو کا منہ
کل میر کھڑا تھا یاں سچ ہے کہ دوانہ تھا

مصحفی کہتا ہے :-

کبھو تک کے در کو کھڑے رہے کبھی آہ بھر کے چلے گئے
ترے کوچہ میں جو ہم آئے بھی تو ٹھہر ٹھہر کے چلے گئے

میر کا پہلا شعر شدت احساس کا معجزہ ہے - لیکن مصحفی کے شعر میں جو فطری واقعیت اور محاکاتی خصوصیت پائی جاتی ہے وہ مصحفی کو میر سے الگ کر رہی ہے - مصحفی کے اور اشعار سنیے :-

ہم تو اس کوچہ میں گھبرا کے چلے آتے ہیں
دو قدم جاتے ہیں پھر جا کے چلے آتے ہیں
وہ جو ملتا نہیں ہم اس کی گلی میں دل کو
درو دیوار سے بہلا کے چلے آتے ہیں

گلی سے اسکی جاتا ہے تو کیا اک چشم حسرت سے
دل مسکیں بسوئے رخنۂ در دیکھ لیتا ہے

جذبات کی میانہ روی تخئیل و وجدان کو قدم بہ قدم اس خارجیت کی طرف بڑھا لے چلی ہے جہاں سے ہم مصحفی کو دلی اور لکھنؤ اسکول کے دوراہے پر کھڑا یا آگے بڑھتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اسی داخلی خارجیت سے اس معاملہ بندی کا شگون بھی ہوتا ہے جو لکھنؤ میں جرأت کے ہاتھوں کہاں سے کہاں پہونچ گئی، اور انشا اور رنگین کے ہاتھوں کہاں سے کہاں بھٹک گئی۔ مصحفی کی ایک مشہور غزل ہے :—

کھینچ کر تیغ یار آیا ہے — اس گھڑی سر جھکا دئیے ہی بنے
یار کا صبح پر ہے وعدۂ وصل — ایک شب اور بھی جئیے ہی بنے
اب تو اس درد دل کی تاب نہیں — مصحفی کچھ دوا کئیے ہی بنے

مصحفی کا پہلا شعر میر کے اس شعر سے ملا کر دیکھیے :—

ابھی ہوں منتظر جاتی ہے چشم شوق ہر جانب
بلند اس تیغ کو ہونے تو دو سر بھی جھکاؤں گا

میر و مصحفی میں وہی فرق ہے جو دوپہر اور غروب آفتاب کے وقت میں پایا جاتا ہے۔ اور جس طرح شام کو آفتاب میں ساتوں رنگ جھلکنے لگتے ہیں، اسی طرح رنگین فضا میں وہ خارجیت نکھرتی اور سنورتی ہے جس کی جھلک مصحفی کی شاعری میں ملتی ہے۔ اگر ہم سنگیت کے استعارہ کو کام میں لائیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مصحفی کے نغموں میں وہی دلفریب کیفیت پیدا ہوگئی ہے جو آواز میں پتی لگ جانے سے پیدا ہوتی ہے۔

اب مصحفی کے چند ایسے اشعار سنیے جن پر میر یا میر کی تقلید کا دھوکا ہوسکتا ہے، لیکن دونوں کے وجدان و لہجہ کے لطیف و نازک

فرق کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے ۔ ان اشعار میں میر کا سوز نہیں ہے لیکن مصحفی کا ساز ضرور ہے ۔ شدت تاثیر نہیں ہے لیکن ایک نرم کیفیت ضرور ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ میر کی ماورائی سادگی اور معصومیت نے ایک نیا رنگ اختیار کر لیا ہے اور جذبات کی پاکیزگی و دوشیزگی میں کچھ شباب کے کیفیات بھی جھلکنے لگتے ہیں :—

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا　　ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
جس کو ہم روز ہجر سمجھے تھے　　ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا
مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا　　کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

———

یاد ایام بے قراری دل　　وہ بھی یا رب عجب زمانہ تھا

———

ہم سمجھے تھے جسکو مصحفی یار　　وہ خانہ خراب کچھ نہ نکلا

———

پیار تو آیا تھا میرے جی میں رات　　پر میں تیری وضع سے ڈر کر گیا

———

ایسا ہی گیا جلدکہ پھر منہ نہ دکھایا　　وہ سرورواں اپنی مگر عمرِرواں تھا
ہم سے خبر مصحفی خستہ نہ پوچھو　　تم آپ ہی سوچو نہ میاں دل میں کہاں تھا

———

کل قافلۂ نکہت گل ہوگا روانہ　　مت چھوڑیو تو ساتھ نسیم سحری کا

———

چلی بھی جاجرس غنچہ کی صدا پہ نسیم　　کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہرے گا*

———

حادثے ہوتے ہیں زمانے میں　　اس قدر انقلاب کس دن تھا**

---

* بے ساختہ میر کا یہ شعر یاد آگیا :—

رنگ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں
کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

لیکن مصحفی کی انفرادی شان نمایاں ہے ۔

** میر کہتا ہے ۔ باقی صفحہ ۲۳ پر دیکھئے !

مصحفی آج تو قیامت ہے دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

بھٹکا پھرے ہے تیرے دل اک ادا کا مارا
کہہ کس طرف کو جائے اب یہ خدا کا مارا
زلفوں سے اس کے اے دل ہے مجھ کو کیا سروکار
پھرتا ہوں میں تو اپنے آپ ہی بلا کا مارا
وہ صیدخوں گرفتہ جیتا بچا نہ ہرگز
جو صیدگہ میں تیری آیا قضا کا مارا

داغ دیکھے تھا کھڑا لالۂ صحرائی کا
زور عالم نظر آیا ترے سودائی کا

افشائے عشق بعد خدا جانے کیا بنے
جب تک حجاب تھا یہی امید وبیم تھا

جنبش لب نے تیری میری زباں کر دی بند
تو نے کچھ پڑھ کے عجب مجھ پہ یہ منتر مارا
بھڑک اٹھا میں نسیم سحری ، تو نے تو
دامن ایسا ہی مرے آتش دل پر مارا
مصحفی عشق کی وادی میں سمجھ کر جانا
آدمی جائے ہے اس راہ میں اکثر مارا

کیا یار کے دامن کی خبر پوچھو ہو ہم سے
یاں ہاتھ سے اپنا ہی گریبان گیا تھا

مصحفی کہتے ہیں راہ عشق میں مارا پڑا
کون جانے کیا ہوئی اس بیوطن کی سرگذشت

مصائب اور تھے پر دل کا جانا عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

میر کے یہاں بے پناہ سوز ہے لیکن مصحفی کے یہاں وہی سوز کم ہو کر اک نرم ساز ہوگیا ہے۔

شمع شب فراق بنے هم تو مصحفی
هم دل جلوں کو عیش کی محفل سے کیا خبر

اے مصحفی بتا تو کیا کچھ خوشی هوئی هے
هے ان دنوں جو تیرا چہرہ بحالیوں پر

بیگانگی هے اس کی ملاقات میں هنوز
واحسر تا کہ فرق هے دن رات میں هنوز

وهی ٹھوکر هے اور وهی انداز
اپنی چالوں سے تو نہ آیا باز

هم پہ وہ مایہ کہاں لیک زروئے تقریب
جا کھڑے رهتے هیں هم اسکے خریدار کے پاس

یار کرتا نہیں نگاہ افسوس
چشم پوشی سے اسکی آہ افسوس

مصحفی کر نہ عبث شکوۂ ایام فراق
اگلی نسبت تو بہت هے ترے حالات میں فرق

گرچہ هیں قہر سادی آنکھیں بھی
پر غضب هے خمار کا عالم

تھے جو جنوں زدہ گئے زنجیر کی طرف
هم کو قضا جولائی تو شمشیر کی طرف

اور سب تم سے ورے بیٹھے هیں — ایک هم هیں کہ پرے بیٹھے هیں
پھٹ چکا جب سے گریباں تب سے — هاتھ پر هاتھ دهرے بیٹھے هیں
شیشۂ مے کی طرح اے ساقی — چھیڑ مت هم کو بھرے بیٹھے هیں
قتل کا کس کے ارادہ هے جو آپ — هاتھ قبضہ پہ دهرے بیٹھے هیں
مصحفی یار کے گھر کے آگے — هم سے کتنے نگھرے بیٹھے هیں

ہوئی نہ ساز مری اس کی صحبت شب ہائے
ادھر سے عجز ادھر سے رکھائیاں ہی رہیں

———

جس بیابان خطرناک میں اپنا ہے گزر
مصحفی قافلے اس راہ سے کم نکلے ہیں

———

بن دیکھے جس کو پل میں آنکھیں بھر آئیاں ہوں
کیا قہر ہے جو اس سے برسوں جدائیاں ہوں

———

ٹک رحم کرو چاک گریبان پہ میرے
یارو کوئی اس شوخ کے داماں کو نہ چھیڑو

———

ہماری بزم سے اے مصحفی سحر ہوتے
گیا ہے ہو کے وہ بیزار دیکھیے کیا ہو

———

اک دن رو کے نکالی تھی میں واں کلفت دل
آج تک دامن صحرا ہے غبار آلودہ

———

میں تیرے واسطے سر پٹکوں ہوں دیواروں سے
چین کس طرح تجھے خانہ خراب آتا ہے

———

دامن کی اک جھپک نے مدھوش کر دیا ہے
مثل چراغ ہم کو خاموش کر دیا ہے

———

تم رات وعدہ کر کے جو ہم سے چلے گئے
پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے بھلے گئے

———

پکارتا ہے تجھے مصحفی جواب تو دے
کھڑا رہے یہ ترے آستاں پہ یا پھر جائے

———

حیران ہے کس کا جو سمندر مدت سے رکا ہوا کھڑا ہے

———

تو دیکھتے ھی اس کو جو دیوانہ ھوگیا
سچ کہیو مصحفی ترے کیا جی میں آگئی

کبھی روئے کبھی پیٹے شب تنہائی میں
ہم کو ساتھ اپنے عجب طرح کی صحبت گزری

ملو ھو غیروں سے اور ہم سے بیوفائی ھے
یہ کون شیوہ ھے کیا رسم آشنائی ھے

از بس کہ مرے دیدۂ حیران میں کچھ ھے
اک آن میں دل کچھ ھے تو اک آن میں کچھ ھے

جادو تو میں کہتا نہیں پر سمجھوں ھوں اتنا
واللہ تری نرگس فتان میں کچھ ھے

خالی ھی چلے آتے ھیں ھم سیر چمن سے
دامان میں کچھ ھے نہ گریبان میں کچھ ھے

اٹھنے لگے جو وہ مری بالیں سے وقت نزع
نکلا یہی زبان سے آھستہ، کیا چلے

نہیں معلوم کہ کیا نام ھے اس کا لیکن
کوئی اس کوچہ میں اک آہ تو بھر جاتا ھے

حیف ھے محمل لیلیٰ نہ نمودار ھوا یوں تو محمل کئی یاں گرد سفر سے نکلے

مندرجہ بالا اشعار کا انداز بیان بالکل میر کا سا ھے لیکن تخئیل کے کان پر کھ لیتے ھیں کہ بجائے میر کے ان میں سودا کا رنگ زیادہ جھلکتا ھے ۔ شعرائے دلی میں اگر کوئی شخص سودا کے انداز پر للچایا تھا تو وہ ذوق تھے ، ورنہ دلی اسکول کی تمام تر روایت وھی رھی ھے جو میر کے رنگ سے وابستہ ھے ۔ لیکن سودا کے رنگ کو اگر کسی نے واقعی فروغ دیا تو وہ شخص مصحفی ھے ۔

اس مضمون کے دوران میں یکایک خیال آیا کہ اگر مصحفی کا تمامتر کلام میر، سودا، انشا اور جرأت ھی کے رنگ و انداز میں ھے، یعنی اگر مصحفی کی اُستادی تمام تر تقلید ھے تو مصحفی کا اپنا کیا ھے؟ اس شاعر کا کلام قدر اول کی چیز نہیں ھو سکتا جو صاحب طرز نہیں، جس میں انفرادی خلاقی نہ ھو، جو ایک الگ شاعرانہ شخصیت نہ رکھتا ھو۔ حقیقی شاعر ایک نئے ذوق کی داغ بیل ڈالتا ھے، ھمارے قدیم احساسات کو نئے طریقوں سے چونکاتا ھے، ھمارے شعور کے لئے ایک نیا سانچا تیار کرتا ھے۔

ایک زمانہ ھوا جب میں نے مولوی اسمٰعیل کی مرتب کردہ ''تزک اُردو'' میں، جو میرے نصاب میں شامل تھی، غالباً پہلے پہل مصحفی کا نام دیکھا اور سنا۔ اب میرے جذبات کا حال سنیے۔ سب سے قابل توجہ بات تو یہ تھی کہ مصحفی کا تخلص وہ لفظ تھا جس کی صورت وصوت نے فوراً مجھ پر اپنی دلکش انفرادیت کا اثر ڈالا۔ اس کے بعد مولوی اسمٰعیل کا یہ مختصر نوٹ پڑھ کر مجھے کچھ برا لگا کہ ''مصحفی ھیں تو مشہور لیکن ان کے کلام میں کوئی انفرادیت نہیں۔ کہیں میر کی سادگی ھے کہیں سودا کی شان و شکوہ''۔ میں نے اس وقت تک مصحفی کا کلام نہیں دیکھا تھا لیکن نہ جانے کیوں کچھ ایسا نیم شعوری احساس ھوا کہ مولوی اسمٰعیل دھوکا کھا رھے ھیں۔ جس شخص کا تخلص اتنا حسین ھو وہ محض نقال نہیں ھو سکتا۔ اس کے بعد سے اب تک میں مصحفی سے آھستہ آھستہ متاثر ھوتا رھا اور مصحفی کی انفرادیت میرے وجدان پر اپنا کام کرتی رھی اور مجھے بسا اوقات یہ فکر رھی کہ مصحفی کے خاص رنگ کو کس طرح اُجاگر کیا جائے۔ یہ مسئلہ جو میرے لئے ایک دلکشی بھی رکھتا تھا اور جس سے میں ڈرتا بھی تھا، آج پھر سامنے آ گیا۔

غور کرنے سے میر و سودا کے مخصوص رنگوں میں جو امکانات چھپے ھوئے ھیں وہ ذھن میں آنے لگے۔ اس سلسلہ میں ایک ایسا اھم اُصول دھیان میں آیا جس کی طرف جہاں تک مجھے معلوم ھے کسی نے اشارہ نہیں کیا۔ وہ اصول یہ ھے کہ غم آمیز وجدان میں تنوع کے اتنے امکانات نہیں ھوتے جتنے نشاط آمیز وجدان میں ھوتے ھیں، اور یہی وجہ ھے کہ مصحفی کے یہاں بہ نسبت میر کے تنوع زیادہ پایا جاتا ھے۔ مصحفی کے وہ اشعار جو میر کی یاد دلاتے ھیں کافی تعداد میں اس

مضمون میں دیے جا چکے ہیں - ان میں سے قریب قریب ہر شعر میر کے اشعار کے مقابلہ میں ہلکا ہے ، لیکن ان دونوں میں وہی فرق ہے جو تیز درد اور میٹھے میٹھے درد میں پایا جاتا ہے - یہی فرق سودا اور میر کے درمیان پایا جاتا ہے اور یہیں سے سودا کی وہ نمایاں خصوصیت شروع ہو جاتی ہے جو آسے میر - درد - سوز اور ان کے ہمنوا شعرا سے الگ کرتی ہے اور جس سے مصحفی کی طبیعت کو بھی خاص ربط اور خاص مناسبت ہے - لیکن ان دونوں کے نشاط آمیز وجدان میں بھی فرق پایا جاتا ہے اور اسی لئے جب میں یہ کہتا ہوں کہ مصحفی سودا کا ہمنوا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سودا کی آواز بازگشت ہے -

آزاد نے لکھا ہے کہ ایک مشاعرے میں جب مصحفی نے یہ شعر پڑھا :-

باتوں میں ادھر لعل فسوں گرنے لگایا
دے پیچ آدھر زلف آڑا لے گئی دل کو

تو میر کو اس شعر نے چونکا دیا اور مصحفی سے میر نے اسے دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی - جب میں نے آب حیات میں اپنے لڑکپن میں یہ روایت پڑھی تو مجھے کچھ حیرت ہوئی - حیرت اس وجہ سے تھی کہ مصحفی کا یہ شعر میر کے رنگ میں نہیں ہے - پھر بھی میر کو اس شعر نے متوجہ کر لیا - اب معلوم ہؤا کہ یہ شعر خارجی اور داخلی دونوں طرح اتنا مکمل ہے کہ میر سے بھی نہ رہا گیا -

اب میں وہ اشعار مصحفی کے پیش کرتا ہوں جن میں مصحفی کا خاص رنگ نمایاں ہے اور جن سے مصحفی ، سودا اور میر میں جو مشابہت اور فرق ہے ، دونوں نمایاں ہو جاتے ہیں - مشابہت تو صاف دیکھی جا سکتی ہے لیکن فرق ؟ مصحفی کے مندرجہ ذیل اشعار میں ایک مانوس و معصوم درد اور حسرت ہے - ان پھولوں کی رگھائے گل میں ایک دکھتی ہوئی سی رگ ہے اور ان کی نکہت میں کچھ درد بھی ملا ہؤا ہے - چونکہ میر کی جذباتی یا نفسیاتی انانیت مصحفی میں نہیں ہے اس لئے مصحفی کے یہاں ایک رکی رکی سی معصوم حیرت ، ایک دبی ہوئی بے چارگی کی مسکراہٹ ، اوپر کے دانتوں سے نیچے کا

ہونٹ دبا لینے کی ادا ملتی ہے ۔ سودا کے یہاں یہ عنصر کم ہے لیکن جہاں ہے وہاں مصحفی کی نرم غم زدگی سے بلند تر ہے کیونکہ سودا کا تخئیل زیادہ زور دار اور با جرأت ہے ۔ مگر عام طور پر سودا کی رنگینی اس نرم ٹیس اور کسک سے خالی ہے جو مصحفی کے رنگین اشعار میں ہے :—

وصل میں ایسے سے ڈھونڈھے کوئی کیونکر واشد
جن نے سوناز سے اک بند قبا باز کیا

———

ملزم تری باتوں سے ہیں آپ ہی ہونا
اور تجھ کو کسی بات میں الزام نہ دینا

———

جس کے نہ لگا زخم تری کج نظری کا
کیا ہوئے الم اس کو خراش جگری کا

———

اے مصحفی افسوس کہاں تھا تو دوانے
کل اس کے تئیں ہم نے عجب آن میں دیکھا *

———

جب کوہ و بیاباں میں جا ہم نے قدم مارا
فرہاد نہ کچھ بولا مجنوں نے نہ دم مارا

———

اس دل میں تیرے ملنے کا ارمان رہ گیا
یہ دل تڑپ تڑپ کے مری جان رہ گیا

———

کل اسے میں لے چلا تھا سیر گلشن کی طرف
کچھ سمجھ کر ساتھ سے میرے وہ ٹل کر رہ گیا

———

تجھے اے مصحفی کب ہے خبر درد محبت سے
نہ لے تو آگے میرے نام اے بیدرد درماں کا

---

* سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

خورشید کو سائے میں زلفوں کے چھپا رکھا
چتون کی دکھا شوخی سرمے کو لگا رکھا

جسدم کہ وہ کمر میں رکھ کر کٹار نکلا
جس رہ گزر سے نکلا عالم کو مار نکلا

کیا نظر آیا مجھے اس میں کہ میں نے روز وصل
لب تلک لے جا کے جام آب حیواں رکھ دیا *

یہ ادا دیکھ کہ کتنوں کا ھوا کام تمام
نیمچہ کل جو ٹک اس عربدہ جو کا نکلا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ھوگا کوئی زخم
ترے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا
مہرومہ اس کے تئیں دیکھ کے حیران رہے
جب ورق یار کی تصویر دورو کا نکلا

تو گیا پیارے سفر کو چھوڑ کر میرے تئیں
رفتہ رفتہ میں ترے جی سے بسر کر رہ گیا

دامن ترا بنے گا گریبان عاشقاں
گریوں ھی ٹھوکریں دم رفتار کھائے گا

شب ھجراں تھی میں تھا اور تنہائی کا عالم تھا
غرض اس شب عجب اک بے سروپائی کا عالم تھا

حسن اس کا اب سماں کچھ اور دکھلانے لگا
چاند سا پردے سے وہ مکھڑا نظر آنے لگا
یا وہ عالم تھا کہ کوئی اس سے واقف بھی نہ تھا
یا یہ عالم ھے کہ عالم اس پہ مر جانے لگا

---

* کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ھے سودا
ساغر کو مرے ھاتھ سے لینا کہ چلا میں ۔ سودا

رونے سے کام بسکہ شب اے ہمنشیں رہا
آنکھوں پہ کھینچتا میں سر آستیں رہا

ٹوٹے تھے اس کے تیر جو سینے میں اب تلک
پیکاں کے بعد نکلے ہے پیکان دوسرا *

سلسلہ اک نظر پڑا موج ہوا کے پاؤں میں
پیچ جو کھل گیا کبھی سنبل تاجدار کا

لالہ ہوا بروئے خاک رنگ شفق بر آسماں
خون کہاں کہاں گرا زخم دل فگار کا

خون بسمل سے ہے اس ساعد نازک پہ بہار
تم نے گو پھینک دیا ھاتھ سے خنجر اپنا
مصحفی گرچہ خفا ہم سے وہ رہتا ہے ولے
ذکر آجائے ہے اس بزم میں اکثر اپنا

عشوہ و ناز و ادا اس کے یہی کہتے ہیں
لے سکے نام تو یاں کوئی شکیبائی کا

صر صر سے کم نہیں کچھ وہ تیغ تیز جس نے
لاکھوں کا کر دیا ہے دم میں چراغ ٹھنڈا

کبھی جو یوں بھی ملو تم تو مہربانی ہے
غرض وہ وصل کا وعدہ تو در کنار رہا
ترے ہی غم کی لگے ہم خوشامدیں کرنے
جہاں میں جب کوئی اپنا نہ غم گسار رہا
ملے نہ آگے کبھی مصحفی سے تم افسوس
امید وار تمہارا امید وار رہا

---

* سب ہوئے نادم پئے تدبیر ہو جانان سمیت
تیر تو نکلا مرے سینے سے لیکن جاں سمیت ۔ غالباً میر

جو پھرا کے اس نے منہ کو بقضا نقاب الٹا
ادھر آسمان الٹا ادھر آفتاب الٹا

رنگ ، روپ ، صورت و شکل ، سجاوٹ اور نکھار کا آئینہ دار جتنا مصحفی کا کلام ہے اتنا اردو کے کسی اور غزل گو کا کلام نہیں ۔ یہ بات جتنے مختلف عنوانوں سے جتنی واقعیت اور اصلیت لئے ہوئے مصحفی کے یہاں ہے وہ میر ، سودا ، جرأت ، انشا ، غالب ، ذوق ، ظفر ، مومن ، داغ اور امیر کسی کے یہاں بھی نہیں پائی جاتی ۔ اس کا کلام ایک تصویر خانہ یا پکچر گیلری ہے دیکھیے :—

بھیگے سے ترا رنگ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کف پا اور بھی چمکا
جوں جوں کہ پڑیں منہ پہ ترے مینہ کی بوندیں
جوں لالۂ تر حسن ترا اور بھی چمکا

———

پیرہن سے ہے جھلکتا بدن سرخ ترا
زیر شبنم نہیں چھپتا چمن سرخ ترا

———

شب اک جھلک دکھا کر وہ مہ چلا گیا تھا
اب تک وہی سماں ہے غرفے کی جالیوں پر

———

اک قرص ماہ کے نظر آتے ہیں سو ہلال
عارض پہ اس کے طرۂ پر خم کی سیر کر

———

دل لے گیا ہے میرا وہ سیم تن چرا کر
شرما کے جو چلے ہے سارا بدن چرا کر
ہونے دے خوش کسی کو سچ کہہ تو کیا کریگا
موج تبسم اپنی اے خوش دھن چرا کر

———

چہرے پہ نازکی سے ہے جوش شکست رنگ
یہ تازہ گل ہے لالہ فروش شکست رنگ

یوں ہے ڈلک بدن کی اس پیرہن کی تہ میں
سرخی بدن کی چھلکے جیسے بدن کی تہ میں

آستیں اس نے جو کہنی تک چڑھائی وقت صبح
آ رہی سارے بدن کی بے حجابی ہاتھ میں

جہاں تک صورت و رنگ کے احساس یا خالص احساس رنگ کا تعلق ہے، مصحفی کی اس خصوصیت کا مجمل احساس مجھے پہلے سے تھا، لیکن کچھ دن ہوئے ہمایوں میں کسی کا مضمون مصحفی کی ''تشکیل بیان'' پر شائع ہوا تھا؛ اس کے مطالعہ نے مصحفی کی اس انفرادی صفت کو مجھ پر زیادہ واضح کر دیا ۔ آج تک اردو کے غزل گو کے کلام میں رنگ کا لفظ اتنی بار نہیں آیا ہے جتنی بار مصحفی کے یہاں آیا ہے اور مصحفی کو اس لحاظ سے ہم اگر حواس خمسہ کا شاعر کہیں تو بجا ہوگا ۔ کچھ اشعار اور سنیے :—

مجھے رحم آتا ہے حسرت پہ آہ اس مرغ بے پر کے
کہ اڑ سکتا نہ ہو اور ہو بزیر آشیاں بیٹھا

حسرت پر اس مسافر بیکس کے روئیے
جو تھک کے بیٹھ جاتا ہو منزل کے سامنے

ان اشعار سے مصحفی کی ایک اور خصوصیت نمایاں ہوتی ہے اور وہ خصوصیت ''ترسنے'' کی ہے ۔ یونان کی میتھالوجی میں تنتالوس (Tantaulus) نامی ایک نوجوان کو کنوئیں میں آلٹا لٹکا دیا جاتا ہے ۔ اس کنوئیں میں پانی بھی ہے اور سیب سے لدے ہوئے درخت بھی ، لیکن پانی تک اس کے ہونٹ اور پھلوں تک اس کے ہاتھ پہونچ پہونچ کر رہ جاتے ہیں ۔ اس کشمکش کو (Tantvlia) کہتے ہیں اور انگریزی لفظ (Tantalizing) اسی سے نکلا ہے اور اس رنگ میں مصحفی کا کوئی حریف نہیں ۔ یہ احساس محض مصحفی کے مضمون اور مفہوم سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لحجہ اور اس کے اشعار کے صوتی اثر اور وجدانی فضا سے پیدا ہو جاتا ہے ۔ جرأت کی معاملہ بندی میں اس قسم کی

مثالیں ملتی ہیں ۔ لیکن جس طرح میر اور سودا کے رنگ کو ایک نرم کسک اور معتدل انداز دے کر مصحفی نے اپنی انفرادیت نمایاں کی ہے اسی طرح وہ جرأت کی معاملہ بندی کو بھی اپنے خاص انداز میں بدل دیتا ہے ۔ اب میں ان اشعار کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے جو معاملہ بندی کے مضامین سے عموماً الگ ہیں ، پھر آگے بڑھتا ہوں ۔ سودا کے انداز میں سودا سے الگ مصحفی کی آواز پھر سنیے :۔

نہ تنہا مصحفی ہی اس کے ہاتھوں سے ہے آوارہ
کوئی بھی چین سے یارو نہ زیر آسماں بیٹھا

تجھے کس نے روک رکھا تیرے جی میں کیا یہ آئی
کہ گیا تو بھول ظالم ادھر التفات کرنا

بارے اب تم بھی لگے خون غریباں کرنے
ہاتھ میں تم نے بھی تلوار سبنھالی کیا خوب
جبکہ تو اس میں سے جھانکے ہے ستاروں کی طرح
جگمگاتی ہے ترے غرفے کی جالی کیا خوب

اس گل کی باغ میں جو صبا نے چلائی بات
غنچے نے مسکرا کے کہا ، میں نے پائی بات

اے زبان تیشہ کہہ کچھ کوہکن کی سرگزشت
یعنی آخر کیا ہوئی اس بیوطن کی سرگزشت

نالہ جاتا ہے تابہ عرش بریں
ہے شب ہجر کی یہی معراج
ہے دوا اس مریض کی تجھ پاس
جس کا عیسیٰ بھی کر سکے نہ علاج

کب کا اک عمر سے جھگڑا ھے دل و جان کے بیچ
کام دونوں کا کیا یاد نے اک آن کے بیچ

چمکے ھے کچھ وہ ابروے خمدار بے طرح
چلتی ھے آپ ھی آپ یہ تلوار بے طرح
ھمسائگی پہ یار کے کیا دل کو خوش کروں
مجھ سے تو ھے کھنچا وہ حیا دار بے طرح

سحر ھے رخ پر ترے زلفوں کے بل کھانے کی طرح
سیکھے کوئی تجھ سے پیارے دل کے لے جانے کی طرح
کل جو وہ رستہ میں ناگہ مل گیا ، تھی دیدنی
میرے رہ جانے کی وضع اور اس کے رک جانے کی طرح

کہاں تلک پھریں آڑتے ادھر آدھر صیاد
ترے ھی نذر ھیں اب لے یہ مشت پر صیاد
وہ خوں گرفتہ ھؤا کون قابل فتراک
جو آج دامن زیں ھے بہار پر صیاد
خدا کے واسطے چوب قفس کو سرخ نہ کر
ھمارے قتل پہ باندھے ھے کیوں کمر صیاد

بھلا تمیز تو کر بوئے مشک و گیسو میں
رھی شے باد صبا تو بھی تو ختن میں دیر

اس تیغ زن کو یارو مرے دل سے کیا خبر
قاتل کو بے قراری بسمل سے کیا خبر
منہ آٹھ گیا جدھر کو ادھر ھی چلے گئے
آوارگان شوق کو منزل سے کیا خبر
شمع شب فراق بنے ھم تو مصحفی
ھم دل جلوں کو عیش کی محفل سے کیا خبر

کچھ یوں ھے نقاب اس بت بے پیر کے منہ پر
جیسے ورق سادہ ھو تصویر کے منہ پر

کیا جانے کسے ذبح کئے آئی ہے کافر
ہے آج تو سرخی تری شمشیر کے منہ پر
گو غیر کی خواہش ہے ترے دل میں تو ہوئے
یہ بات نہ رکھ عاشق دلگیر کے منہ پر
عزت نہیں اس صید کی کچھ صید حرم میں
جو صید کہ آیا نہ ترے تیر کے منہ پر

تھا سرخ پوش وہ گل شاید چمن کے اندر
شعلہ سا شب پھرے تھا سرو سمن کے اندر
جو ہاتھ دلبروں کے دامن کو کھینچتے تھے
وہ کھنچ کے رہ گئے ہیں کیسے کفن کے اندر
گورے بدن کا عالم آسکے میں رات دیکھا
اک نور کا جھمکڑ تھا پیرہن کے اندر
شکوہ کا نامہ اس نے وہ خونچکاں لکھا تھا!
چھریاں دھری تھیں جسکی ہر اک شکن کے اندر

آسودگان خاک کے عالم کی سیر کر
کیا چپ پڑے ہیں محفل ماتم کی سیر کر
اے مصحفی بہار کے دن ہیں یہ بے نصیب
چل تو بھی باغ میں گل و شبنم کی سیر کر

مصحفی کی اس خصوصیت کو تو سبھی نے مانا ہے کہ وہ سنگلاخ سے سنگلاخ زمین کو پانی کر دیتا ہے۔ مصحفی کے مجموعۂ کلام میں اکثر غزلیں بلکہ اسی مضمون میں کتنے شعر ایسے ملیں گے کہ رو میں آپ پڑھ جائیں گے اور اس طرف مطلق دھیان نہ جائے گا کہ زمین کتنی سنگلاخ تھی۔ آپ انشا اور مصحفی کے معرکوں کے سلسلہ کی وہ غزلیں پڑھیے جس کے قافیہ اور ردیف ہیں ''مغرور کی گردن'' ''لنگور کی گردن'' آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ مصحفی ، انشا سے کتنا بڑھ گیا ہے۔ اخیر کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں جن سے مصحفی کی انفرادیت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے :۔

انصاف کیا اس کا میں اب شہ کے حوالے
جھکتی ہے جہاں مار کی اور مور کی گردن

جس سر پہ ٹک اپنا وہ رکھے دست نوازش
اس سر کا بنے تکیہ سر حور کی گردن

اس در کا جو سجدہ اسے منظور نہ ہوتا
ملتی نہ فرشتوں کو کبھی نور کی گردن

اے مصحفی خامش یہ سخن طول نہ کھنچ جائے
یاں کوتہ ہی بہتر سر پر شور کی گردن

جس آسانی سے انشا کی غزل کے الجھاؤ کو اس غزل میں مصحفی نے سلجھایا ہے اور جس نرم دھار سے انشا کے غلط اشعار کو مصحفی نے کاٹا ہے وہ نظر انداز کرنے کی چیز نہیں - سودا کی ہجو اور مصحفی کے ان اشعار میں بھی اب آپ کو ایک فرق نظر آگیا ہوگا - یعنی یہاں بھی مصحفی نے آسی نرم سلاست اور اسی اعتدال و توازن کا ثبوت دیا ہے جو اس کا حصہ ہے - مصحفی کا وہ معذرت نامہ جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :-

قسم بذات خدائے کہ ہے سمیع و بصیر
کہ مجھ سے حضرت شہ میں ہوئی نہیں تقصیر

مجھے کیا سب کو غالب کے اس قطعہ کی یاد دلاتا ہوگا جو یوں شروع ہوتا ہے :-

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے

لیکن غالب کی شوخ نگاری کی جی کھول کر داد دیتے ہوئے بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ اپنی معصومیت کے یقین دلانے کا نرم و شیریں لب و لحجہ جو مصحفی کے معذرت نامہ کا ہے وہ غالب کے قطعہ کا نہیں ہے - آئیے مصحفی کی غزلوں کی پھر سیر کریں -

دل لے گئے آنکھوں میں بہ تدبیر لگا کر
آئے تھے جو کل سرمۂ تسخیر لگا کر

شاید ہوئی نہیں مری حالت روا ہنوز
سوئے فلک دراز ہیں دست دعا ہنوز

دیکھا تھا ایک دن کہیں اُس گل کو باغ میں
آوارۂ چمن ہیں نسیم و صبا ہنوز
ہاتھوں سے اس کے رنگ حنا اڑ گیا ولے
تڑپے ہیں خوں میں کشتۂ رنگ حنا ہنوز
فندق ان انگلیوں پہ نہیں ہے تو کیا ہؤا
رنگینیاں وہی ہیں اشارات میں ہنوز

پہنا جو میں نے جامۂ دیوانگی تو عشق
بولا کہ یہ بدن پہ ترے سج گیا لباس

از بسکہ چشم تر نے بہاریں نکالیاں
مژگاں ہے اشک سرخ سے پھولونکی ڈالیاں
کل کر رہا تھا غیر سے نظروں میں گفتگو
پر دیکھتے ہی کچھ مرے نظریں چرالیاں
اے مصحفی تو اُن سے محبت نہ کیجیو
ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلی دالیاں

مصحفی کیونکہ نہ بھڑکوں میں کہ تحریک نسیم
آتش دل پہ مرے کرتی ہے کار دامن
مصحفی کے تیئں دیکھیں ہیں جو وہ کشتہ پڑا
پاس جاتے نہیں شرما کے چلے آتے ہیں

نے انس کے خواہاں ہیں نہ پیار کے بھوکے ہیں
ہم لوگ ہیں بازاری، دیدار کے بھوکے ہیں

جی میں آتا ہے کہ بوسہ کف پا کا لے لوں
رنگ ہونٹوں پہ ترے تازہ حنا کا لے لوں

سرمہ دینے میں اس کی آنکھوں میں
کیا کہوں آبداریاں کیا تھیں

زلفیں تری زاھد سے الجھتی ھیں تو آنکھیں
کہتی ھیں کہ اس مرد مسلماں کو نہ چھیڑو

کیا نظر پڑ گئی وہ چشم خمار آلودہ
شفق صبح تو ھے زور بہار آلودہ

میری نظر مجھی کو لگے دور چشم بد
اس دم تو بن رہے ھو پری پھر کے دیکھ لو

اٹھنے سے ترے شور قیامت بھی گیا بیٹھ
اے فتنۂ برخاستہ از بہر خدا بیٹھ

پروانہ رکھ اس روئے دل افروز کے آگے
یوں چاھے تو سب اپنا بدن مجھ سے چھپا بیٹھ
کیا ہم نہیں پہچانتے یہ ساختہ صورت
غصہ سے ٹک اک اور بھی تو منہ کو بنا بیٹھ

اندازے کے صدقے ھیں نہ ھم ناز کے صدقے
گر ھیں بھی تو اس گرمئی آواز کے صدقے
مت دیکھ تو اوروں کی طرف میری طرف دیکھ
کافر میں تیری چشم فسوں ساز کے صدقے

جس وقت کہ کوٹھے پر وہ ماہ تمام آوے
کیا دور ھے گر اس کو سورج کا سلام آوے
پاؤں کو لگا مہندی دل خون کیا میرا
کیا جانیے کیا آفت تا وقت خرام آوے

اک شاخ گل پہ صبح مری جا پڑی تھی آنکھ
قامت کو کھینچ مجھ کو قیامت دکھا گئی
افغاں کہ سرسری سی کسی کی نگاہ لطف
بیٹھے بٹھائے اک ہمیں تہمت لگا گئی

جنہیں تیری ٹھوکر کا دل میں تھا کھٹکا
لحد میں بھی آرام سے وے نہ سوئے

اڑائے ہیں لخت جگر آہ نے جب
ہوا میں بھی گلزار پیدا ہؤا ہے

میں ساعد نازک کے ترے صدقے ہوں تجھ سے
کیونکر قفس مرغ گرفتار اٹھا ہے
اے مصحفی دل جس نے اٹھایا ہے جہاں سے
اٹھتے ہوئے وہ یاں سے سبکسار اٹھا ہے *
کون آیا ہے نہانے لطف بدن نے کس کے
لہروں سے سارا دریا آغوش کر دیا ہے
نوبت سخن کی ہم تک جب آئی ہے ادب نے
خاموش کہہ کے سب کو خاموش کر دیا ہے
مجلس میں مصحفی کے جو آیا ہے بدعویٰ
میں اک قدح میں اس کو مدھوش کر دیا ہے

منظور اگر تمہیں بھی تماشائے خلق ہے
وابستہ اک نظر کی تمنائے خلق ہے
کس طرح کوئی چین سے بیٹھے کہ رات دن
دور سپہر درپے ایذائے خلق ہے
میرا گناہ کیا ہے جو مجھ بے گناہ پر
عالم سمٹ کے آیا ہے دعوائے خلق ہے

---

* سبک روح دنیا سے چھوٹیں گے سستے
گراں ہونگے وہ جن کو سستی ہے دنیا
حضرت عبرت گورکھپوری

معنی طلب کی صورت خالق پہ ہے نظر
صورت پرست محو تماشائے خلق ہے
شاید کہ آج مصحفی مارا گیا کہیں
اس کی گلی میں کہتے ہیں غوغائے خلق ہے

انداز و ناز میں تجھے استاد کر گئے
اہل زمانہ ہم پہ یہ بیداد کر گئے

کرتے نہیں جو یاد تو بیداد کیجیے
یعنی کسی طرح تو ہمیں یاد کیجیے

ترے چہرے کے ہنگام تماشا دل دھڑکتا ہے
نگاہیں سخت ہیں بیباک اور رخسار نازک ہے
نزاکت عاشق و معشوق کی یکساں نہیں ہوتی
مری گفتار نازک ہے تری رفتار نازک ہے

ہم اٹھ کر خواب سے تیری گلی کا قصد کرتے ہیں
گدا کو صبحدم جوں بارگاہ شاہ یاد آوے

برق رخسار یار پھر چمکی   اس چمن کی بہار پھر چمکی
میرے گریہ سے آب و تاب آیا   صورت روز گار پھر چمکی
دیکھیو پاؤں رکھ دیا کس نے   آج کیوں نوک خار پھر چمکی

اس کی رفتار کا مذکور جب آ جاتا ہے
جی کی ہوتی ہے یہ حالت کہ رندھا جاتا ہے
کون اس باغ میں اے باد صبا جاتا ہے
رنگ رخسار سے پھولوں کے اڑا جاتا ہے
دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے منت دست
پرزے ہو ہو کے گریبان اڑا جاتا ہے

کیا ستم ہے کہ تو غرفے میں پھرے بال کھلے
اور نظارہ ترا دیدۂ روزن مارے

دشمن و دوست کو الفت نے تری ایک کیا
ہاتھ پر ہاتھ نہ کیوں شیخ و برہمن مارے
اے خوشا حال انہوں کا جو ترے کوچے میں
خاک پنڈے سے ملے بیٹھے ہیں آسن مارے

مصحفی کام مرا ضبط سے اب در گزرا
کب تلک غم میں کسی کے کوئی تن من مارے

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے
پھروں میں اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے
بکھیر دے جو وہ زلفوں کو اپنے مکھڑے پر
تو مارے شرم کے آئی ہوئی گھٹا پھر جائے
تو در کو شوق سے رکھ بند پر نہ اتنا بھی
کہ آوے جو کوئی وہ ہو کے بدگماں پھر جائے

اسی سبب تو پریشاں رہا میں دنیا میں
کہ سالہا تری زلفوں کی ابتری دیکھی
حسرت موہانی کے اس مصرع کا سلسلہ کہاں پہونچتا ہے؟
''وہ ابتری جو تری زلف پر شکن میں رہے''

جس دم وہ میری خاک کو ٹھوکر لگا چلے
چوکے یہی کہ واں سے نہ دامن اٹھا چلے
بلبل کے مشت پر بھی اڑاؤ تو سیر ہے
غنچوں کو چٹکیوں میں تو آخر اڑا چلے
لیلی بھی سیر باغ کو ہوتی نہیں سوار
ناقہ کے آگے آگے نہ جب تک صبا چلے
نالے تو ہم نے وادئی غربت میں سر کئے
پرخفتگان خاک کو ناحق جگا چلے

میں دوڑ کے لگ جاؤں ہوں ظالم کے گلے سے
جب تک کہ نزاکت سے وہ تلوار سنبھالے

کھولدیتا ہے تو جب جا کے چمن میں زلفیں
پا بہ زنجیر نسیم سحری نکلے ہے
مصحفی کس کے کھلے بال تو دیکھ آیا ہے
کہ تری وضع سے شوریدہ سری نکلے ہے

زلف رخسار پہ کھولی تھی سر شام اس نے
کہ سیاہی شب ہجراں کی تھی آغاز ہوئی

جو ہے سو تمہارا ہی طرفدار ہے صاحب
ہندو ہیں ہمارے نہ مسلمان ہمارے

میں اتنے اشعار نقل کر کے اس مضمون کو اس قدر طول نہ دیتا لیکن مصحفی کا کلام چونکہ عام طور پر دستیاب نہیں اس لئے اسے ضروری سمجھا گیا - بہر حال آپ یہ مضمون یہاں تک دیکھ کر میرے اس بیان کی صداقت کا احساس غالباً کر چکے ہوں گے کہ اگرچہ میر کا سوز و ساز ایک نرم اور معتدل شکل میں مصحفی کے یہاں موجود ہے اور یہ نرمی و اعتدال ایک نفوی صفت نہیں ہے بلکہ ایک اثباتی صفت ہے - پھر دلی میں مصحفی تنہا وہ شخص تھا جس کی طبیعت کو سودا کے رنگ طبیعت سے خاص مناسبت تھی - وہ شگفتگی و رنگینی ، وہ البیلا پن اور رسیلا پن ، وہ سج دھج ، وہ نشاط و سرمستی ، جو سودا کی خصوصیتیں تھیں ! یہی صفات بیک وقت کچھ نرم ہو کر ، نکھر کر اور زیادہ سبک رفتار ہو کر مصحفی کی رچی ہوئی اور سنواری ہوئی شاعری میں جلوہ گر ہیں - اگر ہم اس مرکزی و مستقل خصوصیت کو بیان کر دینا چاہیں جو میر و سودا کے مختلف اندازوں کو اڑاتے ہوئے بھی مصحفی کے وجدان و کلام میں جاری و ساری ہے ، تو اس کو ہم ایک رچا ہوا اعتدال کہہ سکتے ہیں یا ایک تحت الغنائی کیفیت - اگر میر کے یہاں آفتاب نصف النہار کی پگھلا دینے والی آنچ ہے تو سودا کے یہاں اس کی عالمگیر روشنی ہے - لیکن آفتاب ڈھل جانے پر سہ پہر کو گرمی اور روشنی میں جو اعتدال پیدا ہو جاتا ہے ، اور اس گرمی اور روشنی کے ایک نئے امتزاج سے جو معتدل کیفیت پیدا ہوتی ہے ، وہ مصحفی کے کلام کی خصوصیت ہے - مصحفی کے کلام میں بے پناہ اشعار نہ سہی ، نرم نشتر

نہ سہی ، لیکن شبنم کی نرمی اور شعلۂ گل کی گرمی کا ایسا امتزاج ہے ، جو اُس کی خاص اپنی چیز ہے ۔ اس کے یہاں تنقید حیات نہ سہی لیکن ایک مزاج حیات ہے ؛ اور یہ مزاج جاذب توجہ ہے ۔ کیا ایک رچے ہوئے مزاج شاعری کی تخلیق تنقید حیات نہیں ہے ؟ مصحفی محض ایک کمتر میر یا ایک کمتر سودا نہیں ہے ، وہ ہے مصحفی ۔ اس کی شاعری ایک نجی شخصیت ہے ۔ اس کی عروس سخن کے خد و خال جدا ہیں ۔ جس کے کومل اور رسمسے گات میں نئی دلکشی ، نیا سہاگ اور نیا جوبن ہے ۔ اس کے نغموں کی شبنم سے دھلی ہوئی پنکھڑیاں آن گلہائے رنگا رنگ کا نظارہ کراتی ہیں ، جن کی رگیں کچھ دکھی ہوئی ہیں ، اور جن کی چٹیلی مسکراہٹ سے بھینی بھینی بوئے درد آتی ہے ۔ مجھے اس وقت دو شاعروں کے نام یاد آگئے ، ایک حالی، جو میر کے رنگ میں اسی اعتدال کا ثبوت دیتے ہیں ، جو مصحفی کی مرکزی اور مستقل خصوصیت ہے ؛ اور پھر حسرت موہانی ، جو مصحفی کی رنگینی کی تقلید کرتے ہوئے مصحفی کے اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ حالی :—

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ
ہو گئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

———

بیقراری تھی سب اُمید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازیِ شب ہجراں میں نہیں

———

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

———

کر دیا خوگر جفا تو نے　　خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

———

حسرت موہانی :—

رنگ سوتے میں چمکتا ہے طرح داری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

———

دل کو خیال یار نے مخمور کر دیا
ساغر کو رنگ بادہ نے پر نور کر دیا

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے
ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ہے

رونق پیرہن ہوئی خوبئی جسم نازنیں
اور بھی شوخ ہوگیا رنگ تیرے لباس کا

آنکھوں کے تبسم نے سب کھول دیا پردہ
ہم پر نہ چلا جادو اے چین جبیں تیرا

جہاں تک خیال و بیان میں اعتدال و میانہ روی کا تعلق ہے، حالی کے یہ اشعار میر کی تقلید ہیں نہ حسرت کے اشعار سودا کی تقلید، دونوں کے یہاں مصحفی کا رنگ آگیا ہے۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ شعر میں جب داخلیت اور خارجیت کا امتزاج ہوتا ہے تو زبان و بیان کی طرف بھی شاعر کی توجہ خاص طور پر ہونے لگتی ہے، اور یہی وہ خصوصیت تھی جس نے سودا کو قادرالکلام بنایا۔ زباندانی میں میر سودا سے کم نہ تھے، لیکن چونکہ سودا کی طبیعت میں شگفتگی زیادہ تھی اس لئے اس کی زبان نکھر گئی تھی۔ مصحفی میں میر کا شدید المیہ جذبہ یا ہیجان (High Tragic Passion) نہیں ہے، نہ مصحفی کا غم بیدلی کا رنگ اختیار کرتا ہے۔ اور چونکہ مصحفی کی طبیعت میں ہر چند وہ طلاطم، وہ طوفان، وہ جوش و خروش نہیں ہے جو سودا کا حصہ ہے، پھر بھی اس رنگینی و خارجیت نے جو مصحفی کے وجدان میں تھی اُس کی زبان میں ایک خاص نکھار پیدا کر دیا ہے اور اس کو اتنا ہموار اور سبک بنا دیا ہے کہ مشکل زمینوں کو شگفتہ کر دکھانے میں وہ سودا سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ اُردو کا شاعر یا میری ہوتا ہے یا سودائی۔ سودائی ہونے کی پھبتی ذوق پر غالب نے کامیابی سے کس دی لیکن مصحفی پر یہ پھبتی نہیں کسی جا سکتی۔

خود مصحفی کا بیان سنیے ۔ ایک رباعی میں وہ اپنے کو سودا کے بعد آنے والا شاعر بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ میری شاعری کی شان سودا سے الگ ہے ۔

سودا کا سرد ہو چکا ہے بازار
اب بزم سخن ہے میرے دم سے گلزار
ہے شان تری جلوہ گری میں ہر وقت
سچ ہے کہ تجلی کو نہیں ہے تکرار

چوتھے مصرع میں اپنی انفرادیت کا نکتہ مصحفی نے صاف صاف بیان کر دیا ہے ایک اور رباعی ملاحظہ ہو :-

اس کلبۂ احزاں کو وطن تو نے کیا
اس تودۂ خاک کو چمن تو نے کیا
القصہ کہ مصحفی کو اپنے یارب
دستاں زن گلزار سخن تو نے کیا

جب اجڑی دلی چھوڑ کر مصحفی لکھنؤ پہونچے ، تو یہاں جرأت و انشا کا طوطی بول رہا تھا ۔ جرأت کی معاملہ بندی بہ حیثیت مجموعی اردو غزل میں ایک نئی چیز تھی ۔ آنے کو تو دلی سے یہاں میر ، سوز اور سودا بھی آ چکے تھے ، لیکن ان تینوں میں سے کسی پر جرأت کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی اور خاص لکھنؤ کا بھی کوئی شاعر بڑا یا چھوٹا جرأت کا انداز نہ اڑا سکا ، لیکن مصحفی نے جرأت کے رنگ کو اختیار کیا اور ایسے حسن کے ساتھ کہ وہ مخصوص انھی کی چیز نظر آنے لگا ۔ جرأت کا مخصوص رنگ اس کے ان اشعار میں جھلک رہا ہے :-

دیکھا تو یوں وہ کہہ کے لگے منہ کو ڈھانپنے
کمبخت پھر لگا مجھے نظروں میں بھانپنے

جب یہ سنتے ہیں وہ ہمسایہ میں ہیں آئے ہوئے
کیا دور بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

اس ڈھب سے کیا کیجیے ملاقات کہیں اور
دن کو تو ملو ہم سے، رہو رات کہیں اور

اک واقف کار اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات
جرأت کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم
کیا جانیے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

ان حدود سے بڑھ جاتا ہے تو جرأت یہاں تک بھی کہہ جاتا ہے کہ :—

بال ہیں بکھرے، بند ہیں ٹوٹے، کان میں ٹیڑھا بالا
جرأت ہم پہچان گئے کچھ دال میں کالا کالا

آخری شعر جرأت کے رنگ کی بہترین مثال نہیں کہی جا سکتی ہے - اس شعر میں انہیں انشا اور رنگین کی ہوا لگ گئی ہے -

جرأت کے عاشقانہ اشعار میں ہر جگہ معاملہ بندی نہیں ہوتی، لیکن واقعیت اور اصلیت ہمیشہ ہوتی ہے - معاملہ بندی کے اشعار میں معشوق کی کردار نگاری خاص چیز ہوتی ہے - لیکن عاشق کی تصویریں کھینچنے میں بھی جرأت نے اسی محاکاتی انداز کا ثبوت دیا ہے جس کا ثبوت اس نے معاملہ بندی میں دیا ہے -

وہ گیا اٹھ کر جدھر کو میں ادھر حیران سا
اس کے جانے پر بھی کتنی دیر تک دیکھا کیا
جب تلک، کرتے رہے مذکور اس کا مجھ سے لوگ
جی میں کچھ سوچا کیا میں اور دل دھڑکا کیا

یہی وہ واقعیت اور اصلیت ہے جو آپ مصحفی کے قریب قریب ان سب اشعار میں پائیں گے، جنہیں میں نے نقل کیا ہے - اب جرأت کے انداز میں مصحفی کے اشعار سنیے - جرأت جنسی نفسیات کی بہت بے لاگ ترجمانی کر جاتا ہے - اس کی دو ٹوک باتوں میں آمد کی شان ہوتی ہے، اور شدید نفسیاتی و کرداری واقعیت - مصحفی ان

نفسیاتی کیفیات کو ذرا نرما دیتا ہے - وہ حسن کی اداؤں کو ، معشوق کی چھب کو ، اپنے دل کی آمنگوں اور آمنگوں کی چٹکیوں کو ، سمجھ سمجھ کر رہ جاتا ہے - اور معاملہ بندی میں ایک خفیف نرم تلملاہٹ پیدا کر دیتا ہے - جمال یار و دید یا رکے خارجی سج دھج پر للچاتا ہوا بھی وہ ان کے مشاہدہ محض سے لطف اندوز ہوتا ہے - معشوق کی اداؤں کی مصوری اس کا خاص موضوع ہے - غرض کہ مصحفی کے للچانے، ترسنے ، جی مار مار کے رہ جانے ، تلملا تلملا اٹھنے ، کسمسانے ، تماشائے حسن اور حسن تماشا کا انداز ، جرأت کے انداز سے کچھ جدا ہے -

میں اس انداز کے صدقے کہ جو کی مجھ پہ نظر
دیکھتے ہی مجھے اُن نے نظر انداز کیا

تمہارے وعدوں پہ ہم کو تو اب نہیں ٹھہراؤ
مگر نیا کوئی امیدوار ٹھہرے گا

آساں نہیں ہے تنہا در اس کا باز کرنا
لازم ہے پاسباں سے اب ہم کو ساز کرنا

سویا تھا لپٹ کر میں اس ساتھ ولے اُس نے
پہلو سے مرے پہلو تا صبح جدا رکھا

کسی کو گرمئی تقریر سے اپنے لگا رکھا
کسی کو منہ چھپا کر نرمئی آواز سے مارا

دل سے خبر نہیں ہے مجھے اس کے مصحفی
آنکھوں میں تو اشارہ کئی بار ہو گیا

عشق سے میرے جو گھبرایا تو پھرنا چار ہو
آ کے گھر میرے وہ مجھ کو آپ سمجھانے لگا

پاس میرے وہ ترا پیار سے آنا نہ رہا
وہ محبت نہ رہی اور وہ زمانہ نہ رہا

ہوش کا اس کے میں کشتہ ہوں کہ وہ مایۂ ناز
شب رہا گھر مرے اور غیر نے جانا نہ رہا

کب شب وصل وہ آیا کہ مرے اور اس کے
درمیاں میں شب ہجراں کا فسانا نہ رہا

ہو کے ناچار کہا میں نہیں جاتا ، اس کو
پاس سے میرے جب اٹھنے کا بہانا نہ رہا

انگڑائی لے کر اپنا مجھ پر خمار ڈالا
کافر کی اس ادا نے بس مجھ کو مار ڈالا

تیرے کوچے کی طرف سینے سے اٹھ دوڑے ہے دل
اس کو یاد آوے ہے جب آنکھ لڑانا تیرا

ہو گیا کیا یہ بگاڑ آہ کہ مطلق نہ رہا
روٹھنا تجھ سے مرا اور منانا تیرا

اب میں اس دن کو بھی روتا ہوں کہ بے لطف نہ تھا
ہاتھ کھہ کھہ کے وہ در پر سے اٹھانا تیرا

ساتھ سونا اس کا یاد آیا جو مجھ کو مصحفی
رات میں بستر پہ کیسا تلملا کر رہ گیا

''رہ گیا'' اور ''رہ گئے'' کی ردیفوں کو مصحفی کے مزاج سے خاص مناسبت ہے ۔ اس نے متعدد غزلوں میں ان ردیفوں کو لیا ہے ۔ ہوتے ہوتے کسی بات کا ''نہ ہونا'' اس کا ہوتے ہوتے ''رہ جانا'' یہی وہ (Tantalizing) باتیں اور موقعے ہیں جن کی مصوری اور ترجمانی اس وقت تک تنہا مصحفی نے کی ۔ آتش ، شاگرد مصحفی نے بھی اس ردیف کو دو غزلوں میں باندھا ہے ۔ ''میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا'' ، ''ہر قدم پر خوف ہے یاں رہ گیا واں رہ گیا'' اور ان کے سو برس بعد کچھ مولانا حسرت موہانی نے اس مخصوص

نفسیاتی کیفیت کی ترجمانی کی - بلکہ مصحفی کی طرز میں بالارادہ غزل لکھتے وقت حسرت نے ''شرما کے رہ گئے'' اور ''قسم کھا کے رہ گئے'' والی زمین منتخب کی - مصحفی کے اب اور چند شعر سنیے :-

ہے ہے ترا سر جھکا کے چلنا پھر شرم سے مسکرا کے چلنا
آنا گھر میں تو کھل کھلانا اور راہ میں منہ بنا کے چلنا

——

غیروں سے میاں تیری ملاقات نہیں خوب
کچھ عقل کے نزدیک تو یہ بات نہیں خوب
یوں آنکھیں ملا جس سے کہ چاہے تو و لیکن
آگے مرے ہر اک سے اشارات نہیں خوب
کیا جانیے کیا سمجھے کوئی ملنے کو صاحب
اتنی بھی تو بندے یہ عنایات نہیں خوب
کیا خوار پھرا کرتے ہو تم اُس کی گلی میں
میاں مصحفی جانے دو یہ اوقات نہیں خوب

——

واں کیونکہ اشاروں میں کہوں حال دل اپنا
جس جا کہ نہ ہو دور سے اک بات کی تقریب
سن سن کے مرے ذکر کو کہتا ہے وہ کافر
ہر ایک کرے ہے اُسی بد ذات کی تقریب
اے مصحفی سو آنکھیں لگیں دیکھنے اس سے
نکلی جو کبھی حرف و حکایات کی تقریب

——

ہمسایگی پہ پار کی کیا دل کو خوش کروں
مجھ سے تو ہے کھنچا وہ حیا دار بے طرح

——

سحر ہے رخ پہ ترے زلفوں کے بل کھانے کی طرح
سیکھے کوئی تجھ سے پیارے دل کے لے جانے کی طرح
کل جو وہ رستہ میں ناگہ مل گیا تھی دیدنی
میرے رہ جانے کی وضع اور اس کے رک جانے کی طرح

——

شب ہم سے وہ روٹھے تو ہمیں چھوڑ کے باہر
جا گھر میں الگ سو رہے زنجیر لگا کر

———

دیکھا تھا بات کرتے اسے ساتھ غیر کے
سو اپنا جی کھپے ہے اسی بات میں ہنوز

———

ہوئے نہ وصل کی دولت سے ہم کبھی محظوظ
جو رفتہ رفتہ ہوا بھی تو مدعی محظوظ

———

کام کر جاتی ہیں تری آنکھیں چپکے چپکے ہزار آنکھوں میں

———

تمہاری اور مری کج ادائیاں ہی رہیں
رہے جو پاس تو باہم لڑائیاں ہی رہیں

———

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے دل میں کیا کیا خیال باندھے *

———

ہنستے ہو تو اچھی ہی طرح مجھ کو ہنسو نہ
یوں منہ میں میاں کاہے کو رومال دیا ہے

———

تو در کو شوق سے رکھ بند پر نہ اتنا بھی
کہ آوے جو کوئی وہ ہو کے بدگماں پھر جائے

———

الجھا ہے تو کس سے کہ ترے جامہ کے پیارے
نے چین ٹھکانے ہے نہ داماں ٹھکانے

———

ایسا نہ ہو پھر ، ہم بھی کریں اور سے یاری
اس حسن پہ کچھ آپ ہیں مغرور بہت سے

———

کہتا تھا وہ شب ڈال کے باہوں کو گلے میں
گردن پہ ترے ہیں کئی احسان ہمارے

---

* تو اور آرائش خم کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز — غالب

آپ نے دیکھا کہ جرأت کے رنگ کو اگر کسی نے نباھا تو وہ مصحفی ھے، لیکن ''چوما چاٹی'' اور ''دھول دھپا'' سے مصحفی صاف بچ گیا ھے۔ معاملہ بندی اور محاکاتی انداز میں وہ جرأت سے کچھ کم ضرور ھے لیکن مصحفی کے اعتدال اور ایک لطیف حسرتناک لہجہ نے عجیب لطف پیدا کر دیا ھے۔

مصحفی کو شاعری میں اگر واقعی مصیبت پیش آئی تو اس بد مذاق میں شریک ھونے کے وقت آئی، جس نے انشا کو اور جس کو انشا نے اچھال رکھا تھا۔ کاش! انشا نے اپنے خاص رنگ کو سلیقے اور قرینے سے نباھا ھوتا اور نئی راہ نکال کے اتنا نہ بھٹکتے تو آج وہ زبردست سنجیدہ صاحب طرز ھوتے! کیونکہ انشا کے مخصوص رنگ میں اگر اسے مستقل طور پر سلیقے سے برتا جائے، تو ایک نئی قسم کی غزل گوئی کا امکان ھے۔ چنانچہ اسی سے عام خیال ھے کہ اگر انشا کو اھل دھلی یا سنجیدہ لوگوں کی صحبت نصیب ھوئی ھوتی تو وہ زبردست شاعر ھوتا۔ میں کہتا ھوں کہ انشا کو خود اپنی صحبت اگر نصیب ھوئی ھوتی تو وہ غضب کا شاعر ھوتا۔ افسوس کہ خود اپنی صحبت انشا کو اس وقت نصیب ھوئی جب وہ ختم ھو چکے تھے۔ انشا کا فطری میلان اھل دھلی یا سنجیدہ لوگوں کے مزاج سے میل نہیں رکھتا تھا۔ وہ میر، سودا اور مصحفی کے زمرے میں شریک ھونے کے لئے نہیں بنا تھا۔ البتہ قصیدے اور ھجویں لکھنے والا سودا ضرور انشا سے کچھ ھم آھنگ ھے۔ لیکن سودا کی ھجوؤں کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کی حیرت انگیز صلاحیت انشا میں تھی، وہ نہایت عجیب و غریب تھی۔ جرأت اور انشا مسلسل غزلوں کے لیے بھی خاص طور پر مناسب طبیعتیں لے کر آئے تھے۔ انشا کے چند وہ شعر سنیے جن کی زمینوں میں مصحفی کو بھی طبع آزمائی کرنی پڑی:—

سج گرم، جبیں گرم، نگہ گرم، ادا گرم
وہ سرے سے ھے تا ناخن پا، نام خدا گرم

——

پر تو سے چاندنی کے ھے صحن باغ ٹھنڈا
پھولوں کی سیج پر آ، کردے چراغ ٹھنڈا

——

لے کے میں اوڑھوں بچھاؤں یا لپیٹوں کیا کروں
روکھی پھیکی سوکھی ساکھی مہربانی آپ کی

جھڑکی سہی ، اداسہی ، چین جبیں سہی
یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی
گر نازنیں کہے کا برا مانتے ھیں آپ
میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی
منظور دوستی جو تمہیں ھے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضائقہ انشا سے کیں سہی

یا انشا کی ''آفتاب آلٹا'' ''نقاب آلٹا'' والی غزل ۔ یہ رنگ انشا سے پہلے آردو غزل میں تھا ھی نہیں ، اور غزل کے سوز و ساز وغیرہ کے متعلق ھمارے جو کچھ بھی اصول ھوں ، اور یہ اصول انشا کے اس انداز سے چاھے کتنے ھی مجروح ھوتے ھوں ، لیکن حقیقت یہ ھے کہ ایسے اشعار سن کر ایک بار زاھد خشک کے منہ سے بھی واہ نکل ھی جائے گی ۔ کاش کے اس رنگ میں انشا کے دو تین سو شعر ھمارے پاس محفوظ ھوتے !

انشا نے اس شوخ رنگ کو بگاڑا کیوں کر ؟ بات یہ ھے کہ میر کا رنگ ھو یا کسی اور شاعر کا ، جب وہ جزئیات کا شکار ھو جائے گا تو ضرور بگڑ جائے گا ۔ انشا نے اپنے ساتھ اور اپنے رنگ کے ساتھ بے اعتدالی یہ برتی کہ خارجی چیزں کو مثلاً ''چولی'' ''دوپٹہ'' ''ازاربند'' ''چوڑیوں'' اور ''جوتیوں'' کو لے لیا اور اپنے طربیہ وجدان (Comic Sprit) کو نقالی (Farce) بنا دیا ۔

بعض زمینوں میں انشا اور مصحفی دونوں کی غزلیں ھیں ، مگر انشا کی شوخی اور گرما گرمی اتنی بے پناہ چیز ھے ، کہ مصحفی دب جاتا ھے ۔ لیکن یہ رنگ مصحفی کے شایان شان بھی نہ تھا ، اور اس لئے وہ انشا کی طرح کھل کھیلنے سے معذور تھا ۔ غالب اور انیس معمولی لوگ نہ تھے ۔ لیکن انیس ، غالب کے انداز میں ایک غزل بھی نہیں کہہ سکتے تھے ، اور نہ غالب انیس کے اندز میں مرثیہ کہہ

سکتے تھے - ان میں سے کوئی اگر دوسرے کا رنگ اڑانا چاہتا تو منہ کی کھاتا - غزل ہی کو لے لیجیے - غالب ظرافت ، شوخی اور طنز کا بادشاہ ہے - لیکن داغ کے چنچل رنگ میں غالب سے بھی غزل نہ ہوتی اور داغ سے غالب کی شوخی نہ نبھتی - اس لئے اگر مصحفی وہ شوخی و طراری نہ دکھا سکے جو انشا کے لیے مخصوص تھی ، تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مصحفی کسی طرح بھی انشا سے کم تھے - یہ بات یاد رہے کہ بڑے سے بڑا شاعر صرف اس لئے بڑا نہیں ہے کہ وہ اپنے رنگ میں لاثانی ہے یا نہایت کامیاب ہے - بلکہ اس لیے بھی بڑا ہے کہ دوسرے رنگ میں کہنے سے وہ معذور ہے - حقیقی شاعری میں کچھ معذوریاں بھی شامل ہوتی ہیں - شاعر بہروپیا نہیں ہوتا - مصحفی اور انشا کی جو ہم طرح غزلیں ملتی ہیں ، انشا اور مصحفی نے اپنے اپنے رنگ کو کامیابی سے نباہا ہے - انہیں دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ انشا کی غزلیں اپنی جگہ ہیں ، اور مصحفی کی غزلیں اپنی جگہ - ہر چند کہ مصحفی کے کلام میں ترنم ، سلاست اور رنگینی سب کچھ ہے اور زبان و بیان کے معاملہ میں بھی اس کو انشا پر تفوق حاصل ہے ؛ اور معنویت میں تو وہ انشا سے کوسوں آگے ہے - لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ سطحی بلکہ بازاری جذبات بھی زور بیان اور جوش بیان سے نکھر آتے ہیں ؛ اور یہی ایک آنچ کی کسر مصحفی کے معانی و بیان کو پوری طور پر نکھرنے نہیں دیتی - یوں تو ادب اور شعر کا نسبتی اور متقابلانہ مطالعہ پر لطف اور کار آمد بلکہ ضروری چیز ہے - لیکن ایسے مطالعے میں گمراہ ہو جانے کا احتمال رہتا ہے اور خاص کردو مختلف المذاق شاعروں کا مطالعہ - بات یہ ہے کہ مصحفی اور انشا کی ان غزلوں کا ساتھ ساتھ فیصلہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے قدرتی پھولوں اور آتش بازی کے پھولوں کا مقابلہ کرنا - انشا کی شاعری ہمارے وجداں کی ظاہری سطح کو لے اڑتی ہے اور ہم میں متکیف یا متاثر ہونے کی صلاحیت ہی نہیں رہ جاتی - لیکن اس اثر سے بچ کر اگر ہم اپنے دل کی دھڑکنوں کو انشا اور مصحفی کی ہم طرح غزلوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں تو انشا ساز بے آہنگ ہو کر رہ جائے گا اور مصحفی ساز با آہنگ ثابت ہوگا - انشا ، ہمارے تخئیلی سماعت کو تشفی نہیں بخشتا اور مصحفی ہماری سامع نوازی کرتا ہے - بہر حال اس سلسلہ میں جو کچھ میں نے

لکھا ہے وہ مصحفی اور انشا کی ہم طرح غزلوں پر بحیثیت مجموعی اظہار رائے کیا ہے ، ورنہ متفرق اشعار اور خاص قافیوں میں کبھی مصحفی زیادہ کامیاب ہیں اور کبھی انشا ، اور کبھی دونوں برابر رہتے ہیں ۔ مثلاً مصحفی کا مطلع ہے :—

جو پھرا کے اس نے منہ کو بقضا نقاب آلٹا
ادھر آسمان آلٹا آدھر آفتاب آلٹا

اور انشا کا مطلع ہے :—

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب آلٹا
کہ پڑا ہے آج خم میں قدح شراب آلٹا

لیکن جواب کا قافیہ اگرچہ مصحفی نے دو اسلوب سے باندھا ہے :—

بسوال بوسہ اس نے مجھے رک کے دی جو گالی
میں ادب کے مارے اسکو نہ دیا جواب آلٹا

میں لکھا ہے خط تو قاصد پہ یہ ہوگا مجھ پہ احسان
انہیں پاؤں پھر کے آ تو جو ملے جواب آلٹا

پھر بھی انشا نے بہت برجستہ کہا ہے :—

عجب الٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے
کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب آلٹا

مصحفی کا شعر ہے :—

کسی مست کی لگی ہے مگر اس کے سر کو ٹھوکر
جو پڑا ہے میکدہ میں یہ خم شراب آلٹا

لیکن اس قافیہ کو انشا نے نہایت مستانہ انداز سے باندھا ہے :—

ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست بھر کے نعرہ
جو زمیں پہ پھینک مارے قدح شراب آلٹا

ایک دوسری غزل میں دونوں کے اشعار یہ ھیں :—

انشا

پر تو سے چاندنی کے ھے صحن باغ ٹھنڈا ،
پھولوں کے سیج پر آ کردے چراغ ٹھنڈا
مے کی صراحی ایسی لا برف میں لگا کر
جس کے دھوئیں سے ھووے ساقی دماغ ٹھنڈا
ھیں ایک شخص لاتے خس کی شراب انشا
دھودھا گلاب سے تو کر رکھ ایاغ ٹھنڈا

مصحفی

پیری سے ھو گیا یوں اس دل کا داغ ٹھنڈا
جس طرح صبح ھوتے کر دیں چراغ ٹھنڈا
سر گرم سیر گلشن کیا خاک ھوں کہ اپنا
نزلہ سے ھو رھا ھے آپی دماغ ٹھنڈا
گرمی کی رت ھے ساقی اور اشک بلبوں نے
چھڑ کاؤ سے کیا ھے سب صحن باغ ٹھنڈا
ایسے میں اک صراحی شورے لگی منگا کر
لبریز کرکے بھر دے مجھ کو ایاغ ٹھنڈا

مصحفی کا یہ رنگ لکھنؤ کی خارجیت کا فیضان ھے جو سودا کی خارجیت سے بالکل علیحدہ چیز ھے ۔ ھم کو مصحفی کے یہاں اس طرح کے اشعار بھی ملتے ھیں جو انشا کے کچھ کم بگڑے ھوئے اور کبھی بہت زیادہ بگڑے ھوئے رنگ میں ھیں ۔ مثلاً :—

یہ طرفہ اختلاط نکالا ھے تم نے واہ
آتے ھی پاس چٹ سے وھیں مار بیٹھنا

———

رات پردے سے ذرا منہ جو کسو کا نکلا
شعلہ سمجھا تھا اسے میں وہ بھبھو کا نکلا

———

پانی بھرے ھے یارویاں قرمزی دوشالہ
لنگی کی سبج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا

———

گیند بازی سے اذیت نہ کہیں پہونچے تمہیں
کہ پلٹتی ہے بری طرح سے سرکار کی گیند

———

میری طرح سے یار نے میلا کیا لباس
پر کیا کہوں پھبا اسے کیا ملگجا لباس
ہم تو کبھی کہیں نہ کہ کپڑے اتاریئے
پہنا کریں گر آپ اسی وضع کا لباس

اب لگے ہاتھوں اس رنگ میں انشا کے بھی اشعار سن لیجیے :—

جوگی جی صاحب آپ کی بھی واہ
دھرم مورت عجب کڈھنگی ہے
چشم بد دور شیخ جی صاحب
کیا ازار آپ کی آٹنگی ہے

———

لیا گر عقل نے منہ میں دل بیتاب کا گٹکا
تو جوگی جی دھراوہ جائے گا سیماب کا گٹکا

———

ہیں زور حسن سے وہ نہایت گھمنڈ پر
نام خدا نگاہ پڑے کیوں نہ ڈنڈ پر

دونوں کا فرق ظاہر ہے اور یقیناً اس رنگ میں مصحفی انشا کو نہیں پہنچتا۔

اب سوال یہ ہے کہ مصحفی کو ہم دلی کا شاعر سمجھیں یا لکھنؤ کا؟ خود تو وہ کہتا ہے :—

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں
دلی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

میں تو کہوں گا کہ جس طرح وہ عمر بھر بے وطن تھا اسی طرح اس کی غزلیں بھی دلی اور لکھنؤ کے دورا ہے پر آواز باز گشت کی طرح گونج رہی ہیں۔ مصحفی کے اشعار سنیے :—

اے مصحفی تو واں سے کیوں روٹھ کے آیا تھا
دیوانے تری خاطر کڑھتا ہے وطن سارا

روئے وطن نہ دیکھا تو نے جو مصحفی پھر
شاید کہ جھینکتے تو اپنے وطن سے نکلا

میں اک فقیر غریب‌الوطن مسافر نام
رہے ہے آٹھ پہر جس کو قوت کی تدبیر
مرے حواس پریشاں بایں پریشانی
ہو جیسے لشکر بشکستہ کی خراب بہیر
جو کچھ ہوا سو ہوا مصحفی بس اب چپ رہ
زیادہ کر نہ صداقت کا ماجرا تحریر
خدا کو چھوڑ دے اس بات کو وہ مالک ہے
کرے جو چاہے جو چاہا کیا بحکم قدیر

ایک رباعی میں کہتا ہے :—

یارب شہر اپنا یوں چھڑایا تو نے
ویرانے میں مجھ کو لا بٹھایا تو نے
میں اور کہاں یہ لکھنؤ کی خلقت
اے وائے یہ کیا کیا خدایا تو نے

رہا مصحفی کا محض مقلد اور انتخابی شاعر ہونا ، سو یہ محض نیم صداقت ہے اور میں نے اب تک جو کچھ اس باب میں لکھا ہے اس سے مصحفی کی انفرادی حیثیت واضع ہو گئی ہوگی ۔ اس کا اپنا بھی ایک رنگ طبیعت ہے جس کا وہ تنہا مالک ہے اور جو کسی اور شاعر کا نہیں ۔ مصحفی کا کلام جتنا پڑھے جانے کا مستحق ہے اور آسے جس طرح پڑھنا چاہیے ، اتنا اور اس طرح وہ غالباً نہیں پڑھا جاتا ۔ اس مضمون کے لئے جب تک میں نے خود اپنے تاثرات پر غور نہیں کیا مصحفی کی شاعری اور اس کے مزاج کی خصوصیتیں خود مجھ پر نمایاں نہیں ہوئی تھیں ۔

آپ مصحفی اور خاندان مصحفی کے شعرا سے قطع نظر کرکے تمام مشہور غزل گویوں کا تصور کیجیے ؛ میر ، سودا ، سوز ، درد ،

غالب، مومن ، ذوق ، داغ ، جرأت ، انشا ، ناسخ وغیرہ وغیرہ - اس کے بعد اگر یہ اشعار سنیے تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ ان اشعار میں کسی اور آستاد کا رنگ نہیں بلکہ مصحفی کا اور صرف مصحفی کا رنگ جھلک اور دمک رہا ہے - جذبات کا اعتدال دیکھیے :—

آتش :—

چال ہے مجھ نا تواں کی مرغ بسمل کی تڑپ
هر قدم پر خوف ہے یاں رہ گیاواں رہ گیا

——

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے قافلہ روانہ ہوا
دہن پر ہیں ان کے گماں کیسے کیسے
سخن آتے ہیں درمیاں کیسے کیسے

اسیر :—

نبض بیمار کی اے رشک مسیحا دیکھی
آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی

——

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہ ناز ہے کس کی
ہزاروں آٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

امیر :—

خنجر نے ترے دیا نہ پانی ترسا ترسا کے مار ڈالا

——

سرد آہیں جب کسی نے کیں وطن یاد آگیا
چار جھونکے جب چلے ٹھنڈے چمن یاد آ گیا
جس جگہ دو گز زمیں پائی کھدی سمجھا میں گور
جب نئی دو چادریں دیکھیں کفن یاد آ گیا
تن سے باہر آ کے دھیان آیا عدم کا روح کو
قید سے چھٹ کر مسافر کو وطن یاد آ گیا
نزع میں سنگیں دلی کا حال شیریں پر کھلا
موت کی سختی آٹھائی کوہکن یاد آ گیا

گور میں بھی ہم نہ بھولے صحبت احباب کو
گوشۂ خلوت میں لطف انجمن یاد آ گیا

جامۂ صد پارۂ گل جب نظر آیا مجھے
سو جگہ سے چاک اپنا پیرہن یاد آ گیا

رہ گیا اپنے گلے میں ڈال کر بانہیں غریب
عید کے دن جس کو غربت میں وطن یاد آ گیا

جلیل :—

جھومتی آج جو متوالی گھٹا آئی ہے
یاد کیا کیا تری مستانہ ادا آئی ہے

پھونکے دیتی ہے مجھے یاد مرے ساقی کی
آگ برساتی دھواں دھار گھٹا آئی ہے

ہم کو کیا بلبل و گل میں ہے کوئی بات اگر
وہ صبا تھی جو زمانے میں اڑا آئی ہے

———

اب اس کو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور کہو
تمہارے حسن کا چرچا ضرور میں نے کیا

———

آئے وہ اس ادا سے نسیم سحر کے ساتھ
جتنے چراغ بزم تھے قربان ہو گئے

صبا :—

باغباں بلبل کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اترا کبھی میلا ہو کر

———

اختیاری عمل رند قدح نوش نہیں
خط تقدیر ہے موج مے سر جوش نہیں

———

پہلو میں نگار ہاتھ میں جام
اس وقت تو بادشاہ کیا ہیں

اثر عظیم آبادی :—

حسن کی جنس خریدار لیے پھرتی ہے
ساتھ بازار کا بازار لیے پھرتی ہے
در بدر حسرت دیدار لیے پھرتی ہے
سر ہر کوچہ و بازار لیے پھرتی ہے
دیکھ اے جان جہاں شمس و قمر کو دن رات
آج تک حسرت دیدار لیے پھرتی ہے

———

رات کیا کیا نہ بڑھا درد جگر مت پوچھو
کس خرابی سے کٹے چار پہر مت پوچھو
ہمدمو کہہ تو چکے حال دل خوں گشتہ
اب ہمیں تاب نہیں بار دگر مت پوچھو
کچھ خدا جانتا ہے جیسے بسر ہوتی ہے
زندگی ہے کہ مصیبت ہے اثر ، مت پوچھو

والد مرحوم حضرت عبرت گورکھپوری :—

زمانے کے ہاتھوں سے چارا نہیں ہے
زمانہ ہمارا تمہارا نہیں ہے
وہ چاہے تو خوش کر دے دم بھر میں عبرت
پر ایسا مقدر ہمارا نہیں ہے

———

کیا ڈھونڈھتی ہے گلشن عبرت میں اے خزاں
تو جانتی ہے سب کے چمن میں بہار ہے

———

ایک وہ بال ہیں جو ہیں سر و گردن پہ وبال
ایک وہ بال ہیں جو تا بہ کمر جاتے ہیں

———

پوچھو مجھے کہ دہر میں اک کس مپرس ہوں
دیکھو مجھے کہ ہیچ ہوں سب کی نگاہ میں

راقم الحروف (فراق بہ زمانۂ نو مشقی)

سوئے ہوئے نصیب نہ جاگے ہمارے حیف
ہنگامے تیری چال سے لاکھوں بپا ہوئے

راقم‌الحروف (فراق) کئی سال کی مشق کے بعد،

اک ذرا عشق سبک روح گرانبار سہی
نگہ شوق میں کچھ شرم کے آثار سہی

آسے خلوت میں حیا آئے کیا
وہ تو خود شرم ہے شرمائے کیا

غم‌زدوں کا کیوں پتہ دینے لگیں باتیں تری
دن ترے بھرپور، رنگارنگ ہیں راتیں تری

کہہ گئی لہلہا کے قوس قزح
داستاں تیری نوجوانی کی

یہ نمونہ ہے اُن شعراء کے کلام کا جو ایک آدھ کو چھوڑ کر سب مصحفی کے خاندان سے ہیں اور جن کو بالواسطہ یا بلاواسطہ مصحفی سے فیض پہونچا ہے۔ مصحفی، ان کے شاگرد اور ان کے شاگردوں کے شاگرد، جس طرح پھلے پھولے اس طرح کس کی کھیتی لہلہائی؟ مندرجہ بالا اشعار کو دیکھیے اور سوچیے کہ ان اشعار کو نقل کرنے سے قبل میں نے جن صاحب طرز استادوں کا نام لکھ دیا ہے وہ یا ان میں سے کوئی بھی ان اشعار کو دیکھ کر یاد آتا ہے! کیا یہ تمام اشعار ناگزیر طور پر ہمیں مصحفی اور تنہا مصحفی کی یاد نہیں دلاتے! وہی نرمی، وہی ہمواری، وہی حلاوت، وہی اعتدال و رنگینی، وہی تناسب، وہی توازن، وہی صوتی اور معنوی اثرات، وہی میٹھا میٹھا درد، وہی بندش میں چستی و نرمی کا امتزاج، وہی نرم کشاکش جو کلام مصحفی میں پائی جاتی ہے یہاں بھی موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں اسیر لکھنوی شاگرد مصحفی کے بھی دو شعر میں نے دیئے ہیں۔ ذرا غور، کیجیے لکھنؤ اسکول کی غزل گوئی غریب بہت بد نام ہے۔ لیکن ''آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی''، یہ مصرع کیا سوائے لکھنؤ کے کہیں اور کسی شاعر کے لئے ممکن تھا! اکثر کہہ دیا جاتا ہے، غالباً غالب ہی نے کہا تھا کہ دلی مضمون کے لئے مشہور ہے اور لکھنؤ زبان کے لئے۔ یہ بات سچ بھی ہے اور غلط بھی۔ کیونکہ دہلی کے شعرا کے یہاں بھی زبان کی بہت

سی خوبیاں ملتی ہیں اور روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی سے اہل دلی کا کلام خالی نہیں ہے - لیکن میرے نزدیک دلی اور لکھنؤ کی خالص زبان کی شاعری میں بھی 'یک اہم فرق ہے - وہ یہ کہ دلی والے زبان میں بھی جو اشعار کہتے ہیں اُن میں معنویت بیان پر حاوی رہتی ہے - اس کے برعکس لکھنؤ والے جب زبان میں شعر کہتے ہیں تو قریب قریب تمام تر توجہ زبان اور محاورہ کے حسن کی طرف مبذول ہو جاتی ہے - اب اسیر کا دوسرا شعر لیجیے - مضمون کے لحاظ سے تو یہ شعر لکھنؤ اسکول کا معلوم ھی نہیں ہوتا اور بادی النظر میں غالب کا انداز اس شعر میں معلوم ہوتا ہے - لیکن ''ہزاروں آٹھ گئے'' ، وہ ٹکڑا ہے جو غالب کی زبان نہیں بلکہ لکھنؤ کی زبان ہے ، اور یہی وہ سجاوٹ ہے ، یہی وہ رچا ہوا انداز بیان ہے ، یہی وہ رنگین بول چال ہے ، جس کی طرف مصحفی اردو غزل کو لے گیا اور جو لکھنؤ کی خاص چیز ہو گئی - یہی چیزیں تو انیس کے مرثیوں میں قیامت ڈھاتی ہیں - ''تلوار پہ تلوار چمکتی نظر آئے'' یا ''ہر آنکھ کو پریوں کا اکھاڑہ نظر آئے'' ، ''تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا'' ، ان مصرعوں کا صوتی اثر وھی ہوتا ہے جو طبلہ پر آہستہ آہستہ تھاپ پڑنے کا ؛ کہ صوتی اثر کے ساتھ ساتھ جذبات میں بھی تموج پیدا ہوتا جاتا ہے - ایک بار میرے دوست مجنوں نے خاندان مصحفی کے کئی شعرا کے اشعار مجھے سنائے - میں متحیر تھا کہ یہ سلاست ، یہ گھلا ملا ہوا انداز بیان نہ غالب کے یہاں ہے ، نہ میر کے یہاں ؛ نہ یہ آتش کے دھکتے ہوئے انگارے ہیں ، نہ امیر کے تکلف کے نمونے - پھر ان اشعار کا سلسلہ کہاں پہنچتا ہے - ہم دونوں نے اس وقت تو یہی فیصلہ کیا کہ شاگردان آتش نے زبان کی صفائی میں بڑا حصہ لیا - لیکن حقیقت یہ ہے کہ لکھنؤ اسکول میں زبان کی وہ خوبی جو تکلف و تصنع یا ضلع جگت اور ایہام سے پاک ہے ؛ اس کی داغ بیل مصحفی نے ڈالی تھی اور اسی راہ پر چل کر شاگردان آتش اور خود آتش نے لکھنؤ کی زبان کو پروان چڑھایا - ہاں لکھنؤ کی زبان میں جہاں جہاں اوچھاپن ہے اس کے لئے انشا ، ناسخ ، امانت یا جس کا بھی ہم چاہیں شکریہ ادا کریں - آتش اور ناسخ کا نام اس سلسلہ میں کئی بار آ چکا ہے ، لیکن ان دونوں کی شخصیتوں میں وہ زور ہے کہ وہ کسی کے شاگرد ہوتے ہوئے بھی صرف اتباع و تقلید کے ہو رہیں یہ ناممکن تھا -

آتش نے صرف مصحفی کے باغ کی آبیاری نہیں کی بلکہ اس نے اپنا آتش کدہ الگ تعمیر کیا۔ ناسخ کو جہاں تک شاگردی کا تعلق ہے مصحفی سے کوئی نسبت تھی یا نہیں، یہ امر صیغۂ راز میں ہے اور غالباً ہمیشہ رہے گا۔ صرف مصحفی کے تذکرے سے کچھ پتہ چلتا ہے کہ شاید کبھی کبھی شروع میں ناسخ نے بھی مصحفی سے مشورہ کیا تھا۔ بہر حال شاگردی برطرف، لیکن کیا مصحفی کا اثر براہ راست صرف اس کے شاگردوں تک محدود تھا؟ ناسخ کے یہ اشعار لیجیے :—

سب ہمارے لئے زنجیر لئے پھرتے ہیں
ہم سر زلف گرہ گیر لئے پھرتے ہیں
تیری صورت سے کسی کی نہیں صورت ملتی
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

یہ اشعار میر کے رنگ میں ہیں یا سودا کے، یا غالب کے یا خود ناسخ کے؟ کہا جاتا ہے کہ ایسے اشعار میں ناسخ پر آتش کا اثر پڑا ہے۔ لیکن خود آتش کے یہاں یہ کسی نے نہیں سوچا کہ دو طرح کے اشعار ہیں؛ ایک وہ جن میں آتش کی انفرادی گرما گرمی اور کڑک ہے، دوسرے وہ جن میں آتش نے مصحفی ہی کے رنگ کو چمکایا اور جن کے لہجے اور انداز میں مصحفی ہی کا اعتدال اور مصحفی ہی کی نرمی پائی جاتی ہے۔

ناسخ ہی کے خاندان میں جلال لکھنوی گزرے ہیں۔ ان کی یہ غزل لیجیے :—

وہ دل نصیب ہؤا جس کو داغ بھی نہ ملا
ملا وہ غم کدہ جس میں چراغ بھی نہ ملا
گئی تھی کہہ کے میں لاتی ہوں زلف یار کی بو
پھری تو باد صبا کا دماغ بھی نہ ملا
اسیر کرکے ہمیں کیوں رہا کیا صیاد
وہ ہم صفیر بھی چھوٹے وہ باغ بھی نہ ملا
بتوں کے عشق میں کیا ہوتی ہم سے یاد خدا
کہ دل بھی تھا نہ ٹھکانے فراغ بھی نہ ملا

خبر کی یار کو بھیجا تھا گم ہوئے ایسے
حواس رفتہ کا اب تک سراغ بھی نہ ملا
دکھائیں یار کو کیا جسم داغدار کی سیر
نظر فریب ہمیں ایک داغ بھی نہ ملا
بھر آئے محفل ساقی میں کیوں نہ آنکھ اپنی
وہ بے نصیب ہیں خالی ایاغ بھی نہ ملا
چراغ لے کے ارادہ تھا بخت کو ڈھونڈھیں
شب فراق تھی کوئی چراغ بھی نہ ملا
جلال باغ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم
چمن کو پھول ملے ہم کو داغ بھی نہ ملا

آپ نے دیکھا ! اس پوری غزل کے بارے میں اگر مقطع سے قطع نظر کر کے آپ سے کہا جائے کہ یہ سوا سو برس پہلے کی غزل ہے یا کچھ اس سے بھی پہلے کی ، اور پھر پوچھا جائے کہ یہ غزل کس کی ہے ، تو غور کرنے پر میر ، سودا یا ان کے ہم عصر شعرا میں آپ کسی کا نام نہ لیں گے ؛ میر اور نہ غالب ، مومن اور نہ ذوق کا ، نہ انشا اور جرأت کا، نہ ناسخ اور آتش کا ، نہ رشک کا نہ بحر کا ، نہ کسی اور کا ؛ صرف مصحفی کا نام زبان پر آئے گا ۔ جلال خاندان ناسخ کے شاعر تھے ، لیکن جو اشعار اور جو غزلیں آج ان کے نام کو مٹنے سے بچائے ہوئے ہیں وہ ناسخ کے رنگ میں نہیں ہیں بلکہ مصحفی کے رنگ میں ہیں مثلاً :—

داغ پر میرے پڑی مرغان گلشن کی جو آنکھ
سب نے منقاروں میں لے لیکر گل تر رکھ دیا

نگہ مست سے تیری وہ ٹپکتی ہے شراب
جو سبو میں نہیں، خم میں نہیں، ساغر میں نہیں

جس زمانے میں امیر و داغ کے بعد ہی جلال کا نام مشہور معاصرین میں لیا جاتا تھا ، اسی زمانہ میں کسی نے ایک شعر میں تینوں کی خصوصیتوں کو بیان کیا تھا :—

انصاف کا ہے قول کہ ہے داغ کی زبان
مضمون ہے امیر کا بندش جلال کی

مگر جلال سے پہلے یہ بندش کس کے یہاں تھی ؟ سوائے مصحفی کے اور ہم کسی کے یہاں نہیں پاتے - غالب کے یہاں بہت ترنم ہے ، لیکن وہ بہت تیز قسم کا ترنم ہے - مصحفی کا ترنم مدھم سرمیں ہے - اُس کا ٹھہراؤ اور بہاؤ اور اس کی نرم اور خفیف تھرتھری غالب کے ترنم سے مختلف ہے - غالب کے یہاں نغمہ ہے تو مصحفی کے یہاں ایک چیز ہے جسے تحت النغمہ (Sub-Lyricism) کہہ سکتے ہیں اور یہی نغمہ جلال کے رنگ تغزل میں پایا جاتا ہے -

مصحفی ہی سے لکھنؤ اسکول کے اس سلسلہ کا بھی آغاز ہوتا ہے جسے ہم ''قافیہ اور ردیف کو مختلف پہلوؤں سے باندھنا'' کہتے ہیں ....
اور اس طرح ردیف وقافیہ کے تمام امکانات ظاہر ہو جاتے ہیں - دلی کا لب و لہجہ چھوڑے بغیر مصحفی نے اسی ترکیب سے لکھنؤ اسکول کے لب و لحجہ میں تنوع پیدا کیا اور اسی چیز کو لے کر آتش بیک وقت دلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کے شاعر کہہ دیئے جاتے ہیں - بہر حال لکھنؤ کی زبان وضع کرنے میں مصحفی کا خاص حصہ ہے - مصنف شعرالہند کو بھی مصحفی کی اس خصوصیت نے اور اس کے اس اثر نے متوجہ کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ ''مصحفی ایک خاص بات میں تمام اساتذہ سے بڑھے ہوئے ہیں یعنی جو صفائی اور روانی اُن کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ میر ، سودا اور جرأت و انشا کسی میں نہیں پائی جاتی - چنانچہ مرزا لطف علی تذکرۂ گلشن ہند میں لکھتے ہیں ''اور گفتگو اس کی بہت صاف ہے بندش نظم میں اُس کے ایک صفائی و شیرینی اور بندش میں اس کے بلندی اور رنگینی ہے''-

یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں بھی جب اس خاندان کے لوگوں کو اسیر و امیر کے دامن میں پناہ نہیں ملتی تو زبان کے لحاظ سے اپنے ابوالآبا مصحفی ہی کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں - چنانچہ جلیل فرماتے ہیں :—

اس سخن کا جلیل کیا کہنا   مصحفی کی زبان ہے گویا

قدماء کے کلام میں جو شتر گربگی ، ناہمواری اور فحاشی پائی جاتی ہے ، باوجود پر گوئی کے بھی مصحفی کا کلام اس عیب سے بہت کم

آلودہ ہے ۔ مصنف شعر الہند سے یہاں تک تو میں بالکل متفق ہوں ۔ لیکن اس کے بعد ہی وہ جب یہ کہتے ہیں کہ مصحفی ''کسی خاص رنگ کے پابند نہیں'' اور جب وہ آزاد کی اس رائے کو صحیح بتاتے ہیں کہ مصحفی کی ''غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے ہیں کسی خاص طرز کی خصوصیت نہیں'' تو مجھے اس کے ماننے میں تامل ہوتا ہے ۔ کیونکہ تقلید و انتخابیت کے باوجود بھی مصحفی ، مصحفی رہتا ہے ۔ اس کے بہروپ میں بھی اس کا اصل روپ نظر آتا ہے ۔

رہا یہ سوال کہ مصحفی کو کس سے کم اور کس کے برابر سمجھا جائے ؟ اس سوال کا فیصلہ کرتے ہوئے کچھ تکلیف محسوس ہوتی ہے ۔ خود مصحفی کے زمانے میں تو مصحفی کو جگت استاد مانا جاتا تھا اور آج بھی اس کو جگت استاد ماننا پڑتا ہے ۔ سودا کا قایل ہوتے ہوئے بھی مصحفی نے سودا کو جیسا کچھ سمجھا ہے ، اس کا حوالہ میں مصحفی کی رباعی نقل کرکے دے چکا ہوں ۔ ایک اور مقطع میں کہتے ہیں :—

مصحفی ریختہ پہونچاؤ تم اس رتبہ کو
شوریاں گرد ہو مرزا کی بھی مرزائی کا

اب اس کا فیصلہ آپ کیجئے کہ مصحفی غزل میں اپنے کو سودا کے برابر مانتا تھا یا کم یا زیادہ ۔ میر کو تو اس نے اس رباعی میں سودا سے ٹکرانے کی کوشش کی ہے اور مصلحت اسی میں دیکھی کہ خود اپنا نام اس سلسلہ میں نہ لائے ۔

بہر حال مصحفی کو دوسرے شعرا سے جو نسبت حاصل ہے وہ ہم بتا چکے اور مصحفی کے انفرادی رنگ کو بھی واضح کر چکے ۔ مصحفی کے ہمہ گیر اثر کو بھی دیکھ چکے ۔ مصحفی نے اردو غزل کو جو چیز دی وہ ایک مزاج یا رنگ مزاج ہے ۔ اس نے ہمارے شاعرانہ کیف و اثر کو ایک ایسا پیمانہ دیا جو نہ بلا نوشوں کے لئے ہے نہ کم ظرفوں کے لئے ؛ اور جس کے نشہ کے چڑھاؤ اتار میں ایک ایسا ربط پیدا ہو جاتا ہے کہ خمار کے کرب سے یہ پیمانہ ہم کو بچا لیتا ہے ۔

مصحفی کے نغمے اب سے پونے دو سو برس پہلے ہندوستان کی فضا میں گونجے تھے ، پہلے دلی سے پھر لکھنؤ سے - انہی نغموں کی نرم آنچ آتش اور دیگر شاگردان مصحفی و آتش کی شعلہ نوائیاں بن گئیں - مصحفی کے نغموں کی پنکھڑیوں نے وہ داغ بیل ڈالی کہ ناسخ اور خاندان ناسخ تک کے شعرا نے ان سے پھول اور کلیاں چن کر اپنے دامن بھر لئے - انیس کے مرثیوں اور سلاموں اور رباعیوں میں زبان جس طرح سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے ، اُن کے مصرعوں کی نرم روی ، بیان کی رنگینی اور نکھار ، ہمیں مصحفی اور تنہا مصحفی کی یاد دلاتے ہیں - جب انیس کے خاندان کا ایک شاعر میان سے تلوار کھینچنے کا سماں یوں باندھتا ہے کہ ''کیچلی چھوڑ کر اُڑتی ہوئی ناگن نکلی''، تو ہمیں مصحفی ہی کی تشکیل بیان کی یہ ارتقائی صورت معلوم ہوتی ہے - شاد عظیم آبادی کے بہت سے اشعار اور متعدد غزلیں ، صوبہ بہار کے وہ شاعر وہاں کے مذاق سخن کے نمائندے کہے جا سکتے ہیں ، سب ہمیں اسی رنگ طبیعت ، اسی جمالیاتی مزاج کی یاد دلاتے ہیں جس کی پہلی رنگا رنگ جھلکیاں مصحفی نے دکھائی تھیں - امیر اور اُن کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد تو خاندان مصحفی سے متعلق ہیں اگرچہ کبھی زیادہ کبھی کم یہ لوگ ناسخ کی طرف جھک جاتے ہیں - لیکن جیسا جلال کے کلام کی مثالوں سے ہم دیکھ چکے ہیں ، جلال خاندان ناسخ سے وابستہ ہوتے ہوئے فیضان مصحفی سے بے نیاز نہیں - حالی کی غزلوں کی سادگی اور کہیں ان کی زبان کا البیلا پن ، ان کے کلام کی معصومیت اور اس کی نرم ٹیس میں بھی ، اور اس کی مخصوص روک تھام ، توازن ، میانہ روی اور نرم چال میں بھی ، کیا مصحفی کے انداز کی ترغیب و تحریک ہمیں نظر نہیں آتی ؟ جوش ملیح آبادی کی رنگینی اور لمسیّت (Sensuousness) کی اولین مثالیں مصحفی کے کلام ہی میں نظر آتی ہیں - حسرت موہانی کی غزلوں کی معتدل سرمستی اور نرم گھلاوٹ میں مصحفی ہی کی اسپرٹ کار گر ہے - اصغر کے نشاط روح میں جو روح نشاط ہے اور ان کے مصرعوں کے خرام سکوں نما میں ، فانی کے اکثر اشعار کی سجاوٹ میں وہی آواز بجتی اور سنورتی ، نکھرتی اور چمکتی نظر آ رہی ہے جسے ہم بوجھ سکیں تو وہ میر ، سودا ، انشا ، جرأت ، غالب ، مومن کسی کی آواز نہیں ہے بلکہ مصحفی کی آواز ہے - یہ اور بات کہ اس آواز کے کچھ سر اوروں کے یہاں بھی سنائی دے جاتے ہیں -

کیونکہ بالکل ان دیکھی ان سنی چیز کوئی نہیں ہوتی - مگر یہ مخصوص لے ہے مصحفی کی - یہ ضروری نہیں کہ میں نے جن شعرا کا نام ابھی گنایا ہے وہ اور جانے کتنے دوسرے شعرا شعوری طور پر اس فیض یابی سے واقف ہوں یا انہوں نے قصداً مصحفی کی تقلید کی ہو - مصحفی کے اثر کو جو اتنی وسعت ملی وہ اس کے نفوذ پذیری یا ہمہ سرایگی (Pervasive-ness) کی صفت کے باعث تھی - ہندوستان کی زمین نرمی ، پختگی ، اعتدال اور معصومیت ، ایک خاص سوندھاپن اور سلوناپن رکھتی ہے ؛ اور یہ تمام عناصر پہلے پہل کلام مصحفی کی شعریت میں نکھرے - مصحفی کے طرز سخن ہی میں نہیں اس کے طرز احساس و طرز تخئیل میں ایک مدرسہ‌ٔ شاعری بن جانے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے -

ہمارے ادبی کلچر کو جو مزاج مصحفی نے دیا وہ مزاج دوسرے صاحب طرز شعرا کے عطیوں سے بالکل الگ ہے - یہ مزاج کئی لطیف قدروں کا حامل ہے - اس مزاج کی لچک ، جھلک ، نرمی ، رنگینی ، اس کا ''سہج سبھاؤ''، اس کی رچی ہوئی سرمستی ، شدید انانیت یا عبصی المزاج سے اس کا آزاد ہونا ، اس کا امتزاج خارجیت و داخلیت ، زندگی کے رس اور جس کی لذت ، شیرینی اور تلخی کا باہم سمویا ہوا ہونا ، ٹیس اور راحت ، کسک اور سکون کا میل ، اس کا میٹھا میٹھا درد ، اس کی طبیعت کا رکھ رکھاؤ ، یہ وہ قدریں ہیں جن کا حامل مصحفی کا کلام ہے - سوچو تو ان قدروں میں بہت سے امکانات چھپے ہوئے ہیں - ان میں ارتقائی صفات ہیں - یہی گوناگوں امکانات ان تمام شعرا کے یہاں نمایاں ہوتے ہیں جو خواہ مصحفی کے خاندان سے ہوں یا نہ ہوں ، لیکن جو غیبی طور فیضان مصحفی سے بے نیاز نہیں رہے - کیونکہ ان میں کسی کا کلام مصحفی کے کلام کی محض آواز باز گشت نہیں ہے بلکہ خلاقانہ طور پر مصحفی کی آواز کو نئی آواز بنا دینا ہے - چراغ سے چراغ جلے ہیں لیکن ہر چراغ کی لو میں نئی تھر تھراہٹ ہے اور نیا اجالا -

یہ ہے مصحفی! مجھے اپنے ایک محبوب نو عمر دوست کا کہنا یاد آتا ہے کہ مصحفی کا تخلص جس صوتی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے ، اسی سانچے میں مصحفی کا وجدان ، مصحفی کا کلام ، اور مصحفی کے کلام کی جمالیاتی قدریں بھی ڈھلی ہوئی ہیں -

ذوقؔ

(۱)

جنہیں اُردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی ہے ، اگر اُن سے آج پوچھا جائے کہ سو برس پہلے دلی کے سب سے بڑے اردو شاعر کون تھے تو وہ کہیں گے کہ غالب مومن اور ذوق ۔ آج سے سو برس پہلے بھی یہی جواب ملتا اور یہی نام لئے جاتے ، مگر اس زمانے کے لوگ ناموں کی ترتیب بدل دیتے اور کہتے کہ ذوق ، مومن اور غالب ۔ اس ردو بدل کے اسباب کیا ہیں یہ سوال ذرا بحث طلب ہے اور اسے یہیں چھوڑیئے ۔ ہمیں تو ذوق کے مرتبہ شاعری اور اُن کے کلام کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا ہے ۔ ممکن ہے اس طرح ذوق کی شہرت کے نشیب و فراز کا راز کچھ کھل جائے ۔

ایک انسان اور نیز ایک شاعر کی حیثیت سے ذوق کی خوش نصیبی اور بدنصیبی دونوں حیرت انگیز ہیں ۔ وہ ایک غریب سپاہی زادہ تھے ۔ بچپن ہی سے مفلسی اور شاعری دونوں کا ساتھ رہا ۔ قسمت کی ستم ظریفی سے ابھی عمر ہی کیا تھی کہ شاعری میں شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے جو نہایت قادر الکلام ، نہایت جید لیکن نہایت پر مذاق شاعر تھے ۔ اُن کے رسوخ کا کیا کہنا ولی عہد سلطنت کے استاد تھے ، دنیا بھر کو چیلنج دے کر مشاعرے کرتے تھے اور ''قفس کی تیلیاں ، مگس کی تیلیاں'' سال بھر کے لئے طرح کر دیتے تھے ۔ یہ سب سہی مگر آدمی تھے پر لطف ، بوڑھوں میں بوڑھے بچوں میں بچے ، اور شاعری میں بیک وقت دونوں ۔ ان کی ایجاد کردہ کچھ رویفیں سنیے :— ''جبل کی مکھی'' ، ''سر پر طرہ ہار گلے میں'' ، ''ساون بھادوں'' ، ''فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں'' ۔

میر و سودا کے بعد اردو شاعری کی کیا گت بنی اس کا اندازہ شاہ نصیر کی شاعری سے ہو سکتا ہے۔ شمس العلماء محمد حسین آزاد شاہ نصیر کا تذکرہ لکھتے وقت تین احساسات کا شکار ہوئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی شاعری عجیب الخلقت ہے؛ دوسرے یہ کہ جو کچھ بھی ہو وہ ذوق کے اُستاد تھے؛ تیسرے یہ کہ ذوق شاہ نصیر کی شاعری سے نہیں بلکہ ان کے برتاؤ اور ان کی بے رخی سے بیزار ہو کر ان کی شاگردی سے الگ ہوئے۔ ایک چوتھا احساس بھی تھا وہ یہ کہ ذوق بڑی حد تک اُن کی شاگردی چھوڑنے کے بعد بھی شاہ نصیر ہی رنگ کو پسند کرتے تھے اور اُن کے حریف و مقابل ہو کر بھی اسی رنگ میں کہنا اور اسی رنگ کو چمکانا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ آزاد، شاہ نصیر کا ذکر کبھی مرعوب لہجہ میں کرتے ہیں کبھی تذبذب کے لہجہ میں، اور بیچ بیچ میں چٹکیاں لیتے جاتے ہیں اور چوٹیں کرتے جاتے ہیں۔ شاہ نصیر اور ذوق میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں ان میں فتح کا سہرا ذوق کے سر رہا۔ لیکن یہ فتح کن داموں نصیب ہوئی؟ میرے والد مرحوم حضرت عبرت گورکھپوری کا ایک شعر ہے:—

قاتل سے انتقام نہیں چاہتا مگر
میں جس کا صید ہوں وہی میرا شکار ہے

یعنی جن شاہ نصیر پر ذوق فتح حاصل کرنا چاہتے تھے انہی کے رنگ کے شکار ہو گئے۔ بعد کو ضرور بچ نکلے۔ شاعری کے ساتھ کھیلنا خطرے سے خالی نہیں۔ ذوق نے شہرت تو وہ پائی کہ آسمان کو رشک آ جائے لیکن ایک بڑی حد تک حقیقی شاعری سے محروم رہ کر۔

ابھی تقدیر اور گل کھلانے والی تھی۔ شاہ نصیر نے کافی عرصہ کے لئے دلی چھوڑی۔ ادھر ذوق کو ولیعہد سلطنت نے اپنا اُستاد بنا لیا۔ مگر اسے خوش قسمتی کہیئے یا بد قسمتی کہ ولیعہد کی حالت خود نازک تھی۔ شاہی خاندان خانہ جنگیوں کا شکار ہو رہا تھا۔ بادشاہ ولیعہد سے منحرف تھے۔ ولیعہد کو بجائے ۵ ہزار مہینہ کے صرف ۵ سو مہینہ ملتا تھا۔ بہر حال ذوق کو چار روپیہ

مہینہ ملنے لگا - جب ولیعہد بادشاہ ہوئے تو یہ تنخواہ چار سے پانچ اور پانچ سے چھ اور ایک مدت دراز کے بعد تیس روپیہ مہینہ پر جا کر ختم ہو گئی - یوں تو ذوق کو ملک الشعراء خاقانی ہند اور استاد شہنشاہ کا لقب ملا - قست نے کیا نہیں دیا اور کیا دیا ؟ بقول غالب :—

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبئ تقدیر بھی تھا

اس استادی اور شاگردی نے ذوق کی زندگی کے ساتھ تو یہ کیا اور ذوق کی شاعری کے ساتھ کیا کیا ؟ آزاد لکھتے ہیں کہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا - بات میں بات نکالتا تھا مگر اسے سمیٹ نہ سکتا تھا - مجبوراً ذوق کو سنبھالنا پڑتا تھا - وہ اپنی غزل بادشاہ کو سناتے نہ تھے ، اگر کسی طرح اس تک پہونچ جاتی تو وہ اسی غزل پر خود غزل کہتا تھا - اب اگر نئی غزل کہہ کر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا ، ۷۰ برس کا سخن فہم تھا ، خوب سمجھتا تھا - اور اگر اس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی آسان نہ تھا ؛ ناچار اپنی غزل میں ان کا تخلص ڈال کر دے دیتے تھے - بادشاہ کو بڑا خیال تھا کہ وہ اپنی کسی چیز پر زور طبع نہ صرف کریں - جب ان کے شوق طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تانتا باندھ دیتا کہ جو کچھ جوش طبع ہو ادھر ہی صرف ہو - آزاد نے ذوق کے حالات میں کئی جگہ لکھا ہے کہ بادشاہ صرف اپنا کہا ہوا ذوق کو نہیں دکھاتا تھا بلکہ سیکڑوں طریقہ سے غزل ، نظمیں ، ٹھمری ، دوھرے اور گیتوں کی فرمائش کرتا تھا اور یہ سب فرمائشیں بہت کم وقت اور مقررہ وقت کے اندر اور کبھی کبھی تو چند گھنٹوں کے اندر ذوق کو پوری کرنی پڑتی تھیں -

آزاد کے جادو نگار قلم نے اس بارہ میں جس انداز سے لکھا ہے اسے پڑھ کر اس احساس سے دل خون ہو جاتا ہے کہ بادشاہ کی شاگردی نے ذوق کے لئے شاعری ایسی لطیف اور نازک چیز کو ایک بیگار بنا دیا - ظفر کا ضخیم دیوان کل کا کل ذوق کا کہا ہوا

تو ہے نہیں - ظفر کے کلام میں خلوص جذبات ، شاعرانہ احساس ، سوز و گداز اور دل میں چٹکیاں لینے والی اداسی اور اک درماندگی کا کیف اور کئی جگہ موسیقیت کا جو عنصر ملتا ہے وہ کل کی کل ذوق کی دین ، نہیں ہے ، اصلاح ذوق کی ضرور ہے - لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ دم لینے کی فرصت نہ ہوتے ہوئے بھی اور ذوق کا بہت سا کلام ضائع ہو جانے کے بعد بھی ذوق کا جو دیوان ملتا ہے وہ غالب کے دیوان سے کچھ زیادہ ہی ضخیم ہے - وہ دیوان ہمارے سامنے ہے - سوال یہ ہے کہ اگر ذوق اپنے وقت کے مالک ہوتے اور بادشاہ کی اصلاح اور اس کی فرمائیشوں سے وہ آزاد بھی رہتے اگر ان کی یہ تمنا بھی بر آتی کہ :-

دل چاھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

تو مقدار اور صنعت سے قطع نظر کرکے جہاں تک نفس شاعری اور ذوق کے مخصوص رنگ کلام کا تعلق ہے ، کیا ذوق اپنے موجودہ کلام سے کوئی مختلف اور لطیف تر چیز پیش کرتے ؟ آپ ناسخ کے دیوان کو لے لیجیے ، اس کی چند غزلوں میں بھی شاعری کا وہی نمونہ اور وہی معیار ملتا ہے جو پورے دیوان میں نظر آتا ہے - شاعر نے کتنا کہا یہ سرے سے ایک غیر ضروری سوال ہے - اگر ضخامت اور مقدار کے لحاظ سے ذوق کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے تو ماننا پڑتا ہے کہ بادشاہ اور ایسے دھؤاں دھار کہنے والے بادشاہ کا استاد ہونا بڑی غیر شاعرانہ بات تھی - آپ کہیں گے کہ اس رسوخ کی تمنا تو غالب کو بھی تھی - لیکن یہ نہ بھولیے کہ غالب نہایت چالاک شاعر تھا - کسی بادشاہ کا استاد ہو کر بھی غالب اپنا کلام مٹنے نہ دیتا ، غالب غالب ہی رہتا - نواب رام پور جو ناظم تخلص کرتے تھے غالب کے شاگرد تھے - ان کا ایک شعر غالب نے یوں بنا دیا :-

ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں
اور پھر ہم نے اسے بزم میں چلتے دیکھا

لیکن خود غالب نے ساقی اور جام پر اپنے یہاں جیسے شعر کہے ہیں وہ سب کو معلوم ہیں -

بہر حال ذوق کا جو دیوان موجود ہے اس سے ذوق کے کلام کی قدر و قیمت ضرور معلوم ہو سکتی ہے ۔ دیکھیے خود آزاد اس کلام کے بارے میں کیا کہتے ہیں :-

''جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا ، جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی ۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا تو آب حیات اس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کملاہٹ کا اثر نہ پہونچے ۔ کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اتارے ہیں ۔ ملک الشعرائی کا سکہ اس کے نام سے موزوں ہوا اور اس پر یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم آردو کا خاتمہ کیا گیا'' ۔

اس دلفریب اور سامعہ نواز نثر کا کیا کہنا ! لیکن اس شدت کی گلفشانی کرتا ہوا بھی آزاد کا رنگین نگار قلم شاعری کی خصوصیات کے ذکر سے کترا کر نکل گیا ۔ یوں تو ''ساقی نے التفات کے دریا بہا دیئے'' لیکن تغزل ، ترنم ، خلوص جذبات ، شدت احساس ، اسرار و معانی ، حسن و عشق ، کائنات کا محاکاتی پہلو ، شاعرانہ مصوری یا ترجمانی ، استعجاب ، حیرت ، انفعال ، سوز و گداز ، دقت نظر ، دل کی چوٹ ، روحانی عناصر ، کیف و اثر ، فطری مگر خلاقانہ انداز بیان ، یا اور کوئی صفت جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ شاعری جز و یست از پیغمبری ، ان میں سے کسی چیز کا ذکر آزاد نے تعریف کی بھر مار کرتے ہوئے بھی کیا ؟ لارڈ مکالے کی طرح آزاد بھی اپنے انداز بیان کا بادشاہ ہے ، جو اثر چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے ، مگر کھلی ڈھلی غلط بیانی سے اپنے کو بچالیتا ہے ۔ آزاد نے کیا یہ ہے کہ ذوق کی شاعری پر اپنے خاص انداز سے ایک جگمگاتا ہوا پردہ ڈال دیا ہے ۔ لیکن وقت کے ہاتھوں ہر پردہ اٹھ جاتا ہے اور اسی سے سمجھ لیجیے کہ آج ذوق کا نام غالب اور مومن کے بعد کیوں آتا ہے ۔ جو انفرادی رنگ اور جو اصلیت کا جوہر غالب اور مومن کے یہاں ہے وہ ذوق کے یہاں اس انداز میں نہیں ۔ وہ زمانہ سہل پسندی کا تھا اور اسی سے ذوق بازی مار لے گئے اور اسی

کمی کے احساس سے بے چین ہو کر آزاد ظفر کے کلام پر حریصانہ نظر ڈالتے ہیں -

اب دیکھیے کہ ذوق کے جو اشعار آزاد نے نہایت دلفریب تمہیدوں کے ساتھ پیش کئے ہیں وہ یہ ہیں :-

پاک کر اپنا دھاں ذکر خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہوئے پست قامت ہو تو ہو

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

ماتھے پہ ترے جھمکے ہے جھومر کا بڑا چاند
لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایمایہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

شوق ہے اس کو بھی طرز نالہ عشاق سے
دمبدم چھوڑے ہے منہ سے دود قلیاں چھوڑ کر

دریائے عشق میں دم تحریر حال دل
کشتی کی طرح میرا قلمدان بہ گیا

سنا آپ نے ! قلمدان بہ گیا ! اچھا ہوا - ان اشعار میں حقیقی شاعری کی فضائیں اور صدائیں کہاں ، یوں تو استاد کے شعر ہیں ، خوش خیال اور خوش ترکیبی سے خالی نہیں ہو سکتے -

لیکن ذوق کا بیدرد سے بیدرد نقاد بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ذوق کی تقریباً سو غزلیں ، کچھ قصیدے اور طبع آزمائی کے

دوسرے نمونے شاعرانہ خوبیوں اور لطافتوں سے خالی نہیں ہیں - یہ اشعار بھی سنیے :—

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اسکی فروتنی ہے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ہے

ذوق کے ایک شعر کو میں نے یوں سنا ہے :—

چارہ گروں سے ہو گئی غفلت ہاتھ سے نشتر چھوٹ گیا
جسم سراپا زخم جگر تھا ٹانکا ٹانکا ٹوٹ گیا

اُستادانہ بندش ، لطف زبان اور محاورات کے برجستہ استعمال کے نمونے دیکھیے :—

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ
جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

بل بے کمر کہ زلف مسلسل کے پیچ میں
کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

اس نے جب مال بہت ردو بدل میں مارا
میں نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

ان اشعار پر تو وہ لوگ بھی کچھ چونک پڑیں گے جو ذوق کو شاعر نہیں مانتے - ایسے یا قریب ایسے پچاسوں اشعار ذوق کے دیوان میں ملیں گے - عام طور پر ذوق کی غزلیں کیسی ہیں؟ ان میں جا بجا جذباتی اور داخلی پہلو کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے اور ان کا کلام صحرائے بے آب و گیاہ کی طرح بالکل خشک اور بنجر نہیں - اس میں شک نہیں کہ کلام کا زیادہ حصہ خارجی اور مصنوعی قسم کی شاعری کا نمونہ ہے - لیکن اس رنگ کو بھی ذوق نے اپنی مشاقی ، قادر الکلامی اور استادانہ انداز سے سجا دیا ہے - بیان میں ایک پختگی ، ایک شستگی اور استادانہ شان ملتی ہے - غالب اور مومن کے کلام کی سی معنویت و داخلیت (Inwardness) نہ سہی لیکن ناسخ کے کلام کی طرح ذوق کے اشعار ریگ رواں بھی نہیں ہیں - وہ ناسخ سے متاثر ضرور تھے لیکن وہ دلی کے شاعر تھے - اس لئے غالب ، مومن اور اپنے شاگرد ظفر کے یہاں پر خلوص رنگ کی شاعری دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے - ظفر کے ذکر سے آپ چونکیں نہیں - اردو شاعری کی تاریخ اور روایتوں میں جو فائدے استادوں نے شاگردوں سے اٹھائے ہیں وہ ہمیشہ صیغۂ راز میں رہے ہیں ، اور ظفر کوئی معمولی شاگرد نہیں تھا - وہ ذوق کی شاعری اور شاعرانہ ذہنیت کی فضا بن گیا تھا - رہے غالب اور ذوق ، سو یہ کہنا تو بے سروپاسی بات ہے کہ ذوق کی زبان غالب سے اچھی ہے - ٹھیٹھ اردو ، ٹکسالی اردو ، بول چال کی نرم شستہ اور فصیح اردو ، رچی رچائی اردو میں بھی ، غالب کا مقابلہ ذوق نہیں کر سکتے - غالب اردو معلے کا بادشاہ ہے ، کہ آج اس کے اشعار سکۂ رائج کی طرح دنیا کی زبان پر چڑھ گئے ہیں - غالب کے خطوط کو بھی نہ بھولیے جس میں اس نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا - پھر بھی ذوق کی زبان کی شیرینی اور حلاوت میر کو چھوڑ کر کسی اور کے یہاں نہیں ملتی ؛ اور یوں تو ذوق اور میر میں بعد المشرقین ہے - آج اگر غالب کی زبان نرم ہو کر حالی کی زبان بن گئی ہے ، اور مومن کی زبان حسرت موہانی کی زبان بن گئی ہے، تو ذوق کی زبان بھی دو آتشہ ہو کر داغ کی زبان بن گئی - رہے ذوق کے

قصیدے تو خاقانی ، انوری اور قاآنی کی تو اور بات ہے ، لیکن اگر سودا آسمان قصیدہ کے آفتاب نصف النہار ہیں تو ذوق اسی آسمان کے ماہ کامل ہیں - لیکن اگر ذوق نے ہزار ڈیڑھ ہزار اشعار کی بھی اردو میں کوئی مثنوی لکھی ہوتی تو وہ ایک خاصے کی چیز ہوتی - اس غیر تصنیف شدہ مثنوی کے محاسن کا خیال کرکے ایک خلا کا احساس ہوتا ہے - کئی اچھے غزل گو شاعروں میں ذوق کے برابر مثنوی نگاری کی صلاحیت غالباً نہیں تھی - لیکن کون جانے ؟*

---

*محمد حسین آزاد نے ذوق کی ایک غالباً نامکمل تلف شدہ مثنوی کا ذکر کیا ہے -

فراق

(۲)

سات برس بعد

مندرجہ بالا مضمون آل انڈیا ریڈیو دلی سے ۱۹۳۷ء میں ذوق ڈے پر نشر ہوا تھا - یہ ۱۹۴۴ء ہے ، سات برس بیت گئے - میرا خیال تھا کہ اس کتاب میں اس مضمون کو بغیر اسے زیادہ ہاتھ لگائے داخل کردوں گا - مگر جب اتنے دنوں بعد اپنا مضمون پڑھا تو اسے جتنا دلچسپ پایا اتنا ہی تشنہ بھی - میں نے محسوس کیا کہ اس مضمون کی ہر بات اگرچہ اپنی جگہ ایک بات ضرور ہے لیکن ذوق کے کلام کے خط و خال صاف نمایاں نہیں ہوئے - مجھے بچپن ہی سے نہ جانے کیوں ذوق کا کلام نا پسند تھا - نہ جانے کیوں اس لئے میں نے کہا کہ ناپسندیدگی کا احساس پہلے ہوا اور ناپسندیدگی کے اسباب کا احساس سن شعور کو پہونچنے کے کچھ بعد ہوا - میں دیکھتا تھا کہ میرے ہم عمر و ہم جماعت غالب کے نہیں بلکہ ذوق کے اشعار دہرایا کرتے تھے ، میں تنہا غالب کے اشعار اکثر گنگنایا کرتا تھا - مجھے بچپن ہی سے نیم شعوری طور پر اس کا احساس ہوتا تھا کہ غالب کے اشعار میں موسیقیت ہے اور تاثیر بھی - کھلے ڈھلے اشعار ، خاص کر اخلاقی مضامین کے رسمی اشعار مجھے بچپن ہی سے ناپسند تھے - اخلاق کو کہاوت یا ضرب المثل کی شکل میں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اخلاق کی توہین ہو رہی ہے - مجھے اسی سے ہندی کے اخلاقی دوہے بھی اچھے نہیں لگتے تھے - مگر میرے ہم عمر لڑکے تھے اور معلم صاحبان تھے کہ لہک لہک کر ذوق کے اشعار سنایا کرتے تھے -

جب میں جوان ہوا تو اپنے دوست مجنوں کو دیکھا کہ بعض اوقات وہ لگا تار ذوق کے کئی اشعار سنا جاتے تھے - مجھے یہ اشعار اب بھی اچھے نہیں لگتے تھے - اور حضرات بھی ذوق کے اشعار

سنا دیا کرتے تھے - یہ سب اہل نظر تھے، لیکن میں سنی ان سنی ایک کر دیتا تھا - رفتہ رفتہ جب میری طبیعت ، میرا وجدان ، میرا احساس شعری اور خود میری شاعری ان سب کو جیسا بننا بگڑنا تھا بن بگڑ چکے ، تب مجھ میں ایک روا داری پیدا ہو گئی - ایک بار اتفاقیہ طور پر میرے کرم فرما سید اعجاز حسین صاحب لکچرار شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے منہ سے یہ فقرہ دوران گفتگو میں نکل گیا کہ ذوق کی زبان بہت شیریں ہے - اس وقت مجھ میں خود اعتمادی آچلی تھی اور اپنے مذاق و وجدان سے مختلف چیزوں کے محاسن پر میری آنکھ جم سکتی تھی - چنانچہ ذوق کی کچھ قدردانی بھی آہستہ آہستہ مجھ میں پیدا ہونے لگی - میرا مزاج خود ایسا بنا ہوا تھا کہ داغ کے اشعار ، جن کے سننے سنانے کا کچھ دنوں پہلے فیشن تھا ، مجھ پر ایک نا خوشگوار اثر ڈالتے تھے - معلوم ہوتا تھا کہ شاعری کی نرم روح کو داغ کی برجستگی اور شوخی سے ، ان کی چاق چوبند زبان سے چوٹ پہنچ رہی ہے - اس کے علاوہ جو ڈھیلا پن اور بے کیفی کہیں کہیں ذوق کے یہاں ہے وہی داغ کے بہت سے اشعار میں بھی موجود ہے - بلکہ ذوق کے اخلاقی اشعار شعریت کی کمی کی وجہ سے اتنے بے کیف و بے مزہ نہیں ہوتے جتنے داغ کے بہت سے عشقیہ اشعار - عشقیہ اشعار میں نثرئیت دیکھ کر بہت غصہ آتا ہے خاص کر جب ان میں شوخی و بزلہ سنجی بھی نہ ہو - میں ذوق اور داغ کے متعلق اپنے رد عمل پر اب بھی نادم نہیں ہوں - ان دونوں کے لب و لہجہ میں محاسن ہیں ، لیکن گو دماغ انہیں پہچانتا ہے ، وہ دل کو نہیں لگتے - مگر ادب میں ہمیں ترجیح کا تو حق ہے اخراج کا حق نہیں ہے - پھر میں نے یہ بھی سوچا اور مثالیں بھی نظروں کے سامنے پیش ہو گئیں کہ ذوق نے جس طرح اردو شاعری کو نرمایا اور اس میں کبھی لچ اور کبھی لچک پیدا کی ، اس میں شعریت کا رس اور جس نہ سہی یا کم سہی ، لیکن ہماری زبان کے جن ٹکڑوں کو وہ باندھ گیا ہے اور جس طرح باندھ گیا ہے ، انہیں ٹکڑوں کو اور اسی طرح کے ہزار ہا ٹکڑوں کو ترنم ، نشتریت اور شعریت کے ساتھ اور ذوق سے کہیں زیادہ نرمی کے ساتھ نئی لچکنوں ، نئی تھر تھراہٹوں کے ساتھ بعد کی اردو شاعری میں ہم بندھا ہوا دیکھتے ہیں - ذوق کے کارنامہ کے نجی محاسن بھی اور ان کے پھیلے ہوئے اثرات بھی ، یہ محاسن اپنے چولے میں بھی اور

بدلے ہوئے چولوں میں بھی اس قابل ہیں کہ انصاف سے ان کی داد دی جائے۔

آزاد جن الفاظ میں ذوق کی شاعری کو سراہتے ہیں انہیں اب مبالغہ سمجھا جانے لگا ہے۔ وہ مبالغہ سہی لیکن نیم شعوری طور پر آزاد کو کلام ذوق کے مخصوص محاسن ، مخصوص خدوخال ، اس کے نکھ سکھ کا احساس ضرور تھا۔ علاوہ ذوق سے ذاتی خصوصیت کے یہی وہ احساس ہے جو انہیں غالب پر بہتیری چوٹیں کر جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس وقت بھی جب مجھے ذوق کی شاعری ایک ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی ، کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاں تک ذوق کو سراہنے کا معاملہ ہے آزاد سراسر جھوٹ تو کیا بولتے ہوں گے۔ ذوق کی غزلوں کا میں نے اب جو مطالعہ کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آزاد کے ''جھوٹ'' اور ''مبالغہ'' میں بھی ایک سچائی ضرور ہے۔ آزاد کسی ایسے ویسے کی تعریف نہیں کر رہے ہیں ، وہ ایک ایسے استاد فن کا گن گار ہے ہیں جو ہماری شاعری کی زبان کے لیے وہ کچھ کر گیا جو سب سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ذوق کا کلمہ پڑھنے والے صاحب آب حیات آزاد کے لیے نہیں بلکہ آزاد انصاری شاگرد حالی کے لیے جوش ملیح آبادی کہتے ہیں ، ''آپ کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ الفاظ کی ترتیب اور نشست ایسی ہوتی ہے کہ اکثر و بیشتر اس کی نثر نہیں کی جاسکتی۔ کہنے اور سننے میں تو یہ بات شاید زیادہ مشکل معلوم نہ ہو ، مگر اس کے برتنے میں جو ہفتخواں طے کرنا ہوتے ہیں ان کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے''۔ لیکن اس بیل کو پہلے پہل ذوق ہی نے منڈھے چڑھایا تھا ، اس کام کو پہلے ذوق ہی نے سنوارا تھا۔ ذوق ہی کی بدولت ذوق کے زمانے میں اور ان کے بعد بہت سے کہنے والوں نے الفاظ کی ترتیب اور نشست یوں رکھنا سیکھا کہ مصرعے کی نثر نہ ہو سکے اور غزل میں نثر موزوں کا لطف پیدا ہو جائے۔

لیکن سلاست و روانی محض سطحی صفات ہیں۔ ذوق سو فیصدی صرف سطحی شاعر نہیں ہے۔ وہ پنچائتی اور روائتی خیالات کو جس طرح مکمل بناتا ہے اس میں کافی سوجھ بوجھ اور غور و فکر کی ضرورت ہے۔ یوں تو ہر وہ خیال جس کا ایک اظہار کرے اور

جسے دوسرا مانے یا پسند کرے پنچائتی خیال ضرور ہے ، روائتی نہ سہی - انفرادیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سماج جس احساس اور خیال کو اپنا ہی نہیں سکتا وہ احساس و خیال کوئی ظاہر کرے - سماج کے دل و دماغ پر کچھ خیالات و معتقدات تیرتے رہتے ہیں انہی کو عموماً ہم پنچائتی چیزیں کہتے ہیں - ہاں تو ذوق کے یہاں جس چیز کی کمی ہے وہ شاعرانہ انداز احساس ہے ، اور یہی کمی ذوق کے انداز بیان کو ، اس کے دوسرے محاسن کے باوجود شعرئیت سے محروم رکھتی ہے - زبان و خیال میں یا پنچائتی آواز میں اگر ایک مخصوص چٹیلا پن اور تھر تھراہٹ پیدا ہو جائے تو اس وقت شاعری میں انفرادیت آ جاتی ہے - جو کچھ اور جیسا کچھ ذوق نے کہا ہے وہ بے عیب ہے ، مکمل ہے ، استادانہ ہے ، کئی ادبی خوبیوں کا حامل ہے ؛ لیکن شاعری خاص کر غزل کی شاعری میں ہم کچھ اور چیزیں بھی پانے کی اُمید رکھتے ہیں اور وہی چیزیں ہم ذوق کی غزلوں میں نہیں پاتے یا بہت کم پاتے ہیں - زندہ شاعروں میں ہم نمایاں طور پر یہی بات استاد آرزو کے یہاں پاتے ہیں - جس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذوق اور آرزو کا رنگ کلام یکساں ہے ، بلکہ یہ مطلب ہے کہ ذوق کی طرح آرزو بھی بات بہت رچا کر کہتے ہیں لیکن اپنی آواز میں شاعری کی روح نہیں پھونک پاتے - پھر بھی ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ شاعری کی روح جو کچھ بھی ہو یا بہت کچھ بھی ہو ، شاعری ایک فن یا آرٹ ہے - آرٹ کے معنی ہیں کسی چیز کو بنانا یا کچھ کرنا - فن کے لحاظ سے ذوق کا کارنامہ بھلایا جا ہی نہیں سکتا - اس کارنامے کی خود اپنی ایک حیثیت ہے اور اس کی تاریخی اہمیت بھی غیر معمولی ہے -

ذوق کے یہاں وہ کئی چیزیں نہ پا کر جو ہمیں محبوب و مرغوب ہیں ہمیں بے صبری سے ذوق کا دیوان الگ نہیں پھینک دینا چاہیئے - اگر ہم نے ذرا تامل و رواداری سے کام لیا تو اپنا الگ مذاق رکھتے ہوئے بھی ذوق کے مذاق سخن سے ہم لطف اندوز ہو سکیں گے - اب مندرجہ ذیل اشعار کو ذرا ٹھہر ٹھہر کے پڑھیے اور ان کے مخصوص محاسن پر نظر ڈالے جائیے - غالب اور مومن دونوں نے مختلف زاویوں اور مختلف سمتوں اور اندازوں سے بعد کی اردو شاعری کو متاثر کیا - اور ذوق نے ؟ کیا اور بہت کچھ متاثر کیا -

اس سلسلے میں ذوق کے اشعار درج کرنے سے پہلے اور بعد ، میں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اپنے ہمعصروں اور بعد کے آنے والوں کو ذوق نے جان اور انجان طریقوں سے نمایاں طور پر متاثر کیا ۔ رسالہ ''آجکل'' دلی نے حال میں کلام عارف (وہی عارف جس کا مرثیہ غالب نے کہا ہے) پر ایک مضمون شائع کیا ہے اور عارف کے بہت سے اشعار کا اقتباس بھی دیا ہے ۔ اگر عارف اور اس زمانے کے کئی اور شعرا کا کلام ہمیں دستیاب ہوتا تو ہم دیکھتے کہ اسلوب ذوق کی صلاحیتوں اور محاسن نے ، جہاں تک زبان اور طرز بیان کا تعلق ہے ، جو وسیع اور ہمہ گیر اثر شعرا اور شاعری پر ڈالا اس کی حیثیت غالب و مومن کے اثرات سے جدا گانہ سہی لیکن ہے وہ قابل قدر ۔

اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا
دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا

دوسرے مصرعے میں بول چال کی زبان کو ذوق نے کس طرح سانچے میں ڈھال دیا ہے ۔ یہی صفت مومن و غالب سے ذوق کو الگ کرتی ہے ۔ کھلاوٹ اور خود گداختگی اس شعر میں نہ سہی لیکن بیان کی صفائی میں استادانہ شان ہے ۔

اسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
جس انساں کو سگ دنیا نہ پایا
فرشتہ اس کا ہم پایا نہ پایا
مقدر ہی سے گر سود و زیاں ہے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا
لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام
خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا
فلک کے گنبد بے در سے ہم تو
نکل جاتے مگر رستا نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا
کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
کیا ہم نے سلام اے عشق تجھ کو
کہ اپنا حوصلہ اتنا نہ پایا

نہ مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل
ستم میں بھی تجھے پورا نہ پایا
نظیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

یہ اسلوب بیان نہ مومن کا ہے نہ غالب کا۔ یہ اسلوب بیان سو فی صدی اُردو ہے۔ کم سے کم فارسی الفاظ آئے ہیں، اضافتیں اور بھی کم ہیں اور یہ سب ٹھیٹھ اُردو کے سانچے میں بے تکلف ڈھل گئی ہیں۔ قافیے بھی ذوق کی اردوئیت کی طرف اشارے کر رہے ہیں۔ اخلاقی مضامین، پنچائتی روائتوں، مسلمہ کلیوں سے ذوق کی رغبت ان اشعار سے نمایاں ہے۔ انفرادی جذبات ذوق کے یہاں نہ ڈھونڈھیے۔

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا
تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا
آنے سے مرے ٹھہر گئے آپ و گرنہ
جانے کا ارادہ تو کہیں ہو ہی چکا تھا
کیا دیکھتے ہم یوسف کنعاں کو کہ اپنا
منظور نظر ایک حسیں ہو ہی چکا تھا
برہم اُسے کیوں تو نے کیا چھیڑ کے پھر زلف
اے دل وہ ابھی چیں بہ جبیں ہو ہی چکا تھا

ردیف قابل توجہ ہے۔ مطلع کے دوسرے مصرعے میں ''نہیں ہو ہی چکا تھا'' کے ٹکڑے میں خالص اردو کا بے تکلف نکھار، بے لاگ انداز بیان دیکھنے کی چیز ہے۔ تیسرے شعر کے دوسرے مصرع میں ''ایک'' کا لفظ بہت بلیغ ہے۔

گل ہؤا، مل ہؤا، میں ذوق کی غزل کے یہ دو شعر سنیے:—

پروانہ بھی تھا گرم تپش پر کھلا نہ راز
بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہؤا
بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی
جز و ضعیف محرم اسرار کل ہؤا

فارسی کافی آئی ہے لیکن اس نرمی سے کہ معلوم نہیں ہوتا۔

موت نے کر دیا ناچار و گر نہ انسان
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا
آپ آئینہ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا
سینۂہ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

عام باتیں ، عام رائیں ، روایتی خیالات ہیں مگر کس ہلکے پھلکے انداز سے نظم ہو گئے ہیں -

جو نہ رنگ رنج و ماتم کا یہاں نمود ہوتا
تو زمیں نہ زرد ہوتی نہ فلک کبود ہوتا
یہ حیات چند روزہ جو نہ سد راہ ہوتی
تو پھر ایک عرصہ گاہ عدم و وجود ہوتا

قدرے مشکل مضامین کو بھی کس سہل اور صاف طریقے سے باندھ دیا ہے -

نیمچہ یار نے جس وقت بغل میں مارا
جو چڑھا منہ آسے میدان اجل میں مارا
اس نے جب مال بہت ردو بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا آٹھا اپنی بغل میں مارا
اجل آئی نہ شب ہجر میں اور تو نے فلک
بے اجل ہم کو تمنائے اجل میں مارا
دل کو اس کا کل پیچاں سے نہ بل کرنا تھا
یہ سیہ بخت گیا اپنے ہی بل میں مارا
اس لب و چشم پہ ہے زندگی و موت اپنی
کہ کبھی دم میں جلایا کبھی پل میں مارا
نہ ہؤا پر نہ ہؤا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

پہلا شعر بہت کمزور ہے - یہ مطلع بالکل برائے بیت ہے - دوسرے شعر کا کیا کہنا ! شعریت نہ ہوتے ہوئے بھی دوسرا مطلع

اس طرح سانچے میں ڈھلا ہوا ہے کہ منہ سے بے اختیار واہ نکل جاتی ہے ۔ تیسرا شعر بھی بہت سست ہے لیکن دوسرے مصرعے میں بیان کی صفائی سے کون انکار کر سکتا ہے ۔ چوتھے شعر میں بھی محاورہ اور بول چال کے الفاظ پر ذوق کس طرح جان دیتے تھے صاف نمایاں ہے ۔ پانچویں شعر میں دم اور بل کے الفاظ بھی خوشگوار روزمرہ کی مثال ہیں ۔ مقطع میں غزل کے قافیے نے جھک مار کے میر کی تعریف ذوق سے کرائی ہے ۔ یہ بولتا ہوا شعر اپنی برجستگی کے باوجود میر کی تعریف میں مجھے ہمیشہ کچھ غیر آسودہ حالت میں چھوڑ دیتا ہے ۔ پوری غزل مصحفی کی یاد دلاتی ہے ۔

جینا ہمیں اصلاً نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا

مذکور تری نرم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے
جب تک نہیں آتا اُسے غصہ نہیں آتا

پہلا شعر صاف ستھرا اور رواں دواں ضرور ہے ، اس شعر میں جو روانی ہے یا جو اس کی کامیابی ہے وہی اُسے شعریت سے معرا کر رہی ہے ۔ کہیں ایسی حالت میں ایسی رواں دواں بات منہ سے نکل سکتی ہے ؟ دوسرے شعر میں چونکہ بہت تکلیف دہ جذبہ یا احساس کا ذکر نہیں ہے زبان کی روانی و برجستگی اور اُردو کی بہار مزہ دے رہی ہے ، تیسرے شعر کا دوسرا مصرع بہت اُستادانہ ہے ۔ داغ اسی انداز بیان کو چمکائیں گے ۔

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہہ گیا

ہے موج بحر عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ
بیچارہ مشت خاک تھا انسان بہہ گیا

تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان بہہ گیا

بڑی مشکل ردیف تھی - ذوق نے اپنی چابکدستی سے اس زمین میں بہت صاف اور بے تکلف اشعار موزوں کئے ھیں - تیسرے شعر میں محاورے کا استعمال بہت بے لاگ ھے - جب کوئی موقع ھاتھ سے جاتا رھتا یا کسی کام کا وقت گذر جاتا تو کہتے تھے کہ اب وہ پانی ملتان بہ گیا یعنی اب وہ بات جاتی رھی -

---

ھے قفس سے شوراک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ھے ان دنوں صیاد کا

میں ھوں چکر میں ، لگی جس دن سے دنیا کی ھوا
حال میرا ھے بعینہ آسیائے باد کا

مطلع کا دوسرا مصرعہ کس قدر بے لاگ ھے- یہی صنعت ذوق کے شاگرد داغ کے یہاں دہک اٹھنے والی ھے - دوسرے شعر میں تشبیہ کی تلاش قابل توجہ ھے - اسے صائبیت کہیں یا ناسخئیت یا محض کلاسکئت ؟

آسے عیار پایا یار سمجھے ذوق ھم جس کو
جسے یاں دوست اپنا ھم نے جانا وہ عدو نکلا

کیا دوسرا مصرع داغ کے کلام کی جان اور تیکھے پن کی طرف اشارہ نہیں کر رھا ھے ؟

ھم ھیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
کام جنت میں ھے کیا ھم سے گنہگاروں کا

محتسب گرچہ دل آزار ھے مئے خواروں کا
دیجیے اک جام تو ھے یار ابھی یاروں کا

اتنا تو شور فغاں ھو کہ چمن میں بلبل
خرمن گل کی جگہ ڈھیر ھو انگاروں کا

بیان کی صفائی اور بے تکلفی تینوں اشعار میں دیکھیے - دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں یہ صفت کس طرح چمک اٹھی ھے - اردو کی چمک یہاں قابل سماعت ھے -

نالہ اس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا
دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا
لاکھ دیتا فلک آزار گوارہ تھے مگر
ایک تیرا نہ مجھے درد جدائی دیتا
کون گھر آئنہ کے آتا اگر وہ دل میں
خاکساری سے نہ جاروب صفائی دیتا
منہ سے بس کرتے نہ ھرگز یہ خدا کے بندے
گر حریصوں کو خدا ساری خدائی دیتا
دیکھ گر دیکھنا ہے ذوق کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزن دل سے ہے دکھائی دیتا

اردو کا اردو پن اس طرح نہ غالب کے یہاں نمایاں ہے نہ مومن کے یہاں ، مگر اردو میں شعریت کے جو امکان ھیں وھاں تک ذوق کی پہونچ نہیں ۔

ھر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا
وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا

بغیر شعریت کے لطف زبان کی مثال یہ مطلع بھی ہے ۔ طربیہ یا ھجویہ اشعار کا اسلوب سانچے میں ڈھل رہا ہے ۔

نکتہ اس بت سے کبھی لیوینگے ھم ایمان کا
ایسی جلدی کیا ہے جلدی کام ہے شیطان کا
جھوٹ ھی جانو کلام اس رھزن ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا
تو ھماری زندگی ، پر زندگی کی کیا امید
تو ھماری جان ، لیکن کیا بھروسہ جان کا
جو فرشتے کرتے ھیں کر سکتے ھیں انسان بھی
پر فرشتوں سے نہ ھو جو کام ہے انسان کا
نفس بے مقدور کو قدرت ھو گر تھوڑی سی بھی
دیکھ پھر سامان اس فرعون بے سامان کا

لطف زبان لیکن بے نمک شاعری کی مثال یہ تمام اشعار ہیں بیان کا جیتا جاگتا جادو دیکھ لیجیے مگر شاعری کا جادو یوں نہیں جگایا جا سکتا۔ ذرا لطف بیان سے بچ کر شاعری کا جادو جگایا جاتا ہے۔ تیسرا شعر داغ کی یاد دلاتا ہے۔

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

اس غزل کے اور اشعار اس لئے نظر انداز کرتا ہوں کہ یہ غزل اکثر اسکولوں کے آردو نصاب میں رہی ہے۔ ذوق کی خصوصیت کی یکسانیت یہاں بھی نظر آ رہی ہے۔

میں وہ شہید ہوں لب خندان یار کا
ہنستا رہے چراغ بھی میرے مزار کا
ہنگامہ گرم هستئی نا پائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا
تو بر میں ہے مگر مری آنکھوں سے دور ہے
لپکا جو پڑ گیا ہے مجھے انتظار کا
اس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق
گویا کہ اک ستارہ ہے صبح بہار کا

اس شعر کو ذوق یوں بھی کرنا چاہتے تھے حاشیہ پر لکھ لیا تھا لیکن فیصلہ نہیں کر سکتے تھے کہ مندرجہ بالا شکل میں شعر کو رکھیں یا یوں رکھیں :—

دیکھ اپنے درگوش کو عارض سے متصل
دیکھا نہ ہو ستارہ جو صبح بہار کا
اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دور بھاگ
اس میکدہ میں کام نہیں ہوشیار کا

زبان ، زبان ، زبان ! مضمون ، مضمون ، مضمون ! لیکن شاعری؟ سرے سے تو غائب نہیں ، لیکن کم ہے بہت کم۔

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

بظاہر یہ مطلع بے کوشش و بے کاوش موزوں ہوگیا، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ذوق کو چھوڑ کر اور کس شاعر کے ایسے مطلع یاد کرنے سے یاد آتے ہیں؟ شاعری اردو زبان کو گویا پا رہی ہے۔

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہؤا
وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا*

رنگین اور رسیلی معاملہ بندی ہے۔ جرأت کی پرچھائیں سی اس شعر پر پڑتی ہے۔ لیکن اس ہلکے پھلکے طریقے سے یہ مضمون باندھ دینا ذوق ہی کا کام تھا۔ بات پوری کی پوری کہہ دی گئی ہے۔ اس لیے شعر میں رمزئیت نہیں آسکی۔

بغل سے لے گئے دل کو نکال کر وہ صریح
جو مانگا تو کہا آنکھیں نکال کے، کیسا؟

''کیسا'' کے لفظ میں روز مرہ کا لطف لے لیجیے اور بس۔

جنبش برگ صفت باغ جہاں میں اے ذوق
کچھ نہ ہاتھ آئے گا تو ہاتھ ہی مل جاؤنگا

استادانہ مقطع ہے۔ مگر کھلے ڈھلے انداز بیان نے زیادہ تاثیر پیدا نہیں ہونے دی۔

اس سے تو اور آگ وہ بیدرد ہو گیا
اب آہ آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا
پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق
نامرد مرد، مرد جواں مرد ہو گیا

---

*نہیں اٹھتی ہیں اول تو نگاہیں صبح کو ان کی
مگر اٹھیں تو پھر اٹھتی ہیں وہ اک داستاں ہو کر
(عارف ھسوی مرحوم)

دونوں اشعار کے دوسرے مصرعوں میں مشاق کے کرشمے دیکھیے -

پانی طبیب دے گا ہمیں کیا بجھا ہؤا
ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہؤا
کہتے تھے آفتاب قیامت جسے سو وہ
نکلا چراغ داغ دل اپنا بجھا ہؤا
ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینہ میں ہم نے ذوق نہ پایا بجھا ہؤا

رواں دواں بے تکلف نثریت میں ہی ان اشعار کی استادانہ شان ہے - میر کے کچھ اشعار یاد آتے ہیں اور ذوق کا یہ مصرعہ بھی :—
''نہ ہوا پر نہ ہؤا میر کا انداز نصیب''

جدا ہوں یار سے ہم اور نہ ہوں رقیب جدا
ہے اپنا اپنا مقدر جدا ، نصیب جدا
تری گلی سے نکلتے ہی اپنا دم نکلا
رہے ہے کیونکہ گلستان سے عندلیب جدا
ہے اور علم و ادب مکتب محبت میں
کہ ہے وہاں کا معلم جدا ، ادیب جدا
فراق خلد سے گندم ہے سینہ چاک اب تک
الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا
کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جدا

ردیف اور قافیے نگینے کی طرح جڑدیے گئے ہیں - آواز میں رکاوٹ نہیں ہے لیکن گھلاوٹ بھی نہیں ہے - آواز حساس نہیں ہونے پائی - غم کے مضامین ہیں لیکن آواز دکھتی ہوئی نہیں ہے -

شکر پردہ ہی میں اس بت کو حیا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا
آشیاں باغ میں ڈھونڈھا جو قفس سے جا کر
ایک تنکا بھی نہ تھا باد صبا نے رکھا

نہ رکھی خوبی وزشتی سے غرض آئینہ وار
گھر میں مہمان جسے اہل صفا نے رکھا

مطلع کے دوسرے مصرعے میں دو فقرے کس اچانک برجستگی سے آئے ہیں ۔ اس اسلوب کو ذوق نے شروع میں چمکایا ۔ آتش اور شاگردان آتش نے زبان میں جو صفائی پیدا کی ، جو برجستگی اور بے تکلفی لائے ، دلی میں اس کی مثال ان اشعار میں نظر آتی ہے ۔ ردیف پر جس طرح اشعار کی تان ٹوٹ رہی ہے وہ فاتحانہ شان سے اردو کے آگے بڑھنے کی مثال ہے ۔

نشہ دولت کا بد اطوار کو جس آن چڑھا
سر پہ شیطان کے یاں اور بھی شیطان چڑھا
عشق کے ڈھب پہ نہ کوئی بجز انسان چڑھا
اس کے قابو پہ چڑھا تو یہی نادان چڑھا
دیکھنا ملت و دیں دونوں ہیں برباد کہ آج
باد کے گھوڑے پہ وہ دشمن ایمان چڑھا
سنگ سرمہ میں سیہ تاب تھی وہ تیغ نگاہ
گردش چشم نے پردی ہے عجب سان چڑھا
اشک آئے نہیں مژگاں پہ کہ یاروں نے ابھی
پانی سونیزہ دیا باندھ کے طوفان چڑھا
حضرت عشق کی درگاہ میں آکر اے ذوق
دل و دیں دیتے ہیں سب گبرو مسلمان چڑھا

دیکھیے ردیف اور قافیہ کے میل سے اردو کے ٹھٹھول کا رنگ ! ذوق لوگوں کو محسوس کرا دیتے تھے کہ اردو شاعری طرزبیان میں فارسی شاعری سے الگ نکھار رکھتی ہے ۔ غالب و مومن کے یہاں اردوئت پر جذبات اور تخئیل حاوی ہیں ۔ ذوق اردو کا نرالاپن دکھا کر لوگوں کو چونکا دیتے تھے ۔ گہرے جذبات سے متاثر ہونے کی صلاحیت اس زمانے میں بہت کم لوگوں میں تھی ۔ سطحی مگر ذرا چمکتی ہوئی بزلہ سنجی کو پہچان کر پھڑک اٹھنا خاص و عام سب کے لئے آسان تھا ۔ دوسرے مطلعے میں نادان کے لفظ کی معنویت دیکھیے ۔

خلاف وعدہ سے میں تیرے کل تو جاں بلب آیا
نہ آیا آج بھی گر تو تو اے ظالم غضب آیا
برنگ غنچہ خونیں دل ہنسے کیا اس گلستاں میں
بھر آیا منہ میں خوں گر اک تبسم زیر لب آیا

مطلع کے دوسرے مصرعے میں ''غضب آیا'' کا ٹکڑا بول چال کو غزل کے سانچے میں ڈھال دینے کی مثال ھے ۔ ''نہ آج بھی گھر تو'' کے ٹکڑے کو بھی دیکھیے ۔ انہی نقوش کو تو داغ کے ھاتھوں چمک جانا ھے ۔

سر راہ فنا میں ھوں مہیا ھے سفر لیکن
برنگ اشک مژگاں منتظر ھوں اک اشارے کا

بہت اچھا شعر ھے ۔ دوسرے مصرعے میں شاعری اور مصوری یوں مل گئی ھیں کہ کیا کہنا ۔

آنکھیں مری تلووں سے وہ مل جائے تو اچھا
یہ حسرت پابوس نکل جائے تو اچھا
جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر
جو دل کہ ھو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا
وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاھوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا
ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا
القصہ نہیں چاھتا میں جائے وہ یاں سے
دل میری ھی باتوں میں بہل جائے تو اچھا
ھے قطع رہ عشق میں اے ذوق ادب شرط
یاں شمع نمط سر ھی کے بل جائے تو اچھا

دیکھیے ذوق کی ردیفوں میں ٹھیٹھ اردو (یا ٹھیٹھ ھندی) کا ٹھاٹھ ۔ مگر بیان کی خارجیت بھی دیکھیے ۔ سوز و گداز پیدا نہیں ھو سکا ۔ زبان کی شاعری کے یہی خطرے ھیں ، مگر مشاقی کے یہ کرتب کچھ دیر کے لئے متوجہ تو کر ھی لیتے ھیں ۔

کہے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پیے لہو میرا
مجھے وہ پردہ نشیں سامنے کب آنے دے
جو ذکر آنے نہ دے اپنے روبرو میرا
مقام وجد میں آئیں ابھی ملایک عرش
جو میکدہ میں سنیں شور ھائے و ھو میرا
کروں میں کیا کہ گریبان صبح کی مانند
نہیں ہے چاک جگر قابل رفو میرا
ھمیشہ میں ھوں اسی داؤ گھات میں اے ذوق
کہ رام ھو وہ غزال پلنگ خو میرا

شاعری کہاں ہے ؟ ذوق کے کمال کی بھی بہترین مثال یہ اشعار نہیں ھیں - پھر بھی صفائی اور روانی اور بول چال کی چاشنی اشعار کو بالکل بے مزہ ھونے سے بچا لیتی ھیں - مقطعے میں وہ شکار کھیلنا چاھا ہے جس میں بڑے خطرے ھیں -

کب صبا آئی ترے کوچے سے اے یار کہ میں
جوں حباب لب جو جامہ سے باھر نہ ھؤا

''حباب لب جو'' کے ٹوٹنے کو جامہ سے باھر ھونا کہنا استادانہ انداز بیان ہے - غالب و مومن بھی اس کی داد دیئے بغیر نہ رہتے -

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے
لاکھ طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ھی رھا
مجھ میں اس میں ربط ہے گویا برنگ بوو گل
وہ رھا آغوش میں لیکن گریزاں ھی رھا

پہلا شعر ضرب المثل بن گیا ہے - دوسرے شعر کی تشبیہ لطافت سے خالی نہیں - ''ھی رھا'' کی ردیف بھی اردو کی خصوصیت کو چمکا دینے کا امکان رکھتی ہے -

ترے رخسار کا پرتو پڑے گر عارض گل پر
کرے چشمک زنی خورشید پر ھر قطرہ شبنم کا

اس شعر سے جو تصویر جھلک جاتی ھے اس کی رنگینی اور آب و تاب سے کون انکار کر سکتا ھے ۔

وہ کون ھے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا
پڑھتا نہیں خط غیر مراواں کسی عنوان
جب تک کہ عبارت میں تصرف نہیں کرتا
اے ذوق تکلف میں ھے تکلیف سراسر
آرام سے ھے وہ جو تکلف نہیں کرتا

مطلع کا دوسرا مصرعہ کس قدر بے لاگ ھے ۔ دوسرا شعر مزیدار ھے ۔ مقطع تو ضرب المثل ھو گیا ھے ۔ مطلع تو بے لاگ داغ کی یاد دلاتا ھے ۔

خاکساری کو ھماری مل گئی اکسیر عشق
اب تو پارس ھوگا جو آئے گا پتھر زیر پا
زیر دستی پر بھی ھے موذی سے لازم احتراز
جب دبے گا سانپ کاٹے گا مقرر زیر پا

پارس اور پتھر نے ٹھیٹھ اردو کی شان شعر میں پیدا کر دی ھے ۔ دوسرے شعر میں اخلاق مضمون کو مثالیہ انداز میں پیش کیا ھے ۔ ''جب دبے گا سانپ کاٹے گا'' بے لاگ اردو ھے ۔

کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا
اے صنم پر تیرا پتھر نہ پگھلتے دیکھا
تھا میں اس باغ میں نخل گل آتشبازی
پھولتے دیکھا مگر آہ نہ پھلتے دیکھا

''ترا پتھر نہ پگھلتے دیکھا'' دوسرے شعر میں پھولتے ، پھلتے کے الفاظ ، یہ سب اس رجحان کا پتہ دے رھے ھیں جس کے زیر اثر اردو شاعری میں نمایاں طور پر اردو زبان کو ابھارا جا رھا ھے ۔

چاھے عالم میں فروغ اپنا تو ھو گھر سے جدا
دیکھ چمکے ھے شرر ھوتے ھی پتھر سے جدا

اخلاقی مضمون کو مثالیہ شاعری کے ذریعے پیش کیا ہے - اسی زمانے میں ناسخ اور دیگر شعرائے لکھنؤ اس طرف متوجہ تھے -

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں نہ ٹھہریگا
و لیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہریگا

پہلا مصرعہ یوں بھی شائع ہؤا ہے :-

تیرے ہاتھوں کوئی آوارہ اے گردوں نہ ٹھہریگا
و لیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا
وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی
اگر ہاتھ آئے گا گنجینۂ قاروں نہ ٹھہرے گا

مطلع کے دوسرے مصرعے میں دو فقرے پیوست کر دئیے گئے ہیں - ردیف کی شخصیت الگ سے نکھر آئی ہے ، چونکہ ردیف اردو کا ایک فقرہ ہے اس لئے بیان کی تان جب اس پر ٹوٹتی ہے تو شعر کی اردوئیت چمک جاتی ہے -

آدم دوبارہ سوئے بہشت بریں گیا
دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا

دوسرے مصرعے پر بے ساختہ منہ سے واہ نکل جاتی ہے "جہاں" اور "وہیں" کے الفاظ سے مصرعے میں جو لہک پیدا ہو گئی ہے ، یہ وہ صفت ہے جو غالب و مومن سے ذوق کو متمائز کرتی ہے -

کیا کیا مزہ نہ تیرے ستم کا اٹھا لیا
ہم نے بھی لطف زندگی اچھا اٹھا لیا
یوں لائے واں سے ہم دل سیپارہ کرکے جمع
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

حالی کہتے ہیں :-

کر دیا خوگر جفا تو نے خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

میر کا شعر ہے :—

جفائیں دیکھ لیاں کج ادائیاں دیکھیں
بھلا ہؤا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

ذوق ، حالی ، میر تینوں کے مطلعے سیدھی سادی اردو میں ھیں - لیکن ذوق کے مطلعے میں نہ حالی کی سی بات پیدا ھو سکی نہ میر کی سی - ھاں ذوق کے مطلع میں وہ دبی سی طنز ضرور ہے جو داغ کے اکسانے سے چنگاریاں بن کر اڑے گی -

آنا تو خفا آنا ، جانا تو رلا جانا
آنا ہے تو کیا آنا جانا ہے تو کیا جانا

طنز ھی مطلع کی جان ہے اور یہی کامیاب طنزیہ انداز شعر کو طنز سے آگے نہیں بڑھنے دیتا -

اے دل نہ راہ عشق کشادہ سمجھ کے جا
یاں اژدھا ہے ہر خط جادہ ، سمجھ کے جا
عیاریوں سے یار کی نالاں ہے کیوں دلا
اور اس کو اپنا دوست زیادہ سمجھ کے جا

دوسرے شعر میں بھی طنزیہ انداز بیان ہے لیکن اس طنز میں نہ داخلی کشمکش ہے نہ نوک نہ چبھن - بس ایک چھیڑ ہے ، ایک چٹکی اور کچھ نہیں - محبوب میں عیاریوں کا ھونا سمجھ میں ضرور آتا ہے لیکن اس کا یوں ذکر کرنا کیا غزل کی لطیف ترین اسپرٹ کو چوٹ نہیں پھونچاتا ؟ دیکھیے معشوق کی ''برائیوں'' کی میر نے کس طرح شکایت کی ہے - ''بھلا ھوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں'' -

بعد فراق کوئی دن ایسا نہ وصل کا ھؤا
وہ کہیں تم کو کیا ھؤا ھم کہیں تم کو کیا ھؤا

محاکاتی مطلع ہے ، راز و نیاز کے ایک خاص لمحے کی تصویر دوسرے مصرعے میں کھنچ گئی ہے -

چشم و نگہ کو تیری بدنام کیوں کرے گا
مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ لے مریگا

یعنی عاشق مرے گا تو تیری چشم و نگہ سے لیکن اپنی موت کے ساتھ وہ مرگ و قضا کو نہ لے مرے گا ، اور لوگ یہی کہیں گے کہ اس کی موت ہی آ گئی تھی ، بے لاگ انداز بیان قابل داد ہے ۔

مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا
کافر کی دیکھو شوخی ، گھر میں خدا کے مارا

کسی فتنہء خانقاہ کی کیسی تصویر کھینچی ہے ۔ دوسرے مصرعے میں دو فقرے کس برجستگی سے لائے گئے ہیں ۔ ''گھر میں خدا کے مارا'' کا ٹکڑا بتا رہا ہے کہ یہ نہ مومن ہیں نہ غالب ، بلکہ ذوق اور صرف ذوق ۔

آخر گل اپنی خاک در میکدہ ہوئی
پہونچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

دوش دیدم کہ ملائک درمیخانہ زدند
گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

حافظ کا یہ مطلع یاد آ گیا ۔ ذوق کے شعر میں کچھ شوخی تو آ ہی گئی لیکن گہرائی ؟

ذوق جلدی مئے گلرنگ سے بھر ساغر مل
لب نازک کو ہے اس کے ہوس جام شراب

ردیف کو دیکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ اچھا خاصہ شعر نکال لیا ۔

ہو ہجر مدتوں جو ہو وصل ایک دم نصیب
کم ہوگا کوئی ہم سا بھی الفت میں کم نصیب

مطلع کے پہلے مصرعے میں قافیہ اور ردیف کا الگ الگ لفظ ہونا اور دوسرے مصرعے میں قافیہ ردیف مل کر ایک لفظ بن جانا

خالی از لطف نہیں - ذوق زبان کو وسعت دے رہے ھیں - اسی مضمون کو مومن نے نشتر بنا دیا ھے :—

اس سے تقدیر میں تھا کم ملنا   کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

دل عبادت سے چرانا اور جنت کی طلب
کام چور اس کام پر کس منہ سے اجرت کی طلب

عبادت سے جنت پانے ھی پر تو عمر خیام نے کہا تھا ''ایں مزد بود مہرو عطائے تو کجا است'' مگر ذوق کو تو اردو کی بہار دکھانی ھے سو انہوں نے دکھا دی -

ٹھہری ھے ان کے آنے کی اب کل پہ جا صلاح
اے جان برلب آمدہ تیری ھے کیا صلاح
رھتا ھے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ
جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

استادانہ قدرت بیان سے مطلع کہا ھے - یہ ردیف اور ثقل کا نام نہیں - دوسرے شعر میں تو وہ کیفیت پیدا ھو گئی ھے کہ ایک لمحے کے لئے ذوق کو جذبات کا شاعر ماننا پڑ جاتا ھے -

بل بے کمر کہ زلف مسلسل کے پیچ میں
کھاتی ھے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

شعر کسی اور کا تھا اور ذوق کو بہت پسند تھا ، لیکن اصلی شعر کا دوسرا مصرعہ بہت الجھا ھؤا تھا - ذوق نے گنگنا گنگنا کے شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک لچک اور ھلکا سا جھٹکا پیدا کر دیا ھے -

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینہ میں ھوگی سانس اڑی دوگھڑی کے بعد
گردم کے دم وہ ھم سے ملائم ھوئے تو کیا
کہہ بیٹھیں گے پھر ایک گھڑی دوگھڑی کے بعد
کل اس سے ھم نے ترک ملاقات کی تو کیا
پھر اس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد

گو دو گھڑی تک اس نے نہ دیکھا ادھر تو کیا
آخر ہمیں سے آنکھ لڑی دو گھڑی کے بعد

کیا جانے دو گھڑی وہ رہے ذوق کس طرح
پھر تو نہ ٹھہرے پاؤں گھڑی دو گھڑی کے بعد

پھر دیکھیے کہ ردیف اور قافیوں میں کتنی ٹھیٹھ اُردوئیت ہے۔

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

آزاد لکھتے ہیں کہ مومن جب ایک بار ذوق سے ملنے آئے تو آن کی فرمائش پر ذوق نے یہ مطلع سنایا۔ مومن نے ہنس کر کہا کہ اب کوئی کیا کہے گا، راستہ بند ہے۔

دل کو رفیق عشق میں اپنا سمجھ نہ ذوق
ٹل جائے گا یہ اپنی بلا تجھ پہ ڈال کر

ذوق لکھنؤ اسکول کے شاعر نہیں ہیں مگر دوسرا مصرعہ اس رنگ کی طرف اشارہ کر رہا ہے جسے لکھنؤ اسکول نے فروغ دیا۔

گرچہ ہے ملک دکن میں ان دنوں قدر سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

یہاں بھی وہی بات کہنے کو جی چاہتا ہے جو اس کے پہلے والے شعر پر میں نے کہی۔ دلی کی اسپرٹ تو غالب کے اس مصرعے میں ہے ''ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا''۔

دل شوریدہ سر نے خاک اڑا کر
بیاباں رکھ لیا سر پر اٹھا کر

میر کا شعر ہے:—
دل کہ اک قطرہ خوں نہیں تھا بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

میر کے ایسے بے لاگ مصرعوں پر ذوق کی نظر انتخاب پڑتی تھی، چونکہ یہ مصرعے زبان میں ہوتے تھے۔ مگر میر کی طنز عنصری چیز ہے، جب ذوق یہ رنگ اڑاتے ہیں تو یہ رنگ اڑ جاتا ہے۔

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آن کے پاس
بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

خوب کہا ہے۔ کہاوت یہی نہیں کہ بے لاگ بندھ گئی ہے بلکہ ذوق کے اسلوب میں اثر پیدا ہونے کے جو امکان ہیں وہ یہاں پورے ہو گئے ہیں۔

پھر تو آئے خیر سے ہم جا کے اُس مغرور تک
پر اچھلتا ہی رہا اپنا کلیجہ دور تک

شعر ذوق کے اسلوب کی صاف مثال ہے۔ لیکن میر کے اس شعر کے اثر کو ذوق کہاں سے لائیں۔

تڑپے ہے جبکہ سینے میں اُچھلے ہے دو دو ہاتھ
گر دل یہی ہے میر تو آرام ہو چکا

پابند جوں دخاں ہیں پریشانیوں میں ہم
یارب ہیں کس کی زلف کے زندانیوں میں ہم

ذوق نے دلچسپ خارجیت لئے ہوئے شعر کہا ہے۔ لیکن غالب کے "دود چراغ کشتہ" سے نبض کی تشبیہہ میں داخلیت آ گئی ہے۔

بے یار روز عید شب غم سے کم نہیں
جام شراب دیدۂ پرنم سے کم نہیں
دیتا ہے دور چرخ کسے فرصت نشاط
ہو جام جس کے ہاتھ میں وہ جم سے کم نہیں
ہوتی ہے جمع زر سے پریشانی آخرش
درہم کی شکل صورت درہم سے کم نہیں
اس حوروش کا گھر مجھے جنت سے ہے سوا
لیکن رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں

آپ محسوس کر رہے ہیں نا کہ یہ رنگ نہ غالب کا ہے نہ مومن کا، نہ ذوق کے پہلے کسی اور شاعر کا، یہ صرف ذوق کا رنگ ہے۔

هفتاد دو فریق حسد کے عدد سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں
جانداد گان عشق سے پوچھو فناہ کی راہ
اس میں جناب خضر ابھی نابلد سے ہیں
جتنے مزے ہیں یاں روش نشہ' شراب
ہو جاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مہر داغ عشق
ہم کرتے ذوق عشق کا دعویٰ سند سے ہیں

عجیب زمین ہے مگر ذوق کی استادی نے اسے بس میں کر لیا ہے۔

بلائیں آنکھوں سے ان کی مدام لیتے ہیں
ہم اپنے ہاتھوں کا مژگاں سے کام لیتے ہیں
ہمارے ہاتھ سے اے ذوق وقت مے نوشی
ہزار ناز سے وہ ایک جام لیتے ہیں

مقطعے کا دوسرا مصرع کس بانکپن سے کہا ہے! اس ادائے معشوقانہ میں کیا لطیف رکاوٹ ہے۔

دود دل سے ہے یہ تاریکی مرے غمخانہ میں
شمع ہے اک سوزن گم گشتہ اس کا شانہ میں
برق خرمن سوز ہے عالم میں نافہمی تری
ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں ہر دانہ میں

مطلع میں تشبیہہ بہت لطف دے رہی ہے۔ یوں تو یہ رنگ ناسخ سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن ناسخ کی انتہا پسندی کا عیب ذوق کے مطلع میں نہیں آنے پایا۔ دوسرے شعر کی معنویت قابل داد ہے۔ دونوں اشعار میں ایک نرم آہنگی ہے جو لکھنؤ اسکول کی شاعری سے ذوق کے کلام کو الگ کر دیتی ہے۔ لکھنؤ اسکول کے اس قسم کے اشعار عموماً خشک اور کرخت ہوتے ہیں۔

علم جس کا عشق اور جس کا عمل وحشت نہیں
وہ فلاطوں ہے تو اپنے قابل صحبت نہیں
خاک ہو کر بھی فلک کے ہاتھ سے ہم کو قرار
ایک ساعت مثل ریگ شیشہٴ ساعت نہیں

ذوق اس صورتکدہ میں ہیں ہزاروں صورتیں
کوئی صورت اپنے صورت گر کی بیصورت نہیں

یہ اشعار بھی ناسخ کی کچھ یاد دلاتے ہوئے کسی قدر آتش کے انداز کی طرف جھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
واعظا چھوڑ ذکر نعمت خلد
کر شراب وکباب کی باتیں
مہجبیں! یاد ہیں کہ بھول گئے؟
وہ شب ماھتاب کی باتیں
جام مے لب سے تو لگا اپنے
چھوڑ شرم و حجاب کی باتیں
سنتے ہیں اس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں
دیکھ اے دل نہ چھیڑ قصہٴ زلف
کہ ہیں یہ پیچ و تاب کی باتیں

ذکر کیا جوش عشق میں اے ذوق
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

میر کی چھوٹی بحر کی غزلیں ''ساری مستی شراب کی سی ہے''، یا ''ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں''، کتنی نشتریت رکھتی ہیں۔ مصحفی کی غزل ''ھاتھوں کی پناہ ہم نے کرلی''، سوز و ساز کی نرم چاشنی لئے ہوئے ہے۔ ذوق کی غزل سطحی بات چیت کو شعر میں ڈھال دینے کی مثال ہے، اور یاد دلاتی ہے داغ کی ایسی غزلوں کی جیسے ''آپ بندہ نواز کیا جانیں''۔

ہے جی میں اپنے غرۂ جوہر کو توڑ دوں
آئینۂ خیال مکدر کو توڑ دوں
دنیا سے میں اگر دل مضطر کو توڑ دوں
سارے طلسم وہم مکدر کو توڑ دوں
میں کاٹ دوں پہاڑ کو پتھر کو توڑ دوں
پر کیونکہ غیر سے بت کافر کو توڑ دوں
کیا دشمنی ہے اہل کرم سے کہے ہے چرخ
یاں تک جھکاؤں شاخ ثمرور کو توڑ دوں
ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے جی
باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں
احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں
ہر موج بحر عشق کو یہ بل ہے، بل بے زور
کہتی ہے دست و پائے شناور کو توڑ دوں
نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں
پھر اس مژہ کو یاد کرے دل تو دل میں ذوق
نشتر چبھو کے میں سر نشتر کو توڑ دوں

اس پتھریلی زمین سے ذوق نے خوب خوب کام لیا ہے ۔ مومن ، غالب ، میر اور سودا یہ نہیں کرتے تھے ۔ لیکن ذوق اردو کے امکانات کو چمکا رہے ہیں ۔ مصحفی نے عموماً بسا اوقات ، انشا نے بھی سنگلاخ زمینوں میں اپنی طبیعت اور اپنی استادی کے جوہر دکھائے ہیں ۔ لیکن جس طرح ردیف اور قافیہ میں ذوق محاورے باندھ گئے ہیں ، اور گوناگوں مضامین نظم کر گئے ہیں ، وہ ان کا حصہ ہے ۔ اگرچہ بل جاؤں گا ، پھل جاؤں گا ، والی غزل میں آتش نے بھی قافیہ و ردیف کو ملا کر محاورہ باندھا ہے اور اپنے خاص انداز کو بھی چمکا دیا ہے :—

صورت پیرہن تنگ نکل جاؤں گا

گذرتی عمر ہے یوں دور آسمانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتئی دخانی میں

رکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں
وفور اشک اگر سر بہ موج ہو اپنا
فلک برنگ گل نیلوفر ہو پانی میں
وہ سیدھے گھر کو سدھارے اور ان کے کھوج میں ہم
پھرے بھٹکتے ہوئے کوئے بد گمانی میں

پہلا مطلع مع تعقید کے ناسخیت کی جھلک لئے ہوئے ہے مگر اعتدال کے ساتھ - اس خارجی رنگ میں شعریت نہ سہی لیکن خیال کو ہلکا سا انبساط ضرور ملتا ہے - دوسرا مطلع اپنے بے لاگ انداز بیان کی وجہ سے ذوق کے کمال سخنوری کا صاف آئینہ ہے - تیسرے شعر میں پھر ناسخ کا رنگ جھلکنے لگا ہے - آخری شعر میں کوئے بدگمانی کی ترکیب بجائے خود بھی خوب ہے اور پورا شعر ایک حالت کی صحیح تصویر بھی ہے - کوئے بدگمانی غالب کی ''کوئے ملامت'' کی یاد دلا دیتی ہے مگر غالب کا شعر کتنا پر اثر ہے :-

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

گہر کو جوہری صراف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں
جب اپنے رونے میں سوز جگر کو دیکھتے ہیں
دھوئیں پہ اڑتا ہؤا خشک و تر کو دیکھتے ہیں
ہے ان کی چشم کی گردش پہ گردش عالم
جدھر ہو ان کی نظر سب ادھر کو دیکھتے ہیں
پڑے گا سایۂ زلف اس پہ بھی ضرور کبھی
کہ پیچ و تاب تمہاری کمر کو دیکھتے ہیں
فنا کی راہ میں پتھر جو بن کے بیٹھے ہیں
انہی کو دیکھ کے ہنستے شرر کو دیکھتے ہیں
بنا کے آئینہ ہیں دیکھتے جو آئینہ گر
ہنرور اپنے بھی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
عیار نقد محبت کا دیکھ سختی پر
لگا کے ذوق کسوٹی پہ زر کو دیکھتے ہیں

اسی زمین میں غالب کی غزلیں بھی دیکھیے ۔ ذوق کے اشعار ان کی مشق سخن اور قدرت بیان کی اچھی مثالیں ھیں ۔ غالب نے اپنی غزل میں ترنم پیدا کر دیا ھے ۔ ذوق کی غزل گائی نہیں جا سکتی ۔ شعر میں موسیقیت آتی ھے داخلیت سے ۔ پھر بھی مضمون آرائیوں سے اور نثریت میں ایک روانی پیدا کر کے ذوق نے اپنے اشعار کو بے لطف ہونے سے بچا لیا ھے ۔

مے ملا کر ساقیان سامری فن آب میں
کرتے ھیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں
پھرتا ھے سیل حوادث سے کوئی مردوں کا منہ
شیر سیدھا تیرتا ھے وقت رفتن آب میں

کچھ ناسخ کی بلکہ اس سے زیادہ آتش کی یاد ان اشعار سے آتی ھے ۔

وہ دن ھے کون سا کہ ستم پر ستم نہیں
گر یہ ستم ھیں روز تو اک روز ھم نہیں
مشکل ھے میرے عہد محبت کا ٹوٹنا
اے بیوفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں
ھاتھ آئے کس طرح سے دل گمشدہ کا کھوج
ھے چور وہ کہ جس پہ کسی کا بھرم نہیں

کیا یہ اشعار داغ سے پہلے داغ کی یاد نہیں دلا رھے ھیں ؟

ھم سے ظاھر و پنہاں جو اس غارت گر کے جھگڑے ھیں
دل سے دل کے جھگڑے ھیں نظروں سے نظر کے جھگڑے ھیں
حضرت دل کا دیکھنا عالم ، ھاتھ اٹھائے دنیا سے
پاؤں پسارے بیٹھے ھیں اور سر پہ سفر کے جھگڑے ھیں
ذوق مرتب کیونکہ ھو دیواں ، شکوۂ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے میں ھم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ھیں

ردیف کہہ رھی ھے کہ ھم اردو غزل کی ردیف ھیں ۔ جمہور کی دیسی بولی ٹھولی ایسی ھی ردیفوں میں چمکتی ھے ۔ پنچائتی زبان کا لطف ایسی زمینوں میں آ جاتا ھے ۔ بہادر شاہ ظفر K دیوان

بھی ایسی زمینوں سے بھرا پڑا ہے - اس وقت دلی کا عام مذاق یہی تھا نہ کہ وہ مذاق جو غالب و مومن کا مذاق ہے -*

آج ان سے مدعی کچھ مدعا کہنے کو ہیں
پر نہیں معلوم کیا کہویں گے کیا کہنے کو ہیں

غالب اور ذوق سب کے یہاں ''کہویں گے'' کا لفظ آ جاتا ہے - اور اس وقت کی زبان کا لطف مل جاتا ہے -

کرے وحشت بیاں ، چشم سخن گو اس کو کہتے ہیں
یہ سچ کہتے ہیں سر چڑھ بولے جادو اس کو کہتے ہیں
سوال بوسہ کو ٹالا جواب چین ابرو سے
برات عاشقاں بر شاخ آہو اس کو کہتے ہیں
گرہ کھولی ذرا اس نے جو اپنی زلف مشکیں سے
معطر ہو گیا آفاق ، خوشبو اس کو کہتے ہیں

''جھگڑے ہیں'' والی غزل پر جو کچھ میں نے کہا ہے وہی بات یہاں بھی ہے - غالب تو نہیں لیکن مومن کبھی کبھار بول ٹھٹھول کی ردیف کی طرف جھک آئے ہیں - مومن کی غزل ''تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد نہ ہو'' کچھ اسی قسم کی ہے -

قصد جب تیری زیارت کا کبھو کرتے ہیں
چشم پر آب سے آئینے وضو کرتے ہیں

شاعرانہ تصنع (Conceit) قابل دید ہے -

---

*پروفیسر شیرانی مرحوم نے ردی کے ایک مسودے میں محمد حسین آزاد کے ہاتھوں لکھی ہوئی اس غزل کا مسودہ دیکھا - اس میں کئی قافیے آزاد نے لکھ رکھے تھے، مثلاً زیور و زر - پروفیسر شیرانی اس نتیجہ پر پہونچے کہ ذوق کی اس غزل میں ذوق ہی کے نام سے کچھ اشعار اپنی طرف سے کہہ کے آزاد غزل میں ملا دینا چاہتے تھے -

فراق

تم وہ غضب کہ ہوتے بھی کم ایسے شخص ہیں
اور ہم تمہیں پہ مرتے ہیں ہم ایسے شخص ہیں

داغ کی ہلکی جھلک بلکہ قریب قریب پوری جھلک اس مطلع میں نظر آتی ہے یا نہیں ؟

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

غالب کی بھی غزل اس زمین میں ہے - مومن شیفتہ اور دیگر مشاہیر کی بھی - ذوق نے بھی اپنی شان قائم رکھی ہے -

خانقہ میں بھی وہی ہے جو خرابات میں ہے
فرق پر یہ ہے، یہاں منہ پہ ہے اور واں دل میں

یہ بزلہ سنجی یا طنز لیے ہوئے محاورہ، پنچائتی بولی میں خانقاہ والوں کو چھیڑنا، ذوق کی وہ خصوصیت ہے جو غالب و مومن سے انہیں الگ کرتی ہے اور جس کی بہت سی اور مثالیں ہم دیکھ چکے ہیں -

تیرے آفت زدہ جن دشتوں میں اڑ جاتے ہیں
صبر و طاقت کے وہاں پاؤں اکھڑ جاتے ہیں
کیوں نہ لڑوائیں انہیں غیر کہ کرتے ہیں یہی،
ہم نشیں جن کے نصیبے کہیں لڑ جاتے ہیں

فارسی قافیہ اس غزل میں آ ہی نہیں سکتا - ڑ کا حرف خالص ہندی حرف ہے - ان قافیوں سے اردو آسانی سے پہچانی جانے والی اپنی الگ حیثیت قائم کر لیتی ہے -

مرے نالوں سے چپ ہیں مرغ خوش الحاں زمانہ میں
صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقارخانہ میں

کہاوت یا ضرب المثل بے لاگ بندھ گئی ہے -

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے میں
بے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لے جانے میں

ایسے اشعار میں عشق سطحی چھیڑ چھاڑ سے آگے نہیں بڑھتا ، لیکن یہ سطحی چھیڑ چھاڑ بھی ایک سطحی مزہ دے ہی جاتی ہے ۔

جس جگہ بیٹھے ہیں بادیدۂ نم آٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم آٹھے ہیں

پورے شعر خصوصاً دوسرے مصرعے کی برجستگی کا کیا کہنا ! عام عقیدہ کس بے ساختہ پن کے ساتھ شعر میں نظم ہو گیا ہے ۔

رخصت جو ہم سے ہو کے جاتے وہ اپنے گھر ہیں
گھبرا کے پہنچتے واں ہم ان سے پیشتر ہیں

محاکاتی مطلع ہے ۔

رکھ مکدر نہ بس اے چرخ تو اتنا ہم کو
ہم نے جانا کہ کیا خاک سے پیدا ہم کو
اور ہمدرد کہاں ، ہو نہو اے حضرت دل
درد اب تم کو ہمارا ہو تمہارا ہم کو
دل میں تھے قطرۂ خوں چند ، سومانند انار
نر ہے وہ بھی جب الفت نے نچوڑا ہم کو
ہم نہ کہتے تھے کہ ذوق اس کی تو زلفوں کو نہ چھیڑ
اب وہ برہم ہے تو ہے تجھ کو قلق یا ہم کو

اسی زمین میں دوسری غزل کے کچھ شعر :—
آسماں اور وہ انسان بنانا ہم کو
خاک میں تھا مگر اس ڈھب سے ملانا ہم کو
دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو
ہم تبرک ہیں بس اب کرلے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لیے آبلۂ پا ہم کو

اس زمانہ کے دلی کے چوٹی کے شاعروں میں اس سج دھج کے ساتھ یہ رنگ سخن ذوق کا اور تنہا ذوق کا تھا۔ یہ رنگ سخن تو عام تھا، لیکن اس رواں دواں طور پر، اس سج دھج کے ساتھ صرف ذوق اسے نباھتے ھیں۔ ھاں لکھنؤ میں آتش کے خاندان میں زبان کی یہ صفائی اور روانی نظر آتی ھے۔

رند خراب حال کو زاھد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو
عمر رواں کا توسن چالاک اس لیے
تجھ کو دیا کہ جلد کرے یاں سے ایڑ تو
اے زاھد دو رنگ نہ پیر آپ کو بنا
مانند صبح کاذب ابھی ھے ادھیڑ تو

قافیے میں ڑ کا حرف اردو کی مہر غزل پر لگا دیتی ھے۔ مطلع تو بول چال کی ایک تصویر ھے، اسی سے آج تک زبان زد خاص و عام ھے۔

موت ھی سے کچھ علاج درد فرقت ھو تو ھو
غسل میت ھی ھمارا غسل صحت ھو تو ھو
آگ میں جل مرتا ھے پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی سے کیا نہ ھو ایکن محبت ھو تو ھو

''ھو تو ھو'' کی ردیف بھی اردو بول چال ھی کی مثال ھے۔ ایسی ردیفیں ذوق اور ظفر کے یہاں بکثرت ملتی ھیں۔

دن کٹا جانے کدھر رات کدھر کاٹنے کو
جب سے وہ گھر میں نہیں دوڑے ھے گھر کاٹنے کو
شام ھی سے دل بیتاب کا ھے ذوق یہ حال
ھے ابھی رات پڑی چار پہر کاٹنے کو

''کاٹنے کو'' کی ردیف میں اردو نمایاں ھے۔ ٹ کا حرف فارسی عربی میں ھے ھی نہیں۔ اشعار کی سلاست اور روانی، بول چال اور محاوروں کا لطف یہ سب چیزیں متوجہ کر لیتی ھیں۔

مشت خاک اپنی ہم اس کوچے میں کل پھینک آئے
اب وہ ذوق آپ اٹھائے نہ اٹھائے اس کو

یہ زمین بھی صاف اردو کی بوباس دیتی ہے۔ مضمون بھی لطف سے خالی نہیں ، شعر کی نرم روی اور سبک رفتاری بھی قابل دید ہے۔

صفا میں رخ سے تیرے آئینہ کیا خاک ہمسر ہو
نگاہ چشم سرمہ آلود سے بھی جو مکدر ہو

رچا ہؤا مضمون رچے ہوئے شعر میں ادا کیا گیا ہے۔

آسی غازی پوری کی غزل اسی زمین میں دیکھنے کی چیز ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

اگر تم چاہتے ہو دل کو منزل گاہ دلبر ہو
توجو ہو غیر، تم ہو یا کہ غیر اس گھر سے باہر ہو

آسی کی اسی غزل کا یہ شعر بھی نہیں بھولتا۔

بہر صورت طلب لازم ہے آب زندگانی کی
اگر پایا خضر تم ہو ، نہ پایا تو سکندر ہو

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو
سمجھ ہے اور تمہاری کہوں میں تم سے کیا
تم اپنے دل میں خدا جانے سن کے کیا سمجھو
نہیں ہے کم زر خالص سے زردئی رخسار
تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

مطلع نہایت مشہور ہے۔ دوسرے شعر میں وہ بات آنے لگی ہے جسے داغ کے ہاتھوں فروغ پانا تھا۔ مقطع میں بھی تمثیلی رنگ کی خیال آرائی خوب ہے مومن کا شعر بھی یاد آ گیا :—

زرد رخ دکھلا دیا داغ جگر دکھلا دیا
آج اس کو ہم نے اپنا زور و زر دکھلا دیا

ہاتھ سینے پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
اک نظر دل سے ادھر دیکھ لو گر دیکھتے ہو
ہے دم باز پسیں دیکھ لو گر دیکھتے ہو
آئینہ رکھ کے مرے منہ پہ کدھر دیکھتے ہو
پر پروانہ پڑے ہیں شجر شمع کے گرد
برگ ریزئی محبت کا ثمر دیکھتے ہو

پہلے مطلعے کے دوسرے مصرعے میں ''دیکھ لو گر دیکھتے ہو'' بول چال کو لطیف انداز سے باندھنے کی مثال ہے ۔ دوسرے مطلع کے پہلے مصرعے میں بھی یہی بات ہے ۔ تیسرے شعر کی مضمون آرائی خارجیت کے باوجود لطف دیتی ہے ۔

عبث تم اپنی رکاوٹ سے منہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو
لگا کے سرمہ تم آنسو نہیں بہاتے ہو
یہ ہم کو جلوۂ شق القمر دکھاتے ہو
اٹھوگے یاں کی ٹھوکر سے لے چلو تشریف
نہیں تو پھر کوئی صلوات سن کے جاتے ہو

سب اشعار سلیس اور رواں دواں ہیں ۔ سطحی سی شوخی بھی موجود ہے ۔ تیسرے شعر کا دوسرا مصرعہ کس قدر برجستہ ہے ۔ ذوق ٹھیٹھ اردو کو چمکائے جا رہے ہیں ، یہی کام سیکڑوں اور شعرا کے ہاتھوں آگے بڑھنے والا ہے ۔

جو ہیں مرتے حسن صفات میں وہ رہیں گے اپنی ہی بات میں
تو فنا ہو ذوق اسی ذات میں کہ جو ذات جملہ صفات ہو

نثریت میں نظمیت کی ہلکی سی چاشنی دے کر باتوں باتوں میں تصوف کا مضمون ادا کر دیا ہے ۔

کوسوں کیا تنگئی زمانے کو کہ نہیں جائے سر اٹھانے کو

تنگئی زمانہ کی جگہ مطلعے کی ضرورت سے ''تنگئی زمانے'' کہنا شاید اس دور میں قابلِ اعتراض نہ رہا ہو ۔

زیادہ ہوتا ہے پیری میں فربہ نفس امارہ
یہ بالوں کی سفیدی شیر ہے اس مار رہزن کا

آتش و ناسخ کی یاد آتی ہے۔ تمثیلی انداز میں اخلاق مضمون باندھا ہے۔ لکھنؤ اسکول سے اس معاملے میں ذوق متعلق معلوم ہوتے ہیں۔

اشکباری مری مژگاں کی ذرا دیکھیں تو
کتنے پانی میں ہیں فوارے بھلا دیکھیں تو

روائتی شاعری، محاورہ، روز مرہ سب کا لطف دیکھیے۔

یا تو پاس دوستی تجھ کو بت بیباک ہو
یا مجھی کو موت آ جائے کہ قصہ پاک ہو

دوسرا مصرعہ صاف بول چال کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ
تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ
وہ دل کو چرا کر جو لگے آنکھ چرانے
یاروں کا گیا ان پہ بھرم اور زیادہ
یارب یہ مری نبض ہے یا موج رم برق
کیا ہوگا جو ہوگی تپ غم اور زیادہ
کیا قہر ہے جتنا ہی وہ چاہت سے رکے ہے
اتنا ہی اسے چاہیں ہیں ہم اور زیادہ
جو کنج قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر
ہے ذوق برابر نہیں کم اور زیادہ

''اور زیادہ'' کی تعریف بھی اردو کے مخصوص انداز بیان کو رچانے، سنوارنے اور نکھارنے کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ ان اشعار میں نشتریت یا سوز و گداز نہ سہی لیکن ایک ہلکی سی شعریت ضرور ہے۔ نثر موزوں کا کافی لطف ان اشعار میں ہے، ہلکی ہلکی سی کسک بھی ہے، مطلع سانچے میں ڈھلا ہؤا ہے۔ آزاد انصاری شاگرد حالی نے اس مضمون میں درد بھر دیا ہے۔

احساس قلق برحق لیکن یہ گذارش ہے
جب رحم کیا ہوگا جینے نہ دیا ہوگا

اپنے لیے ذوق ''یاروں'' کا لفظ کبھی کبھی لاتے ہیں اور بول چال کا حسن پیدا ہو جاتا ہے، جیسے دوسرے شعر میں یا اس مصرعے میں ''ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا''۔ اس طرح اب بھی بولتے ہیں، مگر غالب اور مومن کے یہاں ''یاروں'' کا یہ استعمال مجھے یاد نہیں آتا کہ کہیں موجود ہے۔ پانچوں اشعار کس کھلی ڈھلی زبان میں ہیں۔ ان اشعار کو پڑھ کر زبان چٹخارے لیتی ہے۔ اس رنگ میں کہنا بظاہر سہل معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے لیے بڑی مشق چاہیئے اور بہت سلیقہ۔

ہوش و خرد گئے نگہ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے اپنی بات سو دیوانہ پن کے ساتھ
جنوں کے جیب دری پر ہیں خوب چلتے ہاتھ
سلوک سینہ سے بھی کچھ تو کرلے چلتے ہاتھ

دونوں مطلعوں میں ردیف جس کینڈے سے دوسرے مصرعے میں بندھی ہے وہ ذوق کا حصہ ہے۔ یہ ردیفیں بھی ٹھیٹھ اردو کا ٹھاٹھ دکھاتی ہیں۔ ''کچھ تو کر لے چلتے ہاتھ''، ایسی زبان جس میں نثر موزوں کا لطف ہو، ذوق اور ان کے مقلدین ہی کا حصہ ہے۔

رقعہ ہے چوری کا اور بھیجا ہے انجان کے ہاتھ
یا الٰہی کہیں پڑ جاوے نہ دربان کے ہاتھ

ایک بار نامہ و پیام میں ایسی ہی غلطی مجھ سے ہو گئی تھی۔ فراق

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

میر کا شعر:—
میر عمداً بھی کوئی مرتا ہے جان ہے تو جہان ہے پیارے

کچھ اسی قسم کے الفاظ سے بنا ہے جن سے ذوق کا مطلع۔ لیکن ذوق کا شعر لطف زبان سے آگے نہیں بڑھتا اور میر کے شعر میں تو

ماورائی نرمی نے اس شدت کا اثر بھر دیا ہے جسے بیان کرنے کو الفاظ نہیں ملتے ۔

ترے کوچے کو وہ بیمار غم دارالشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے ، جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اسکی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

ذوق کے کلام کے وہ تمام صفات جو اب تک ہم آپ دیکھتے آئے ہیں ان اشعار میں بھی جھلک رہے ہیں ۔ کچھ منچلے چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مقطع میں در پردہ غالب کی مشکل گوئی پر چوٹ ہے ۔

لیتے ہی دل جو عاشق دلسوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

ذوق کا پنچائتی طرز بیان ، یہاں معجزہ کی حد تک پہونچ گیا ہے ۔

رخصت اے زنداں ! جنوں زنجیر در کھڑ کائے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

غزل اچھی خاصی ہے لیکن جتنی مشہور ہونی چاہئیے اس سے زیادہ مشہور ہے ، اور اشعار نظر انداز کرتا ہوں ۔ مقطع خوب کہا ہے ۔ موت اور انتظار دوست ؟ لیکن کیا کوئی جواں مرگ بھی اگر مرتے وقت تک ہوش و حواس میں رہے تو دوست کی راہ دیکھے گا ؟ شاید ایسا ہونا نا ممکن نہیں ۔ مرض الموت سے بچ کر یہ تو میرا تجربہ ہے کہ ہوش آتے ہی اگر آنکھوں نے کسی کو ڈھونڈھا تو محبوب کو ۔

نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانب در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

ذوق کا ایک مقطع زبانوں پر یوں چڑھا ہؤا ہے :—

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

شعر بہت رواں دواں ہے لیکن آزاد کے مرتبۂ دیوان ذوق کا جو نسخہ میرے پاس ہے اس میں یہ شعر یوں ہے -

اے ذوق رہ عشق میں ہے خضر و مسیحا
ہمدم جو نکل آئے کوئی گرد سفر سے

دوسرے مصرعے میں گرد سفر کے ٹکڑے نے شعر میں ایک تہہ گیری (خواہ وہ خارجی کیوں نہ ہو) پیدا کر دی ہے اور ''نکل آئے'' کے ٹکڑے نے ایک خوشگوار اچانک پن پیدا کر دیا ہے -

خوب روکا شکائتوں سے مجھے
تونے مارا عنائتوں سے مجھے
کیا کہوں کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ
غیر تیری حمائتوں سے مجھے
بات قسمت کی ہے کہ لکھتے ہیں
خط وہ کن کن کنائتوں سے مجھے
واجب القتل اس نے ٹھہرایا
آئتوں سے روائتوں سے مجھے
حال مہر و وفا کہوں تو کہیں
نہیں شوق ان حکائتوں سے مجھے
سمجھے ہے واجب الرعایت دوست
دشمنوں کی رعائتوں سے مجھے
کمئی گریہ نے جلایا دل
ہؤا نقصان کفائتوں سے مجھے
لے گئی عشق کی ہدایت ذوق
اس سرے سب نہائتوں سے مجھے

کس ھلکے پھلکے انداز میں پوری غزل کہہ ڈالی ھے۔ مطلع لا جواب ھے، بغیر کاوش اور ٹیس کے بھی ھر شعر کی نرم چٹکی لطف دیتی ھے۔ سہل ممتنع کی مثال یہ اشعار نہیں ھیں لیکن اس سہل بیانی کی مثال ضرور ھیں جس پر قدرت حاصل کرنا مشکل ھے۔ پوری غزل میں کیا سلاست ھے کیا روانی ؟ پانچویں شعر میں ''حال مہر و وفا'' کا ٹکڑا مثنوی مہر و وفا کی طرف دھیان لے جاتا ھے جو فارسی کی ایک عمدہ مثنوی ھے اور ان دنوں ہندوستان میں کافی رائج تھی۔ مقطعے میں ''نہائتوں'' کا قافیہ استادانہ ھے۔ ایسے ھی اشعار کی سہل بیانی داغ کے ھاتھوں اور چمک جانے والی ھے۔

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اس کی فروتنی ھے
وگرنہ قندیل عرش میں بھی اسی کے جلوے کی روشنی ھے
ھوئے ھیں اس اپنی سادگی سے ھم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ھو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ھے نہ دشمنی ھے

ذوق کے فلسفیانہ اشعار میں وہ نہیں، وہ رمزیت، وہ تحیر کے عناصر نہیں جو غالب و میر، خصوصاً میر کے فلسفیانہ اشعار میں ھیں۔ لیکن فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین کو صریحی انداز بیان کے ساتھ ذوق نہایت حسن و خوبی سے اور کافی شد و مد سے بیان کر جاتے ھیں۔ پنچائتی افتاد طبع استادانہ قدرت بیان سے مل کر ذوق کو اس کا موقع دیتی ھے کہ بلند خیالات اور گہرے حقائق کو وہ قبول عام و پسند عام کے مطابق ظاھری محاسن شاعری سے سجا کر نظم کر دیں۔ ذوق کو خیالات کے عام فہم بنانے اور ان کی اشاعت کرنے کا خاص ملکہ ھے۔ کسی کا قول ھے کہ ذوق کے درسی و اخلاقی اشعار کو ترتیب دیا جائے تو اخلاقی کلیوں کا ایک سسٹم مرتب ھو سکتا ھے۔

دیکھو اس چشم مست کی شوخی
جب کسی پارسا سے لڑتی ھے

اور اس شعر کی شوخی بھی دیکھو ! پھر انہی دبی چنگاریوں کا داغ کے دامن کی ھوا سے بھڑک اٹھنا بھی کلام داغ میں دیکھو !

ہے تیرے کان زلف معنبر لگی ہوئی
رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی
منہ سے لگا ہؤا ہے اگر جام مے تو کیا
ہے دل سے یاد ساقی، کوثر لگی ہوئی

اے ذوق اتنا دختر رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اردو ردیف کے پہلو محاوروں اور روز مرہ کے برجستہ استعمال سے چمکائے گئے ہیں - غالب کی بزلہ سنجی اور شوخی میں خیال کی چٹکیاں ہوتی ہیں ، اندر سے داخلی طور پر گدگدی پیدا ہوتی ہے - ذوق کے یہاں صرف بول چال کی چٹکیاں ہوتی ہیں ، زبانی چھیڑ چھاڑ میں جو محاورے یا زبان کے ٹکڑے لائے جاتے ہیں ان کا بر محل استعمال ہوتا ہے - ردیف اور قافیے اس باب میں خصوصاً ان کے لیے مدد گار ثابت ہوتے ہیں - ایک سطحی گدگدی پیدا ہو جاتی ہے اور ایک سطحی فرحت - لال قلعہ کی زندگی اب اسی بھرےمیں رہ گئی تھی یعنی باتوں میں الجھ کر رہ گئی تھی -

مجھ سے کچھ پوچھو نہ خونابۂ حسرت کے مزے
زھر کے گھونٹ ھیں پر رکھتے ھیں شربت کے مزے

تجھ کو کچھ یاد بھی ھیں پہلی محبت کے مزے
بے مزہ ہونے کے لطف اور شکایت کے مزے

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

بات ، بات ، بات اور کچھ نہیں ، انفرادی جذبات و محسوسات لاپتہ ، مگر بات میں وہ روانی کہ ایک بار تو سن لینا ھی پڑتا ہے - بنچ‌ائتی خیالات بھی خوش سلیقگی سے سب سے کہاں ادا ہوتے ہیں -

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

گئے جنت میں اگر سوز محبت والے
تو یہ جانو رہے دوزخ ھی میں جنت والے

ساقیا هوں جو صبوحی کی نہ عادت والے
صبح محشر کو بھی اٹھیں نہ ترے متوالے

رہے جوں شیشۂ ساعت وہ مکدر دونوں
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

کس مرض کی ہیں دوا یہ لب جاں بخش ترے
جاں بلب ہیں ترے آزار محبت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدر وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش
دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

بے نصیبوں کے نصیبوں میں کہاں یار کا وصل
ان کی قسمت میں ہے جو لوگ ہیں قسمت والے

تو مرے حال سے غافل ہے پر اے غفلت کیش
ترے انداز تغافل نہیں غفلت والے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز نزاکت والے

شعر ڈھلتے چلتے گئے ہیں ۔ ہر شعر صفائی اور مشاق کی مثال ہے۔ یہاں ضرب المثل باندھی نہیں گئی ہے ایکن کئی اشعار خود ضرب المثل بن گئے ہیں۔ ذوق کو اور چاہیے کیا ؟

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

یقیں ہے صبح قیامت کو بھی صبوحی کش
اٹھیں گے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے

چمن بھی دیکھتے گلزار آرزو کی بہار
تمہاری یاد بہاری میں آرزو کرتے

سراغ عمر گزشتہ کا لیجیے گر ذوق
تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

اپنے رنگ میں روائتی خیالات باندھتے باندھتے مقطعے کی ردیف میں ذوق نے ایک لہک پیدا کر ہی دی ، اور نئے انداز سے ردیف لے ہی آئے۔ روح شاعری کے شاید یہ انداز منافی ھے لیکن لطف زبان سے کون انکار کر سکتا ھے۔ داغ اور آتش تو کبھی کبھی ردیف اور قافیے کے پہلو بدل کر شعریت بھی پیدا کر لیتے ھیں۔ مصحفی کے بھی کئی اشعار میں ، جو مصحفی والے مضمون میں درج ھیں یہ بات ملے گی۔ وہ بھی ردیف کو محاوروں کے ساتھ بسا اوقات ملا دیتے ھیں۔

اس سنگ آستاں پہ جبین نیاز ھے
وہ اپنی جا نماز ھے اور یہ نماز ھے
ناساز ھم سے جو ھے اسی سے یہ ساز ھے
کیا خوب دل ھے واہ ھمیں جس پہ ناز ھے
پہنچا ھے شب کمند لگا کر کہاں رقیب
سچ ھے حرامزادے کی رسی دراز ھے
اس بت پہ گر خدا بھی ھو عاشق تو آئے رشک
ھر چند جانتا ھوں کہ وہ پاک باز ھے
اے ذوق کیوں نہ سب پہ کھلے تیرا راز عشق
جو نالہ ھے کلید در گنج راز ھے

تیسرے اور چوتھے شعر کے دوسرے مصرعوں کی داد دیجیے۔ یہ طربیہ انداز غالب و مومن کا کاھے کو ھونے لگا ، مگر ذوق کے اسلوب سے ھم آھنگ ھونے پر مزہ دے ھی جاتا ھے۔

سنا کرتے تھے شہرہ ذوق جن کی پارسائی کا
وہ سب یار خرابات اپنے نکلے ھم نشیں نکلے

''اپنے نکلے ، ھم نشیں نکلے'' ، کیا ٹکڑے ھیں !

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے
ھنستے تو ھیں پر تیری ھنسی کو نہیں پاتے
ھم تم سا عدو اپنا کسی کو نہیں پاتے
تم ھم کو جو پاؤ تو چھری کو نہیں پاتے

وہ کون سی شے ہے جسے پاتے نہیں دل میں
لیکن نہیں پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے
میں ایسا ہؤا گم کہ عزیزان عدم بھی
گم ہو کے مری گم‌شدگی کو نہیں پاتے
رکھتے ہیں دم شعلۂ فشاں اژدر دوزخ
لیکن مری آتش نفسی کو نہیں پاتے

یہاں بھی اشعار کے عام لب و لحجہ ہیں لیکن خصوصاً ردیف و قافیہ میں آردو زبان کا چہرہ نکھرتا ہؤا نظر آ رہا ہے۔ ذوق کے ہاتھ عروس اردو کے چہرے پر گویا غازہ مل رہے ہیں۔ دلی میں ہر خاص و عام اپنی بولی کا نکھار دیکھ کر لہک لہک اٹھا ہوگا۔ چوتھے شعر کے دوسرے مصرعے میں ''نہیں پاتے'' کے ٹکڑے میں زبان نے پہلو بدل دیا اور محاورہ و روزمرہ کا مزہ شعر میں پیدا ہو گیا۔

خط بڑھا، کاکل بڑھی، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

مغل دربار میں بار یابی اور رسوخ کے لیے جو باھمی چشمک ہندو مسلمانوں میں ہوتی چلی آتی تھی اس کی یاد مطلعے کا دوسرا مصرعہ دلا رہا ہے۔ دوسرے شعر میں ''رکتا ہے دل''، کتنا اچھا فقرہ ہے! رکنا اور رکاؤ وہ الفاظ ہیں جنہیں ذوق خاص حسن سے صرف کرتے ہیں۔ ''کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے''، کے فقرے میں ٹھیٹھ آردو کا لطف دیکھیے! عام بول چال کو شعر میں یوں کھپا دینا ہی ذوق کے کلام کی استادانہ شان و سند ہے۔

ثبات کب ہے زمانہ کے عزو شاں کے لیے
کہ ساتھ اوج کی پستی ہے آسماں کے لیے*

---

*پہلا مصرع اس مطلع کا یوں بھی دیکھا ہے۔
نہیں ثبات بلندئی عزوشاں کے لیے فراق

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لیے
کہ یہ چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لیے
ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لیے
ستم شریک ہؤا کون آسماں کے لیے
صبا ہے آئی خس و خار گلستاں کے لیے
قفس میں لوٹ رہا ہے دل آستاں کے لیے
دکان حسن میں رکھتے نہیں متاع وفا
وگر نہ لیتے ہم اک اپنے مہرباں کے لیے
نہ دینا ہاتھ سے تم راستی کہ عالم میں
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے
نگاہ ناز نے دیکھے تھے جوہر آج اپنے
دل اپنا ہم کو بڑی یاد آیا امتحاں کے لیے
مزاج ان کا نہ بجلی ہے اور نہ ہے سیماب
خطر جو ہے تو یہی ہے مزاج داں کے لیے
چلیں گے دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم
شکست توبہ لیے ارمغاں، مغاں، کے لیے
اشارہ چشم کا تیری یکایک اے قاتل
ہؤا بہانہ مری مرگ ناگہاں کے لیے

بنایا ذوق جو انساں کو اس نے جزو ضعیف
تو اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لیے

غالب اور مومن دونوں کی غزلیں اس زمین میں مشہور ہیں۔ ذوق نے بھی سو فیصدی اپنی شان قائم رکھی ہے۔

جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے
زہراب یا شراب یہاں سب ہے نوش جاں
ساقی پیالہ منہ سے ہم اب تو لگا چکے
یاد آیا یاں کے آنے کا وعدہ بھی خوب انہیں
جب رات کو وہ پاؤں میں مہندی لگا چکے
مدت سے موت و زیست پڑے ہیں گلے کا ہار
تیغ نگہ تری کہیں قصہ چکا چکے

تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی
ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

مسجد میں بیٹھے کیا ہو چلو میکدہ کو ذوق
اٹھو کہیں وظیفہ بہت بڑ بڑا چکے

محبوب نام ایک خواجہ سرا قلعۂ دلی میں بہت بارسوخ ہو گیا تھا ، بے علم بے لیاقت ، بیہودہ ، سفید سیاہ ، موقوفی ، بحالی سب اس خواجہ سرا کی زبان پر تھی - دھاوتی جواری بھی تھا - شرفا ، امرا ، خاص و عام سب اس سے تنگ آ گئے تھے - ایک بار اس نے مشہور کر دیا کہ وہ حج کو جانے والا ہے ، کیونکہ بادشاہ بھی اس سے ناراض ہو گئے تھے - ذوق نے مطلع میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کمبخت کو نہ آنا تھا نہ جانا تھا ، محض باتیں تھیں - غزل کے ہر شعر میں ذوق کے کلام کی شان ، سلاست ، روانی ، اردوپن ، سب نمایاں ہیں -

چپکے چپکے غم کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جی ہی جی میں تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ابر کیا ، آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برق کیا ہے ، تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جب کہا مرتا ہوں ، وہ بولے میرا سر کاٹ کر
جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
ہم نے پہلے ہی کہا تھا تو کرے گا ہم کو قتل
تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
کیا ہؤا اے ذوق ہیں جو مردمک ہم رو سیاہ
لیکن آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ابھی میں لڑکا ہی تھا کہ ایک دن اس غزل کا تیسرا شعر مجھے میرے پھوپھی زاد بھائی راج کشور لال سحر نے سنایا - مجھے برا بر‌ا لگا - اس ہلکے پھلکے طریقے سے قتل کرنے کا تصور شعر کی بزلہ سنجی سمیت مجھے خوشگوار نہیں معلوم ہؤا - شعر کی اور شعر میں جس کام کی طرف اشارہ ہے اس کی برجستگی کا احساس مجھے اس وقت بھی ہؤا تھا ، لیکن برجستگی بیان کا یہ استعمال غلط اور بے موقع اور نامناسب

معلوم ہؤا ۔ بات آئی گئی ہوگئی ، اب تو اسے مدتیں گذرگئیں ۔ اس غزل کو اب دیکھتا ہوں تو اس کی حسین سطحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ۔ شاعری، بنی ہو یا بگڑی ہو ، اس غزل میں ذوق کے عام کلام کی طرح زبان تو بن ٹھن گئی ہی ہے !

جو کچھ کہ ہے دنیا میں وہ انساں کے لیے ہے
آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لیے ہے
بیٹھا ہے سخنور جو گرفتار تفکر
زیبا یہ قفس مرغ خوش الحاں کے لیے ہے
اپنوں سے نہ مل، اپنے ہیں سب اپنوں کے دشمن
ہر نے میں بھری آگ نیستاں کے لیے ہے
دل بھی ہے مرا جان تری مشق ستم کی
جو تیر ہے اس تودۂ طوفاں کے لیے ہے
دل قید تعلق سے نکل سکتا نہیں ذوق
کیا در نہیں اس خانۂ زنداں کے لیے ہے

اخلاقی فلسفیانہ مضامین کس ہلکے پھلکے اور بے لاگ طریقے سے ذوق ان اشعار میں باندھ گئے ہیں ۔ دماغ کو یہ اشعار سنکر اور سمجھ کر ایک ہلکا سا انبساط ملتا ہے ۔

پڑے تفرقے یہ جدائی سے تیری
کہ میں ہوں کہیں ، دل کہیں ، جاں کہیں ہے

دوسرے مصرعے کی روانی و سلاست مسلم ہے ۔ شعر اچھا ہے اور بہت صاف ہے ، لیکن کیا میر کے اس کمبخت مطلع کو اسی وقت یاد آنا تھا :—

کیا میں بھی پریشانئی خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دل غم دیدہ کہیں تھا

میر بڑے بڑوں کے شعر خراب کر دیتا ہے ۔ خدا نہ کرے کہ میر کے کسی اچھے شعر کی پرچھائیں کسی کے اچھے شعر پر پڑ جائے !

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزاریا اسے رو کر گزار دے

اب تک یہ شعر زبانوں پر ہے۔ مگر نہ جانیں کیوں جب جب یہ شعر میں نے سنایا یا یاد کیا غالب کا یہ شعر بھی یاد آ گیا اور ذوق کے شعر کا مزہ کم ہو گیا۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

اگرچہ ذوق کچھ کہہ رہے ہیں اور غالب کچھ اور۔

کافر عشق ہوں گر سر بھی جدا ہو تن سے
نکلے زنار محبت نہ مری گردن سے

میں گر انبار محبت، مراخوں بھی ہے گراں
جی دھڑکتا ہے تری نازکئی گردن سے

چشم میگوں، صراحی بہ بغل، جام بکف
دیکھنا آج وہ گل آتا ہے کس جوبن سے

سجے سجائے، رچے رچائے اشعار ہیں۔ تیسرا شعر حافظ کی یاد دلاتا ہے۔

فلک تو ٹیڑھ ھی کی صبح سے تا شام چلتا ہے
مگر سیدھی نظر سے تیرا اپنا کام چلتا ہے

"ٹیڑھ ھی کی چلنا" میں زبان کی اٹھلاہٹ اور اچپلاہٹ دیکھیے، داغ کے یہاں بھی ٹیڑھ کا لفظ آیا ہے اور خوب آیا ہے:—

بھر دی ہیں کیا ادائیں اس شوخ سیم تن میں
اک ٹیڑھ سادگی میں اک سیدھ بانکپن میں

پھولا نہیں سماتا جو گل پیرھن میں ہے
آتا یہ کس بھروسے پہ ہنستا چمن میں ہے

رنگیں ہے آج کل کے گل نو بہار سے
اگلا جو برگ زرد کوئی اس چمن میں ہے
وہ دل کہ لا نہ سکتا تھا چین جبیں کی تاب
زیر شکنجہ زلف شکن در شکن میں ہے

مطلع تو خیر یونہی سا ہے، لیکن اگلے وقتوں کی دلی کی شان جس تیور سے دوسرے شعر میں ذوق نے بیان کی ہے وہ دیکھنے کی چیز ہے۔ تیسرے شعر میں بھی عشقیہ مضمون استادانہ شان سے رچے ہوئے انداز میں بندھا ہے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے

کہا جاتا ہے کہ ذوق کے اس شعر پر غالب سر دھنتے تھے۔ دوسرا مصرعہ یوں بھی مشہور ہے ''مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے''، غالب دوسرا مصرعہ کہتے تو یونہی کہتے، کیونکہ اس طرح بندش چست ہو جاتی ہے۔ لیکن ''مر گئے پر'' اور ''نہ لگا جی''، ان ٹکڑوں میں اردو زبان کی ایک مخصوص شان ہے۔ ذوق نے یونہی کہا ہوگا، جیسا یہ شعر اوپر درج ہے اور جیسا دیوان ذوق مرتبہ آزاد میں بھی ہے۔ ذوق کا یہ مطلع ایسا ہے جو کسی زبان کی شاعری میں بھی بڑے سے بڑا شاعر ہی کہہ سکتا تھا۔ اور یوں تو معلوم ہوتا ہے کہ شعر نہیں کہا ہے محض ایک بات کہی ہے۔ شیکسپیر کے مشہور المیہ ہیملیٹ میں اسی قسم کا خیال ظاہر کرتے ہوئے ہیملیٹ نے اپنے کو خودکشی سے روکا ہے۔ ''موت کی نیند میں نہ جانے کیسے خواب دکھائی دیں، یہ سوچ کر ہم خودکشی کرتے کرتے رک جاتے ہیں''۔

کوئی ان تنگ دہانوں سے محبت نہ کرے
اور یہ تنگ کریں منہ تو شکایت نہ کرے
بن جلے شمع کے پروانہ نہیں جل سکتا
کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نہ کرے

''تنگ کریں منہ'' یعنی منہ بنائیں یا ترش روہوں۔ رواں دواں

مطلع ہے، دوسرے شعر پر فارسی کا مصرعہ ''عشق اول دردل معشوق پیدامی شود'' اور آرزو کا شعر یاد آتا ہے :-

حسن اور عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اُڑ کے چلا پروانہ بھی

لیکن جس خاموش انداز سے ذوق نے ''کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نہ کرے'' کہا ہے (خاص کر ''سبقت نہ کرے'' کا فقرہ) وہ حسرت موہانی کی معجز نما سہل بیانی کی یاد لاتا ہے۔ شعر خوب ہے۔

کہتے ہیں جھوٹ سب کہ نہیں پاؤں جھوٹ کے
جھوٹے تو بیٹھتے بھی نہیں پاؤں ٹوٹ کے
کیونکر حباب ہو سکے دریائے بیکراں
دریا سے جب تلک نہ ملے پھوٹ پھوٹ کے

ٹوٹی پھوٹی زمین کو ہموار کر دیا ہے، مصحفی کی یاد آتی ہے۔

زباں کھولیں گے مجھ پر بد زباں کیا بد شعاری سے
کہ میں نے خاک بھر دی اُن کے منہ میں خاکساری سے
نہیں آتا نہ آئے رحم اے ذوق اس ستمگر کو
بلا سے خوش تو ہو جاتا ہے میری آہ و زاری سے

معمولی اشعار ہیں لیکن بہت صاف۔

یار ہنسنے حال پر ہم دل فگاروں کے لگے
کاش کے ایسے ہی یارب دلکو یاروں کے لگے

''ایسے ہی یارب دل کو یاروں کے لگے''، بہت خوب۔ آمین !

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

غالب تو یہ شعر کہتے ہی نہیں۔ مومن ممکن ہے کہہ جاتے، لیکن یہ طرز ذوق ہی کا ہے۔ عام طرز گفتگو سانچے میں ڈھل گئی ہے دوسرے مصرعہ میں۔

نیچے جس غزل کے کچھ اشعار دیئے جاتے ھیں ، اس غزل پر آزاد کا یہ مختصر نوٹ کتنا بھلا معلوم ھوتا ھے - کہتے ھیں کہ یہ غزل ''ابتدائی مشق کی ھے - ردیف کو دیکھو ، عہد مذکور کا محاورہ سناتی ھے'' -

ملنا ھمارا ان کا تو کب جائے جائے ھے
البتہ آدمی ، سو کبھو آئے جائے ھے
جو اس گلی میں مثل صبا آئے جائے ھے
فردوس میں کب اس کو تمنائے جائے ھے
لکھوا کے بھیج دیتا ھے اک پرچہ گاہ گاہ
دل کو ذرا ذرا مرے پر چائے جائے ھے
فوارہ سے بجا ھے تو اضع کا سیکھنا
اس سر کشی پہ سر کو وہ نہوڑائے جائے ھے
سو کوس کیا! نہ جا سکے مجنوں تو دو قدم
پر شوق مدعا ھے کہ دوڑائے جائے ھے

کچھ نہیں چاھئیے تجہیز کا اسباب مجھے
عشق نے کشتہ کیا صورت سیماب مجھے
اس نے مارا رخ روشن کی دکھا تاب مجھے
چاھئیے میرے لیے چادر مہتاب مجھے
سفر عمر ھے یارب کہ ھے طوفان بلا
ھر قدم سیل حوادث کا ھے گرداب مجھے
ھو گیا جلوۂ انجم مری آنکھوں میں نمک
کیونکہ آئے شب ھجراں میں کبھو خواب مجھے

مضمون آرائی ذوق کے مطلع کی قابل تعریف ھے لیکن آتش کا مطلع ذوق کے مطلع کو مٹا کر رکھ دیتا ھے :-

موت مانگوں تو ملے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

ذوق کے پتلے اور سطحی رنگ کی یہ غزل بری مثال نہیں ھے ، کچھ لکھنئو کا رنگ بھی اس غزل میں جھلک رھا ھے - یعنی لفظی

تناسب ، ایہام ، تمثیلی انداز بیان وغیرہ ، "ہو گیا جلوۂ انجم مری آنکھوں میں نمک" - خوب !

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
کم ہوں گے اس بساط پہ ہم ایسے بد قمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے
ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے
نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہ ہی ہو
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے
دنیا نے کس کا راہ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے
جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے باد صبا اب کبھی چلے

زندگی اور موت پر سامنے کی بات کس بے لاگ طریقے سے کہہ گئے ہیں - مطلعے کے بعد جتنے اشعار ہیں ان میں قافیہ اور ردیف دونوں کو نئے نئے پہلوؤں سے باندھا ہے -

لیا ایمان و دیں تو نے اگرچہ اک زمانے سے
نہیں اس پر بھی اے ظالم ترا ایماں ٹھکانے سے
ستمگر تو نے روکا سب کو میرے پاس آنے سے
اجل بھی اب یہاں آئے تو آئے کس بہانے سے
نہ کیجئے خوان دوں ہمت پہ ہاتھ اے ذوق آلودہ
کہ یہ کھانا مرے آگے ہے بہتر زہر کھانے سے

ردیف اور قافیہ سے ہر شعر میں کھیل رہے ہیں اور ہنسی کھیل میں کچھ باتیں کہہ گئے ہیں -

اگر ہوتے ہو تم برہم ابھی سے
تو پھر ہوتے ہیں رخصت ہم ابھی سے

لگے کیوں تم پہ مرنے ہم ابھی سے
لگایا جی کو اپنے غم ابھی سے
موا جانا مجھے غیروں نے اے ذوق
کہ پھرتے ہیں خوش و خرم ابھی سے

یہاں بھی ردیف اور قافیے شعر کہلوا رہے ہیں - نرم آھنگ ، نثرئیت ، سبک روفقرے ، رسمی طنز ، موزونیٔ طبع کے نمونے یہ اشعار بھی ہیں - اردوئے محض یا ٹھیٹھ اردو کی ایسی مثالیں پیش کرنے کی طرف غالب و مومن مائل ہی نہیں ہوتے -

خدا کی خدائی اگر آگے آئے
وہ کافر کسی کو نہ موجود سمجھے

آتے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سنائی
رہ جاؤں سن نہ کیونکر یہ تو بری سنائی
جس بات پر تمہاری سب غش ہیں ہم سے پوچھو
ہم کہویں آنکھوں دیکھی وہ سب سنی سنائی
کہنے نہ پائے اس سے ساری حقیقت اک دن
آدھی کبھی سنائی ، آدھی کبھی سنائی

اردو ، محض اردو ، ٹھیٹھ اردو ، شعریت نہ ہو نہ سہی -

اک صدمہ درد دل سے مری جان پر تو ہے
لیکن بلا سے یار کے زانو پہ سر تو ہے

میر کا شعر ہے جس کا میر کے نشتروں میں شمار نہیں ہے لیکن ذوق کے بزلہ سنجانہ مطلعے کے مقابلے میں میر کا شعر تاثیر ترنم اور سوز و گداز کی تصویر ہے -

مرا سر نزع میں زانو پہ رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
کہ اے بیمار میرے تجھ پہ جلد آسان ہو مر جانا

خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے
بتو نہ بن کے نظر آؤ تم بہار مجھے

نظر جو لطف کی ہے روز وصل پر موقوف
تو کرنا کیا تھا نظر بند انتظار مجھے
ہوائے وادیٔ وحشت مجھے موافق تھی
دکھا رہے ہیں چمن کی یہ کیا بہار مجھے

ذوق کا مطلع دیکھ کر غالب کا یہ شعر دیکھیے :—

فراق یار میں تکلیف سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

دوسرے شعر میں ''نظر بند انتظار'' اچھی ترکیب ہے۔ تیسرا شعر سلاست و روانی کا نمونہ ہے۔

مرض عشق جسے ہو اسے کیا یاد رہے
نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے
تم جسے یاد کرو پھر اسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے
قتل عاشق پہ کمر باندھی ہے اے دل اس نے
پر خدا ہے کہ اسے نام مرا یاد رہے
جب یہ دیندار ہیں دنیا کی نمازیں پڑھتے
کاش اس وقت انہیں نام خدا یاد رہے
ہم پہ سو بار جفا ہو تو رکھو ایک نہ یاد
بھول کر بھی کبھی ہووے تو وفا یاد رہے

حالی کا مطلع ہے :—
جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا اگر کل نہ لیا یاد رہے

ذوق کی یہ غزل ان کے مخصوص رنگ میں بہت کامیاب ہے۔ زمین بھی ایسی ہے کہ بندش میں ڈھیلا پن یا سستی نہیں آنے پائی۔ خوب رواں دواں شعر کہے ہیں۔ آخری شعر میں کتنی سچی شکایت ہے۔

تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے
کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے
پارہ کی جگہ کشتہ اگر ہو دل بیتاب
پھر آپ ہی اکسیر ہے اکسیر میں کیا ہے
یہ غنچۂ تصویر کھلا ہے نہ کھلے گا
کیا جانے دل عاشق دلگیر میں کیا ہے
زاہد کی طرف دیکھو نہ تم میرے دم ذبح
لو نام تم اللہ کا تکبیر میں کیا ہے

''کیا ہے'' کی ردیف کی کروٹیں ہر شعر میں دیکھتے جایئے۔

وہ جب واں بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے
صبا کے جھوکے یاں وقت سحر ایسے نہ ہوتے تھے

آج کتنے غزل گو ایسا مطلع کہہ سکتے ہیں ؟ معشوق ''واں'' رات بھر بے تکلف رہا ہے ۔(پہلے مصرعے میں ''بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے'' کے پر کیف ٹکڑے پر غور کریں) بے تکلف معشوق کے عریاں اور معطر بدن کو ، اس کے کھل کھیلنے کی اداؤں کو ، اس کی رنگینی، معصومی ، ہم آہنگی و سپردگی ، اس کی کھلتی ہوئی اور نکھرتی ہوئی محبوبیت کو چھوتی ہوئی، ان سب میں رس بس کر باد صبا کے جھوکے آج چل رہے ہیں - ہوا کے جھوکوں میں کچھ دیکھ کر شاعر سمجھ جاتا ہے کہ وہاں وہ رات بھر ''بے تکلف'' ہوتے رہے ہیں - کتنا لطیف احساس ہے اور کتنا پر کیف ! معشوق غیر کے یہاں رات بھر بے تکلف ہوتا رہا ہے اس سے جو جذبۂ رشک و رقابت پیدا ہؤا اسے شاعر نے کتنا پر اثر ، کتنا پاکیزہ ، کتنا پر سوز و ساز بنا دیا ہے اور کتنا مترنم - ''ایسے'' کا لفظ مصرعوں میں کتنی نرم لچک پیدا کر رہا ہے - ذوق نے اس شعر میں نظیری کے فن تغزل کا راز قریب قریب پا لیا ہے -

جب ترا شعلۂ رخسار نظر آتا ہے
سرد خورشید کا بازار نظر آتا ہے
جتنا بے ہوش ہؤا اتنا ہی سوا ہو آرام
مست ہاتھی ہو تو بے بار نظر آتا ہے

دیکھ کر اے بت مغرور یہ انداز ستم
شرم سے چرخ نگونسار نظر آتا ہے
دل نے ہے دیکھ لیا دفتر تقدیر تمام
فلک اک نقطۂ بیکار نظر آتا ہے

مطلعے پر آتش کی شعلہ بیانی کی کچھ پرچھائیں پڑ رہی ہے - دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی ذوق ہی کے ایک قصیدے کے مشہور مصرعہ کی یاد دلاتا ہے ، ''کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر''، مگر ''مست ہاتھی ہو تو بے بار نظر آتا ہے''، کا مصرعہ بھی ایک سماں کی تصویر کھینچ دیتا ہے - اور اشعار بھی استادانہ شان سے کہے گئے ہیں -

بزم میں ذکر مرا لب پہ وہ لائے تو سہی
وہیں معلوم کروں ہو نٹھ ہلائے تو سہی

دیکھیے اردو کی بولی ٹھولی ! غالب اور مومن اس انداز سے بچتے ہیں لیکن آتش نے زبان کے اسی تیور سے چنگاریاں آڑا دی ہیں -

سب کو دنیا کی ہوس خوار لئے پھرتی ہے
کون پھرتا ہے یہ مردار لیے پھرتی ہے

اس زمین میں آتش کی غزل بھی ہے اور اثر ، شاگرد آتش کا یہ مشہور مطلع بھی ہے :-

حسن کی جنس خریدار لیے پھرتی ہے
ساتھ بازار کا بازار لیے پھرتی ہے

کون وقت اے وائے گذارا جی کو گھبراتے ہوئے
موت آئی ہے اجل کو یاں تلک آتے ہوئے

داغ کا مصرعہ ہے :-

اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

ساتھ تیرے ہم بھی جوں سایہ مقرر جائیں گے
آگے جائیں ، پیچھے جائیں، جائینگے ، پر جائیں گے

اردو کی بولی ٹھولی ! دل کے ساتھ زبان کا بھی مچلنا دیکھیے ۔

جو دل نہ کشمکش طرۂ دوتا میں پڑے
تو پھر بلا کو غرض ہے کوئی بلا میں پڑے

''کشمکش طرۂ دوتا'' استادانہ ترکیب ہے ، اور دوسرا مصرع داغ کی یاد داغ سے پہلے دلا رہا ہے ۔

مقابل اس رخ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

خاندان دبیر کے شاعر اوج نے غالباً اس شعر کا جواب کہنے کی کوشش کی تھی ۔ آزاد کو سنایا ۔ آزاد نے اوج کے شعر پر تعریف کے پردے میں اعتراض کر دیا ۔ اوج نے کہا ۔ ''بھئی شاگرد تھے ہماری بات ھی بگاڑ دی ۔*

ہم ہیں غلام ان کے جو ہیں وفا کے بندے
اس کو یقین کرنا گر ہو خدا کے بندے

ذوق کا مطلع خاص کر دوسرا مصرعہ کلام داغ کے تیور کی تخلیق کر رہا ہے ۔

ہم بتوں کو اپنے جذب دل سے کھینچے جائیں گے
پر بڑے پتھر ہیں یہ مشکل سے کھینچے جائیں گے

استادانہ مطلع ہے ۔ میر بھی کبھی کبھار ایسے ٹھٹھول کر جاتے ہیں ۔

---

*آب حیات ، تذکرۂ ذوق

بوسۂ یار لے کے منہ موڑا
بھاری پتھر تھا چوم کر چھوڑا

میر

کام لیجئے گا اور ہی دانائی سے
ناصحو جاؤ نہ لپٹو کسی سودائی سے

شعر پڑھیے اور داغ کی یاد کیجئے۔

کون سے دن نگہ تیز نہ خونریز رہی
مجھ پہ ظالم تری ہر روز چھری تیز رہی

پھر داغ کی یاد کیجئے۔

جو دل سے اپنے دم آتشیں نکل جائے
فلک کے پاؤں تلے سے زمیں نکل جائے

زبان بھی خوب ہے اور شعر بھی بہت خوب ہے۔

پلا مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

اس مطلعے میں ذوق اپنے مکمل رنگ میں جلوہ گر ہیں۔

کیا ہم سخنی کرتا ہے اس گل کے دہن سے
غنچہ سے یہ کہہ دو کہ چٹخ جائے چمن سے

"چٹخ جائے چمن سے"، کیا کہنا! کیا چٹپٹی اردو ہے۔

ہم اور غیر یکجا دونوں بہم نہ ہوں گے
ہم ہوں گے وہ نہ ہونگے وہ ہونگے ہم نہ ہونگے

گویا ذوق اور داغ دونوں کی آوازیں مل گئی ہیں۔ الفاظ کی تکرار اور الٹ پھیر کے اس اسلوب کو جناب نوح ناروی نے رگید مارا ہے۔

معلوم ہؤا بینی و ابروئے بتاں سے
اک تیر ہے گویا کہ چڑھا ہے دو کماں سے

پرانے قسم کی خارجی مثالیہ شاعری کی ایک دلچسپ مثال ۔

بیقراری کا سبب ہر کام کی امید ہے
نا اُمیدی سے مگر آرام کی اُمید ہے

اچھا خاصا شعر ہے ۔ حالی کا لاجواب شعر یاد آ گیا :-

بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ھجراں میں نہیں

دل گرفتار ہؤا یار کی عیاری سے
ہم گرفتار ہوئے دل کی گرفتاری سے

جس در پر یہ غل تھے کہ آتی کان پڑی آواز نہ تھی
عقل سحر اس در پر تھی حیران کھڑی آواز نہ تھی

"بے صدا ھو جائے گا یہ ساز ھستی ایک دن" ، دوسرے مصرعے میں شکست ناروا کا عیب ہے ۔ حیران کا لفظ دو لخت ھو گیا ہے ۔

کتنے مفلس ھو گئے کتنے تو نگر ھو گئے
خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ھو گئے

اب ہے جا زیر مغیلاں ترے دیوانوں کی
مدتوں چھان چکے خاک بیابانوں کی

الفت کا نشہ جب کوئی مر جائے تو جائے
یہ درد سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

رات جوں شمع کٹی ہم کو جو روتے روتے
بہہ گئے اشکوں میں ہم صبح کے ھوتے ھوتے

چاھیئے زر ان بتان سیم تن کے واسطے
یاں قلندر ھیں ، نہیں کوڑی کفن کے واسطے

پھر بہار آئی کف ہر شاخ پر پیمانہ ہے
ہر روش پر جلوۂ باد صبا مستانہ ہے

ہوتا نہ اگر دل تو محبت بھی نہ ہوتی
ہوتی نہ محبت تو یہ آفت بھی نہ ہوتی

مٹی سے اپنی مٹی جو تربت میں مل گئی
جو کچھ کہ تھی مراد محبت میں مل گئی

جنوں سے میرے مجنوں بھاگتا جیسے بگولا ہے
کہ میں صورت ہوں وحشت کی وہ یونہی اک ہیولا ہے

خاک اڑاتا دشت میں جب تیرا سودائی پھرے
پھر بگولا تو ہے کیا آندھی بھی بولائی پھرے

جس طرح ماھتاب ستاروں میں ایک ہے
یوں میرا مہ جبیں بھی ہزاروں میں ایک ہے

گل بھلا کچھ تو بہاریں اے صبا دکھلا گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

کیا کہوں اس ابروئے پیوستہ کے دل بس میں ہے
ایک طعمہ ، مچھلیاں دو ، کشمکش آپس میں ہے

موذن مرحبا بر وقت بولا تری آواز مکے اور مدینے

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

ان تمام اشعار میں ذوق اپنی شان سے جلوہ گر ہیں -

ذوق کے یہ اشعار کیسے لگتے ہیں ؟ ہمارے دل و دماغ پر جو یا جیسا اثر ان اشعار کا پڑتا ہے اسے کیونکر بیان کریں ؟ میں اب اپنے اندازہ کے مطابق ان اشعار کے اثرات و صفات کو جستہ جستہ پیش کرتا ہوں - ان میں ایک نمایاں بات نظر آتی ہے وہ یہ کہ اس انتخاب میں مطلعوں کی بھر مار ہے - جلدی میں میں نے ان اشعار کو گنا تو چار سو سولہ اشعار تھے اور ان میں مطلعے ہیں ایک سو انیاسی ، یعنی پینتالیس فیصدی - ذوق کی غزلوں سے جتنے انتخاب کئے جائیں گے ان میں ہر ایک کی یہ خصوصیت ہوگی کہ اانتخاب کے چالیس پچاس فیصدی مطلعے ہوں گے - ولی دکنی سے لے کر آج تک اکبر الہ آبادی کے سوا کسی

اُردو شاعر کی غزلوں سے ، جن کی تعداد ذوق کے مختصر دستیاب کلام سے بہت زیادہ ہے ، اشعار چنے جائیں تو اور اشعار کے مقابلے میں اتنے مطلعے ھاتھ نہ آئیں گے - ذوق کے جو اشعار لوگوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں اُن میں ذوق کے مطلعوں کی تعداد بہت زیادہ ہے ، اور تعداد سے قطع نظر ذوق کے دیگر اشعار سے نسبتاً ذوق کے بولتے ہوئے مطلعوں کی اہمیت بھی بڑھی ہوئی ہے - ان کے اکثر مطلعوں میں قافیوں اور ردیف کی تکرار آواز میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا کر دیتی ہے - بات یہ ہے کہ ذوق کے طرز سخن اور انداز اسلوب کو مطلعوں سے خاص مناسبت ہے - مطلعوں میں ان کی آواز کی چولیں بہترین انداز سے بیٹھتی ہیں - ذوق کے مصرعوں کی سلاست و روانی کا احساس سب کو ہوتا ہے - لیکن کچھ ہی لوگوں کو شاید اس کا نیم شعوری احساس ہؤا ہو کہ ذوق کی آواز میں ایک رقاقت یا پتلاپن اور ھلکاپن ہے - مطلعوں میں دہرے دہرے قافیوں اور ردیف سے آواز میں جو تکرار پیدا ہوتی ہے وہ پتلی اور ھلکی آواز کے بہاؤ میں روک تھام پیدا کر دیتی ہے - اس طرح روانی کے ساتھ ایک ٹھہراؤ یا جماؤ پیدا ہو جاتا ہے - جب مطلعوں میں آواز لہراتی یا ٹکراتی ہے تو اس میں ایک گاڑھاپن اور حجم سا پیدا ہو جاتا ہے اور ذرا سی چمک بھی - یہ رکاوٹ یا ٹھہراؤ فی نفسہ رقاقت ، ھلکے پن اور پتلے پن کی صفات کی ضد ہے ، جو ذوق کی آواز کی خصوصیت ہے ، اور یہی ضد ذوق کی آواز کو مطلعوں میں چمکا دیتی ہے ، اور اس آواز کو اُجاگر کر دیتی ہے - ذوق کے مطلعے ھندی کے ان دوھوں یا دوھروں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو عوام میں ضرب المثل بن گئے ہیں - مگر ذوق کے مطلعوں کی کامیابی کا تعلق صرف ذوق کی آواز سے نہیں ہے - اُن کے احساسات و خیالات و تاثرات میں ان کے شعور کی کیفیتوں میں بھی ایک ھلکاپن اور پتلاپن ہے ، ایک سبک گام و نرم آھنگ نثریت ہے - سونے پن کا نہیں مگر ایک خلا کا احساس ان کے تخئیل اور آواز دونوں میں ہوتا ہے - مطلع (Rhymed Couplet) ذوق کی افتاد مزاج کو اس لئے موافق آتا ہے کہ ان کی فکر کا انداز اس صفت کا پتہ دیتا ہے جسے انگریزی زبان میں کہتے ہیں (Witticism) یا (wit) ، یعنی بزلہ سنجی ، حاضر بیانی* ، یا برجستگی - اکثر ذوق کے مطلعے علم مجلس کی

---

*حاضر جوابی کے وزن پر حاضر بیانی - فراق

مثالیں پیش کرتے ھیں - اس طرح خواص و عوام دونوں کی دربار داری ھو جاتی ھے -

یہ محض اتفاق بات نہیں کہ ذوق اکثر و بیشتر ضرب المثل کو اپنے اشعار میں باندھ دیتے ھیں ، لیکن جس طرح کی ضرب المثل ذوق کے لئے کشش رکھتی ھے وہ عموماً طنز آمیز ھوتی ھے - شیکسپیر اپنے المیوں میں جب کسی کردار کے مکالمے یا خود کلامی (Soliloquy) کو ختم کرتا ھے تو بجائے نظم معرا کے مطلعے (Rhymedending) سے کام لیتا ھے - اس سے کبھی کبھی وہ طربیہ تسکین (Comic Relief) پیدا کر دیتا ھے - انگریزی شاعر پوپ نے تو تنہا مطلعوں کے ذریعوں سے اپنے فن کو چمکا دیا - ذوق کے مذاق میں بھی ھجو یا تضحیک یا سطحی بزلہ سنجی کا عنصر تھا - اس عنصر سے مطلع چمک جاتا ھے اور مطلع اس عنصر کو چمکا دیتا ھے - تین چوتھائی صدی کے بعد اکبر الہ آبادی نے اس رنگ کو بلیوں اچھال دیا - اکبر قافیوں کو بھان متی کے پٹارے سے نکالتے ھیں :-

دلکشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سر کشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ھنس کے بولی کہ تو پھر مجھکو بھی راضی سمجھو

رک اور جھک ، ماضی اور راضی قسم کے قافیوں کو غزل کے مطلعوں میں نگینے کی طرح جڑ دینا ذوق کی امتیازی خصوصیت ھے - یہ اور بات کہ اس صناعی پر غزلیت کو ایک حد تک نثار کر دینا پڑے - سامنے کی پنچائتی باتیں (Platitudes) ذوق کے دماغ میں چکر کاٹتی رھتی تھیں - یہ بھی ایک وجہ ذوق کے ضرب المثل اور کہاوتوں پر یا ”کہاوت نما“ باتوں پر للچا کر نظر ڈالنے کی ھے - اردو کا کوئی شاعر صائب کی فارسی شاعری کی داد سخن تو کیا دے سکا، لیکن لکھنؤ میں ناسخ اور ان کے ھمعصروں میں جو تمثیلی شاعری کرنے یا خشک اخلاقی باتیں کہنے کا رجحان ھم پاتے ھیں اس کی تنہا نمائندگی دلی میں ذوق کرتے ھوئے نظر آتے ھیں - فرسودہ اور پھیکی باتوں کی فرسودگی اور پھیکاپن استادانہ انداز سے کہے ھوئے

مطلعوں میں کم ہو جاتا ہے ۔ قافیہ اور ردیف کی تکرار تجدید کا اُلٹا اثر پیدا کر دیتی ہے ۔ تمثیلی ، ''کہاوتی'' یا اخلاق باتوں کے کہنے کے لئے مطلع بہت موزوں ہوتا ہے ، جیسے ہندی شاعری کے یہ دوہے ؛

یا دنیا میں آئے کے سب سے ملیے دھائے
نا جانیں کس روپ میں نارائن مل جائیں*

صاحب کے گھر دور ہیں جیسے لمبی کھجور
چڑھے تو چاکھے پریم رس گرے تو چکنا چور

آوت ہی ہرکھے نہیں نینن نہیں سنیہ
تلسی وہاں نہ جائیے کنچن برسے مینہ

یعنی اگر میزبان تمہارے آتے ہی خوشی سے کھل نہ اُٹھے اور اگر اس کی انکھوں سے محبت چھلک سی نہ پڑے تو اے تلسی داس وہاں نہ جانا خواہ وہاں سونا برستا ہو ۔

کچھ یہی انداز ذوق کا ہے اور اسی سے مطلعے کی تکنیک ان کے انداز بیان سے خاص طور پر نال میل کھا جاتی ہے ۔ مطلعوں میں ذوق خود اپنے خیالات کا بھید پاجاتے ہیں اور ان کے لٹکائے جانے (Hang) کا انداز پا جاتے ہیں ۔

ذوق کے ہمعصروں میں ذوق کے فن مطلع نگاری کی کچھ جھلک مومن کے کئی مطلعوں میں دکھائی دے جاتی ہے ۔

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اُٹھے
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اُٹھے

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہونگے

---

*یا ۔ یہ دھائے اور جائیں کا قافیہ ایسا ہی ہے کہ ''موت کیا ہے مری بلا جانے ، ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں'' ۔ جسے حالی نے جواز کا فتویٰ اپنے مقدمہ شعر و شاعری میں دیا ۔

جہاں ذوق اور ناسخ کے اقلیم سخن کے ڈانڈے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس غزل کے کئی اشعار پر ذوق کی پرچھائیں پڑتی ہے۔ ''ہم نکالیں گے سن اے باد صبا بل تیرا''، ''ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس'' یا ''تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کرلے'' والے اشعار بلکہ مومن کی اس غزل کا مشہور مقطع بھی لفظ مومن و کافر کے تصادم و تقابل کی خصوصیت لئے ہوئے ذوق کے انداز میں ڈھلا ہؤا ہے۔

پھر وہ وحشت کے خیالات ہیں سر میں پھرتے
دشت یاد آتے ہیں آھو ہیں نظر میں پھرتے

اور ان مطلعوں سے بھی زیادہ مومن کے اس مطلع میں۔

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

ذوق ایسے ھمعصر کا اثر مومن پر کچھ پڑ جانا ناگزیر تھا ورنہ مومن کے مطلعوں یا اشعار پر عموماً بجز مومن کے مخصوص مزاج کے اور کسی کا بھی اثر نہیں پڑا۔ غالب کا یہ مطلع انداز بیان کے لحاظ سے تو ذوق کی یاد دلاتا ہے لیکن اس کا مخصوص طنز او: اس کی تلخی خاص غالب کی چیزیں ہیں :—

ابن مریم ہؤا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

غالب کے اس مطلع میں ذوق کی سلاست و روانی و بے تکلفی سب کچھ ہوتے ہوئے وہ روح احساس ہے جو غالب کو نصیب تھی اور صرف غالب کو۔

دل ناداں تجھے ہؤا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

آتش کے کچھ مطلعوں میں بھی قافیے اور مصرعوں کی روانی ذوق کی کچھ یاد دلاتے ہیں۔ میر، سودا، جرأت، مصحفی اور ناسخ کی یاد

نہیں دلاتے ، نہ غالب و مومن کی -

قصۂ سلسلۂ زلف نہ کہنا بہتر
پیچ در پیچ ہے خاموش ہی رہنا بہتر

بات یہ ہے کہ بیان میں جو صفائی و روانی مصحفی پیدا کر چلے تھے دلی میں اس سلسلے کو ذوق ہی آگے بڑھا رہے تھے -

دوست ہی جب دشمن جاں ہو تو کیا معلوم ہو
آدمی کو کس طرح اپنی قضا معلوم ہو

لیکن جب آتش اپنے معرکہ آرا مطلعے کہتا ہے تو ذوق کا انداز دھؤاں بن کر اڑ جاتا ہے -

مگر اس کو فریب نرگس مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے
موت مانگوں تو ملے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

ہاں رند ، شاگرد آتش کے اس مطلع میں ذوق کا انداز صاف جھلک رہا ہے اگرچہ کچھ دھوم دھام اس میں آواز آتش کی ہے :—

کوہ فرہاد سے مجنوں سے بیاباں جیتا
جوش وحشت ترے اقبال سے میداں جیتا

اور صبا کے مطلعے میں بھی ذوق کا چھیڑا ہؤا سلسلہ ملتا ہے :—

اختیاری عمل رند قدح نوش نہیں
خط تقدیر ہے موج مئے سر جوش نہیں

ناسخ کا مشہور عالم مطلع ہے جس میں ناسخ اپنے رنگ سے ہٹ کر اور ذوق سے دوش بدوش ہو کر کہتا ہے :—

جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد پھولوں کی

اس مطلع میں ببولوں اور پھولوں کے قافیے ذوق کی یاد دلا دیتے ہیں، کسی اور شاعر کی نہیں، ناسخ کی بھی نہیں -

امداد امام اثر عظیم آبادی کا یہ مطلع اپنی اسپرٹ کے لحاظ سے تو آتش کی یاد دلاتا ہے اور برجستگی بھی آتش کی ہے لیکن نہ جانے کیوں اسے سن کر ذوق کی بھی یاد آ جاتی ہے -

حسن کی جنس خریدار لیے پھرتی ہے
ساتھ بازار کا بازار لیے پھرتی ہے

میرے والد مرحوم حضرت عبرت گورکھپوری کے یہ مطلعے سنیے اور دیکھیے کہ میر، سودا، غالب، آتش یاد آتے ہیں یا ذوق اور کچھ کچھ مصحفی -

زمانہ کے ہاتھوں سے چارا نہیں ہے
زمانہ ہمارا تمہارا نہیں ہے

اعمال کا پابند ہے چھوٹا بھی بڑا بھی
ہاتھوں سے بشر اپنے ہی بگڑا بھی بنا بھی

ذوق سے پہلے جرأت اور انشا کے کچھ بہت شوخ عشقیہ اشعار کو چھوڑ کر یہ بات بہت کم دیکھنے میں آتی ہے کہ مطلعوں یا غزلوں کے دوسرے اشعار میں بھی قافیہ اور ردیف کے میل سے یا کبھی کبھی صرف ردیف سے پہلے یا دوسرے مصرعے کے ایک حصے سے یا پورے دوسرے مصرعے سے اچانک ایک ایسا فقرہ بن جائے جس میں بول چال اور روز مرہ کا لطف آئے - ظفر کی کئی غزلوں میں یہ بات ملے گی - ابھی میں نے آتش کے کچھ وہ مطلعے جو ذوق کے رنگ میں ہیں (اگرچہ ان میں آتش کے انداز کا تیکھاپن بھی ہے) سنائے ہیں - ان کے ان ٹکڑوں کو دیکھیے "نہ کہنا بہتر" یا "خاموش ہی رہنا بہتر" یا "آدمی کو کس طرح اپنی قضا معلوم ہو"، داغ کی کئی غزلوں میں یہ باتیں ملیں گی، مثلاً "ناز والے نیاز کیا جانیں" والی غزل

''کہ جی جانتا ہے'' والی غزل یا وہ غزل جس کی ردیف ہے ''یہ کیا''۔ ذوق کے جو اشعار آپ اس مضمون میں پڑھ چکے ہیں ان میں بہت سے ایسے مطلعے اور اشعار مل جائیں گے جن میں ٹھٹھول ، بزلہ سنجی (Witticism) کی صفت ہے - یہی صفت آتش و شاگردان آتش کے یہاں سنجیدہ خیالات کو برجستگی دے دے گی اور اسی صفت کو داغ کی بے پناہ شوخی بھڑکتی ہوئی چنگاریاں بنا دے گی - مثلاً پہلے مصرعے ''میں ھجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا'' میں ردیف بول چال میں ہے لیکن دوسرے مصرعے میں ردیف اور قافیہ سے مل کر بول چال کا ایک ایسا شوخ و برجستہ انداز پیدا ہو گیا ہے کہ بے اختیار منہ سے واہ نکل جاتی ہے - ''تم وقت پہ آ پہونچے نہیں ہو ہی چکا تھا''۔ حال میں مجھے میرے ایک خوش‌گو اور خوش فکر دوست نے اپنی ایک غزل سنائی ''آسماں کیا ہے'' ، ''آستاں کیا ہے''۔ ایک مطلعے میں ردیف ''کیا ہے'' ایک الگ فقرہ بن کر مصرعے میں اس خوبی سے لگا ہے کہ انداز بیان سنور آٹھا ہے :—

گریں جو ٹوٹ کے گرتی ہیں بجلیاں ، کیا ہے
جب آشیاں ہی نہیں شاخ آشیاں ، کیا ہے

دیکھیے پہلے مصرعے میں ''کیا ہے'' کس حسن سے آیا ہے - یعنی مجھے کیا یا کیا پروا ، یا مجھے کیا پڑی ہے ، یا مجھے کیوں غم ہو ؟ پہلے ذوق نے اردو غزل میں اس صفت کو عام کیا بعد کو اس انداز بیان کی جو مثالیں نظر آتی ہیں وہ سب فیضان ذوق ہے -

اس مضمون کے دوران تحریر میں ایک دلچسپ واقعہ ہؤا - میرا مذاق شاعری ذوق کے رنگ طبیعت و رنگ سخن سے بہت دور ہے لیکن اس مضمون کے لیے جب میں نے ذوق کے کلام پر پھر سے نظر ڈالی اور ان کے اشعار نقل کرنے لگا تو مضمون لکھنے اور سوچنے اور آرام کرنے کے وقفوں میں مجھ سے ایک ایسا مطلع ہو گیا جو زبان و بیان کے لحاظ سے میرا کم اور ذوق کا زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مطلع یہ ہؤا :-

کرنے کو ہیں دور آج تو یہ روگ ہی جی سے
اب رکھیں گے ہم پیار نہ تم سے نہ کسی سے

ذوق کے مطلعے اردو غزل میں نشان راہ یا سنگ میل کا حکم رکھتے ہیں - انھیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اردو اب اپنی آواز کو پا رہی ہے اور اپنے نطق پر قابو حاصل کر چلی ہے - اس کی بولی میں ایک خود اعتمادی ، ایک توازن پیدا ہو چلا ہے - اٹک اٹک کے بات کرنے کی منزل سے اردو آگے بڑھ رہی ہے - اب وہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو اردو کو کہاں سے کہاں پہونچا دے گا - ذوق کے بعد سے سینکڑوں مشہور و گمنام شعرا کے یہاں اور اشعار جانے دیجیے صرف مطلعے ایسے اور اتنے ملتے ہیں جو ہمیں ذوق کی یاد دلاتے ہیں ؛ اور اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ اب اردو کی آواز کھل گئی ہے اور اس کے دل کی بھٹک اور جھجک نکل گئی ہے - یوں تو میر اور سودا کے بھی کئی مطلعے بہت رواں دواں ہیں جن میں برابر کے مصرعے لگے ہیں لیکن ذوق ہی کے زمانہ سے اور ذوق کے بعد ہی عام طور پر یہ ممکن ہؤا کہ اردو غزل میں ہزاروں مطلعے صفائی اور روانی سے کہے جائیں - اگر شاعر میں ذوق کی آواز کا ہلکاپن اور پتلاپن اور ذوق کی نثریت نہیں ہے تو ان مطلعوں میں شعریت و نشتریت ، کیف و اثر ، لوچ اور نغمگی بھی بدرجہ اتم موجود ہوں گے - ایسے مطلعوں کی باقاعدہ داغ بیل ذوق ہی نے ڈالی ، سانچا ذوق ہی نے تیار کیا - ذوق کے بعد سے شاعری کی روح نئے نئے انداز سے اس میں ڈھلتی گئی -

ذوق کے اسلوب شعر گوئی یا شعر کہنے کے کینڈے یا ڈھب کو اگرچہ مطلعے اجاگر کر دیتے ہیں اور ان کے طرز و انداز میں مزید خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں ، لیکن علاوہ مطلعوں کے ان کے اور اشعار پر یا ان کی پوری غزلوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو یہاں بھی ان کے اسلوب کی وہ خصوصیتیں نظر آتی ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں - ذوق کے کلام کی روانی اور شستگی ، اس کی رقاقت ، اسکی سبک گام و نرم آہنگ نثریت ہمیں پوپ اور اڈیسن کی یاد دلاتی ہیں - ذوق کے اسلوب ، درک و تصور اور انداز بیان میں ایک قسم کی لاطینی کلاسکئیت (Latin-Classicism) ہے - ان کے بہت سے اشعار میں تعقید ملے گی لیکن یہ تعقید مصرعوں کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتی ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہتے ہوئے پانی میں چکر یا بھنور پڑتے جا رہے ہیں لیکن پانی کا بہاؤ نہیں رکتا - یہاں ذوق کے احساس، جذبات ، خیال اور آہنگ کی وہ کمزوری یعنی اس کا پتلاپن یا رقاقت

ذوق کے لیے معاون اور سودمند ثابت ہوتی ہے - اس طرح ذوق کے یہاں بسا اوقات عیب تعقید حسن تعقید بن جاتا ہے ، جیسے گرہ باز کبوتر فضا میں گرہوں پر گرہیں کھاتا ہؤا اپنی اڑان جاری رکھے - ذوق کی بندشیں نہ چست ہوتی ہیں نہ سست - یہاں بھی نرم گام اور آہستہ خرام نثریت اُن کے آڑے آتی ہے اور ان کی بندشوں میں ایک نرم لچک اور آواز میں ایک نرم روانی پیدا کر دیتی ہے ، جیسے ایک پتنگ باز پتنگ کو کافی اوپر اڑا رہا ہو اور ڈور کو اس طرح ڈھیل دئے ہوئے ہو کہ اس میں جگہ جگہ پیچ و خم اور زاویے بن جائیں - یہی پیچ و خم ذوق کی تعقیدیں ہیں - اگر اُن کے جذبات میں شدت ہوتی ، احساس میں داخلی کھنچاؤ اور تناؤ ہوتا ، اگر ان کے خیالات میں کس بل اور گٹھیلا پن ہوتا تو تعقید کی یہ بھر مار ہر شعر میں تکلیف دہ رکاوٹ پیدا کر دیتی - اگر ان کے مصرعے جذبات سے بوجھل ہوتے تو جہاں تعقید آئی وہیں ٹھپ ہو جاتے - کھنچے تنے ہوئے شدید جذبات تعقیدوں کی ٹھیس کھا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے - اتنی اور اس طرح کی تعقیدوں یا گرہوں سے غالب کا کلام تو مٹ جاتا لیکن ذوق کے کلام کا حسن چہ جائیکہ تعقید سے بگڑے کچھ اور بھی بن جاتا ہے - کبھی کبھی حالی کے ہاں بھی تعقید کا یہ عیب ایک طرح کا حسن بن گیا ہے ، جیسے ''نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں'' - کلاسیکی تکمیل (Classical Finish) ذوق کے کلام میں جتنی اور جیسی ملتی ہے اتنی اور ایسی ذوق کے سب سے بڑے شاگرد داغ کے یہاں نہیں ملتی - زبان کے ناتراشیدہ ٹکڑوں کو صفائی سے باندھ کر جس طرح ذوق چول سے چول ملا دیتے ہیں اس طرح کی کاریگری داغ سے نہ بن پڑتی ، اور یوں تو داغ نے استاد کا نام روشن کر دیا اور ذوق کے کلام کی کئی خصوصیتوں کو داغ نے چمکا دیا - شاگردان ذوق میں زیادہ تعقید سمیت رواں دواں مصرعے کہنے میں یا ناتراشیدہ لفظوں اور ٹکڑوں کو نباہ دینے میں داغ سے زیادہ صلاحیت ظفر میں تھی - یوں تو سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دکھانے میں مصحفی کا کوئی حریف نہیں لیکن مصحفی کا زیادہ تر کلام صرف عشقیہ مضامین پر مشتمل ہے - ذوق ہرطرح کی باتیں عشقیہ ، اخلاق ، پنچائتی ، روایتی ، تمثیلی ، سنجیدہ ، ظریفانہ ، المیہ ، طربیہ سب کچھ اس آسانی سے کہہ جاتے ہیں کہ انہی کا مصرعہ یاد آ جاتا ہے ، ''مست ہاتھی ہو تو بے بار نظر آتا ہے'' - ذوق کو استاد ذوق کہا جاتا تھا - اس خطاب

کی موزونیت صرف اس لیے نہیں مسلم ہے کہ ذوق بادشاہ کے استاد تھے، (حالانکہ جن گوناگوں زمینوں میں ظفر نے شاعری کی ہے صرف ان زمینوں میں ظفر کے اشعار کی اصلاح جو کر سکے وہ اور سب کچھ بعد کو ہے استاد پہلے ہے) بلکہ اس لیے بھی ہے کہ مختلف العنوان اشعار کہنے میں روز مرہ، محاوروں، کہاوتوں، ایسے الفاظ اور فقروں کو جو بظاہر شعر میں کھپائے نہیں جا سکتے تھے، بے لاگ باندھ جانے میں اور اس سب کو لے کر تعقیدوں کا کاوا کاٹتے ہوئے کچھ شہسواروں کی طرح یوں آگے بڑھ جانے میں کہ ہاتھ کا پانی تک نہ ہلے، ذوق اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ یہی وہ قادر الکلامی ہے جس کی بدولت استاد کا لقب جتنا ذوق پر پھبتا ہے کسی اور پر نہیں پھبتا۔ یہ لقب ایک شگون (Portent) تھا، ذوق کی ادبی فتوحات کے لیے۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی لطف و دلچسپی سے خالی نہیں کہ ذوق کی غزلیں اسکولوں کے اردو کورس کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہیں اور معلموں کو ذوق کے اشعار سب سے زیادہ یاد رہتے ہیں، یہاں تک کہ دیہات و قصبات کے مدرسوں کو بھی۔ ایک لحاظ سے ذوق معلموں کا شاعر ہے۔ یہ شاعری سب سے زیادہ ''ادبی'' یا ''قواعدی'' شاعری ہے۔ ذوق کے کلام میں ایک خوش آئند معلمانہ شان ملتی ہے۔ یہ بات کسی اور کے کلام میں نہیں۔ ان کی نرم رو، سبک رفتار اور خوش آہنگ نثریت ان کی شاعری میں فن انشا پردازی کی شان پیدا کر دیتی ہے۔ طلبا اور معلموں کو تو یہ خصوصیت خاص طور پر بھاتی ہے۔ جذبات اور گہرائی کا فقدان طلبا اور معلموں کے لیے شاعری کو سمجھنے سمجھانے کے کام کو اور اس سے لطف اندوز ہونے کے کام کو آسان بنا دیتا ہے۔ مدرسوں کی فضا سوز و ساز کی فضا سے الگ ہوتی ہے، وہاں تو ایسی شاعری چاہیئے جو اقلیدس سے ملتی ہو۔ مگر اس قسم کی شاعری میں خیال اور زبان کے محاسن جس بے لاگ استادانہ شان سے ذوق نے پیدا کیے وہ انھی کا کام تھا۔

ذوق کی شاعری دل کی شاعری ہے یا دماغ کی؟ اس کا جواب جو بھی ہو لیکن ذوق کی شاعری صناعی کی لاجواب مثال ہے۔ ذوق رائے عامہ کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے اور اس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پوپ کا یہ بیان مجھے یاد آ جاتا ہے کہ فن کی تمام تر خوبی یہ ہے کہ زندگی کے مسلمات اور پنچائتی خیالات اور معتقدات

کو حسین ترین طریقے پر ظاہر کر دیا جائے۔ یعنی جو بات سب جانتے اور مانتے تھے لیکن جس کا اب تک اس خوش سلیقگی سے اظہار نہیں ھؤا تھا۔

All art is nature to advantagedrest. What oft was thought but never so well exprest.

ذوق کے کلام سے ہمارے دماغ کے اس حصے کو ایک ھلکا سا انبساط ایک خوشگوار آسودگی ملتی ھے جو پیش پا افتادہ باتوں اور عام خیالات کو ادا کرنے میں غیر معمولی قدرت اظہار کو دیکھ کر ملتی ھے۔ اس لیے ھم ذوق کو جن معنوں میں زبان کا شاعر کہہ سکتے ھیں ان کے ھم عصروں اور پیش روؤں میں ھم کسی کو نہیں کہہ سکتے، بلکہ داغ کو بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس لحاظ سے ھم ذوق کو اردو کا پنچائتی آرٹسٹ یا شاعر کہہ سکتے ھیں۔ عوام اور متوسط طبقے کی اکثریت اور امراء و رؤسا بھی گیتوں میں، غزلوں میں، بزم حال وقال میں عموماً "پتلے" اور سطحی یا بے تہہ جزبات و خیالات کی چیزیں مانگتے ھیں۔ یہاں بھی جمود، تن آسانی اور سہل پسندی کار فرما ھیں۔ میرے علم میں اب تک کسی قوال نے غالب کی کوئی غزل نہیں گائی (اور کاش نہ گائے) اور ذوق نے تو قوالوں کے لیے کئی غزلیں لکھ کے دیں۔ غالب پہلا شخص ھے جس نے رچی اور سنواری ھوئی موسیقیت اردو شاعری میں پیدا کی، لیکن پنچائتی طور پر عامیت زدہ کانوں کے سننے سنانے یا سطحی طور پر گانے بجانے کی چیز غالب کی موسیقیت نہیں ھے۔ ذوق کی غزلیں گانے کو لوگ بھلے گائیں لیکن سنگیت سے ان کو کیا واسطہ؟

ھاں تو ذوق پنچائتی شاعر ھے، رائے عامہ کا شاعر ھے۔ ذوق کی لغت، اسلوب بیان سازی، جس طرح زمینیں ذوق نے نکالی ھیں، سب سے پتہ چلتا ھے کہ وہ اھل دلی کے جمہوری مذاق سے بہت قریب ھیں، بلکہ اس مذاق کی روح یا اس کے مرکز کو انھوں نے پا لیا ھے۔ اس معاملے میں ذوق کا کوئی ثانی یا حریف نہیں۔ اسی سے ذوق استاد ذوق کہلائے۔ بول چال کی اردو کو جو شاعر اس جچے تلے طریقے پر باندھ دے، اس میں اتنی تکمیل پیدا کر دے، اسے یوں چمکا دے

کہ ترقی کی گنجائش باقی نہ رہے ، وہی پنچایت اور پنچائتی شاعری کا ملک الشعرا یا اُستاد مانا جا سکتا ہے - ایسے شاعر کا شاعر کم لیکن حیرت انگیز صناع ہونا ضروری ہے - اُردوئیت جتنی ہمیں ذوق کے یہاں ملتی ہے اتنی ذوق کے پہلے کسی شاعر میں نہیں ملتی ، اور جتنے موضوعات پر شعر کہنے میں اُردو کے اردو پن یا اس کی اُردوئیت کو ذوق نے نمایاں کیا ، اتنے موضوعات پر داغ بھی اس انداز سے اشعار نہیں کہہ سکے - میر ، سودا ، درد ، غالب و مومن سب کے یہاں بہت سہل اور سلیس اُردو کی مثالیں ملیں گی لیکن ہم اُن کی اُردوئیت کے بجائے اُن اشعار کی شعریت سے متاثر و متکیف ہوتے ہیں - ان کی سادگی اور ذوق کی سادگی میں بڑا فرق ہے - ان کی بزلہ سنجی بھی ذوق کے ٹھٹھول سے الگ ہے - ذوق کا مرکز جو (Centripetal) آرٹ اپنی خارجیت کے سبب داخلیت اور شعریت سے مغلوب نہیں ہوتا - اس لیے محض زبان یا خالص اردو کی صفت تنہا چمکتی ہوئی نظر آتی ہے - ہم پر استاد ذوق کے لقب کا مفہوم روشن ہو جاتا ہے - ہم اس کے انداز بیان کو دیکھتے رہ جاتے ہیں اور انشا پردازی کے معجزے کے قائل ہو جاتے ہیں -

ذوق کی اُردو سے اگرچہ داغ کی اردو بنی لیکن داغ کی شوخ بیانی نے اس میں ایک شدت اور تیکھاپن پیدا کر دیا - داغ کے چہچہے اور معجز نما جھلاہٹ جس پر پیار کا دھوکا ہو جاتا ہے داغ کی تنہا ملکیت ہے - داغ کی اُردو ذوق کی اُردو کی نرم آہنگ نثریت سے کچھ الگ ہو گئی - داغ کی آواز میں ایک آنچ ہے ، اس کے اشعار میں ایک جلن ہے جو محض اُردو یا زبان کا کرشمہ نہیں ہے - زبان کا خالص کرشمہ ذوق کے یہاں مختلف العنوان اشعار میں ملتا ہے - ذوق کی اُردوئیت نظیر اکبر آبادی کی پنچائتی بولی سے بھی الگ ہے کیونکہ ذوق کے یہاں محض زبان و بیان و طرز ادا کے وہ تمام فن کارانہ صفات موجود ہیں جو مومن ، شیفتہ اور خالص زبان پرست طبقے کے دلوں کو لگے - ذوق کی اردو میں چمکی ہوئی ، بنی ٹھنی ہوئی ، تراشی خراشی ہوئی عمومیت ہے - ذوق زبان کے لحاظ سے عمومیت زدہ ہرگز نہیں ہے بلکہ عمومیت ذوق کے قلم کی چوٹوں سے چمک گئی ہے ، اور اس میں فصاحت کی جھلک پیدا ہو گئی ہے - نظیر کے یہاں یہ عمومیت جوں کی توں نظم ہو گئی ہے - نہ ذوق کی اُردوئیت اس

''خالص اردو'' کی مثال ہے جس کو آرزو لکھنوی نے فروغ دیا۔ ذوق کا یہ شعر :—

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائیں گے

یا ''مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے'' ہے تو خالص اردو ، لیکن اس تکلف اور تصنع اور اس اٹکاؤ سے بالکل آزاد ہے جو آرزو کے بالارادہ کہے ہوئے آورد زدہ خالص اردو کے اشعار میں ملتے ہیں۔ دیکھیے آرزو کی خالص اردو اور ان کا وہ کلام بھی جس میں فارسی عربی الفاظ آتے ہیں اور پھر دیکھیے ذوق کے کلام کا ہلکا پھلکاپن اور اس کی تیز رفتاری اور سبک روی ۔ آرزو کیا کسی شاعر کی زبان اس بے تکلف برجستگی کی مثال نہیں پیش کرتی۔

جس جگہ بیٹھے ہیں بادیدۂ نم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

یہ ہے ذوق کی اردوئیت جو ناسخ تک کو بھی نصیب نہیں ہوئی اور بالکل اسی انداز میں جس کی مثال آتش کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ ذوق واقعی استاد ذوق تھے۔ ذوق فنکار بڑے نہ ہوں صنعت کار وہ بہت بڑے ہیں۔

ذوق کے بہت سے اشعار اور کچھ غزلوں کی غزلیں تیس چالیس برس پہلے بہت لوگوں کو یاد تھیں۔ اس وقت تک غالب کے کلام کی نشاۃ ثانیہ ابتدائی منازل میں تھی۔ آج بھی کافی لوگوں کو ذوق کے کلام کا کچھ حصہ یا اچھا خاصا حصہ یاد ہے۔ لیکن جتنا لوگوں کو یاد تھا یا ہے اس سے چوگنے اٹھ گنے شعر ذوق کے ایسے ہیں جن میں تعقید سمیت اور کئی زاویے بناتی ہوئی ڈھیل سمیت ، الفاظ ، محاورے ، فقرے ، ردیفیں اور قافیے اس ڈھب سے بندھے ہیں کہ یہ اشعار زبانوں پر نہ ہوتے ہوئے بھی ، یاد نہ ہوتے ہوئے بھی جب پڑھے جاتے ہیں تو بہت لطف دیتے ہیں۔ یہ شعر حافظہ میں محفوظ نہ رہیں لیکن جب آنکھوں کے سامنے آتے ہیں تو ہم ذرا ٹھٹک کر گویا پھسل پڑتے ہیں۔ ان اشعار میں بھی ایک بچھلہراپن ہے۔ یاد وہ اس لیے نہیں

رھتے کہ ذوق کے معرکہ آرا اشعار کی برجستگی ، رائے عامہ یا سامنے کی بات ، یا مسلمہ کلیات کے بیان کا نکھار ان اشعار میں ذرا کم ھے - ان میں ذوق کا پورا پورا زور بیان نہیں ھے لیکن لطف بیان موجود ھے - سطحیت اور پتلے پن میں جب سنگ مرمر کی چکناھٹ اور ھمواری یا بلور کی ھم دمیدگی اور انجماد آ جاتے ھیں تب ھم احساس تکمیل کرتے ھیں ، اور ذوق کے جن اشعار میں یہ صفات آ گئے ھیں وہ یاد رہ جاتے ھیں - لیکن ان کے بہت سے اشعار بلور یا سنگ مرمر ہوتے ہوتے رہ گئے ھیں اور ان کے پتلے پن میں مکمل انجماد پیدا نہیں ھو سکا ھے ، اسی لیے سامنے آ کر لطف تو دے جاتے ھیں لیکن یاد نہیں رھتے - ذوق کا جو اسلوب ھے اس کے لحاظ سے مطلعوں میں یہ انجماد یا جماؤ پیدا ھو جانے کا زیادہ امکان رھتا ھے - ذوق کی شاعری زبان کی شاعری ھے اور زبان کے شعر مطلعوں میں اکثر نکھر آتے ھیں - اس لحاظ سے ھم ذوق کو مطلعوں کا شاعر کہہ سکتے ھیں - جذبات میں گہرائی اور شدت نہ ھونے سے ذوق کے اکثر اشعار ان کے استادانہ انداز بیان کے سبب پھسپھسے پن کے عیب سے بال بال بچ جاتے ھیں - جہاں برجستگی نہیں آ سکی یا شعر کی نرم رفتار میں ھمواری یا خوبصورت لچک پیدا نہیں ھو سکی ، وھاں ذوق کے اشعار لچ لچ کر رہ گئے ھیں ، ان کے پاؤں میں موچ آتے آتے رہ گئی ھے - ذوق کے ھر شعر میں زبان کی طنابیں پوری طرح کھنچی ھوئی نہیں ھیں نہ آواز کی روانی میں ھر جگہ وہ لچک پیدا ھو سکی ھے کہ الفاظ کی ''زلف مسلسل کے پیچ میں'' ھر شعر اک اک گدگدی کے ساتھ تین تین بل کھا جائے - ایک خفیف سے ڈھیلے پن ھی کے کارن یہ اشعار یاد داشت سے پھسل جاتے ھیں - کہیں ایسا نہ ھوتا تو سطحیت کے باوجود آج ذوق کا پورا کلام لوگوں کو از بر ھوتا ، شاید خصوصاً سطحیت کی وجہ سے -

یہ بتایا جا چکا ھے کہ جو اُردوئیت ذوق کے کلام میں ھے وہ کسی اور شاعر کو اس حد تک نصیب نہیں ھوئی - غالب اوروں سے استفادہ کرتا ھؤا بھی اپنے رنگ میں پرگٹ ھو جاتا ھے :-

ابن مریم ھؤا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

دل ناداں تجھے ہؤا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

غالب کے ان اشعار کی سادگی کو دیکھ کر ممکن ہے یہ خیال گزرے کہ میر کی سادگی سے غالب نے متاثر ہو کر یہ اشعار کہے۔ لیکن ان اشعار میں میریت نہیں ہے بلکہ غالبیت ہے۔ غالب تقلید کرتے ہوئے بھی غالب ہی رہتا ہے۔

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ سہی
چند دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
حریف معنئی مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز
جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

ممکن ہے ان مطلعوں میں غالب نے ذوق کے مطلعوں اور ان کے عام انداز کی برجستگی اور اردوئیت سے ذوق کے کلام کی صفائی اور روانی سے اثر لیا ہو، لیکن ان اشعار میں جو طنز ہے، ان اشعار میں جو کھنکے ہیں، لہجے میں جو تیکھاپن اور تلخی ہے، وہ غالب کی اپنی چیزیں ہیں۔ ان عناصر کے فقدان ہی سے ذوق کی اردوئیت چمک جاتی ہے اور اس چمک میں کوئی اور کرن شامل نہیں ہونے پاتی۔

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

لیتے ہی دل جو عاشق دلسوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

ان اشعار میں اردوئیت کے سوا کچھ نہیں ، مگر غالب سے بہت زیادہ اردوئیت ان میں ہے - ہندوستانی الفاظ اور فارسی عربی کے وہ الفاظ جو اتنے مانوس خاص و عام ہو گئے ہیں کہ ہندوستانی یا اردو کی بو باس ان میں آگئی ہے غالب ، مومن اور میر و سودا نے بھی استعمال کئے ہیں - لیکن جسطرح ہندی کی چندی یا جیسا محض زبان کا ٹھٹھول ان لفظوں سے ذوق کر دکھاتے ہیں وہ آپ اپنی مثال ہے - جہاں تک میر و غالب کا تعلق ہے زبان اور الفاظ نے اپنے آپکو انہیں سونپ دیا ہے ، لیکن جہاں تک زبان و الفاظ کا تعلق ہے ذوق نے اپنے آپ کو انہیں سونپ دیا ہے - پھر ان کی سی اردوئیت اور کسی میں کہاں آسکتی تھی - ذوق کے یہاں الفاظ پر جذبات کا راج نہیں ہے بلکہ الفاظ اور زبان جذبات اور خیالات پر راج کرتے ہوئے اور خود اپنی فاتحانہ شان دکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں - میر و غالب اپنی شعریت کے مخصوص اندازوں کی شرط لگا کر اردو کو اپناتے ہیں - ذوق اردو کو صرف اردوئیت کی شرط لگا کر اپناتے ہیں - غالب و میر کی اردو میں غالب و میر کی شخصیتیں جھلکتی ہیں - ذوق کی اردو میں صرف اردو کی شخصیت نظر آتی ہے - یہ ہے ذوق کی اردوئیت اور یہ ہے ذوق کا فن -

ذوق کے یہاں اردو اس طرح غالب ہے کہ بادی النظر میں اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ ذوق نے فارسی ترکیبیں اس آسانی سے اپنے اسلوب میں جذب و پیوست کرلی ہیں کہ غور کرنے ہی سے وہ نظر آتی ہیں - ذوق کی اردو نے انہیں یوں اپنا لیا ہے کہ ہم سوچتے بھی نہیں کہ الگ الگ نظر ڈالنے سے ان ٹکڑوں اور ترکیبوں میں بڑی شستہ فارسیت ہے - ذوق نے فارسیت کو نمایاں نہیں ہونے دیا اور اسے اردو کو دبالینے سے بچایا ہے - دیکھیے ان اشعار میں یہ قابل توجہ فارسی ترکیبیں ہیں -(۱) گنبد بے در (۲) گرم تپش (۳) آسیائے باد (۴) دیدۂ روزن دل(۵) نفس بے مقدور (۶) جنبش برگ صفت (۷) اشک مژگان (۸) مقام وجد (۹) غزال پلنگ خو (۱۰) اکسیر عشق (۱۱) نخل گل آتشبازی (۱۲) سوزن گم گشتہ (۱۳) غرۂ جوہر (۱۴) ساقیان سامری فن

(۱۵) شکوۂ فرصت (۱۶) توسن چالاک (۱۷) زاهد دو رنگ (۱۸) عاشق دلسوز (۱۹) واجب الرعایت (۲۰) خونابۂ حسرت (۲۱) کلید در گنج راز (۲۲) یار خرابات (۲۳) گرفتار تفکر (۲۴) تودۂ طوفاں (۲۵) صراحی به بغل (۲۶) دفتر تقدیر (۲۷) کشمکش طرۂ دوتا (۲۸) ابروئے پیوسته (۲۹) خوان دوں همت -

ظاهر هے که یه فارسی ترکیبیں ایک کافی پڑھا لکھا آدمی هی اپنے کلام میں لا سکتا هے ، لیکن بجائے شعریت کے ایک لطیف نثریت ان ترکیبوں میں ملتی هے - ان میں نظیری یا عرفی کی فارسیت کی وہ چٹیلی شگفتگی نہیں هے جس سے متاثر هو کر غالب نے اپنے کلام کو رنگارنگ بنا دیا هے -

ذوق ، مومن ، غالب تینوں کی هم طرح غزلیں بہت کم هیں ، تینوں نے نئی نئی زمینیں نکالی هیں - ان زمینوں سے هر ایک کی افتاد طبیعت کا اندازہ هو جاتا هے - جس طرح کی زمینیں ذوق نے نکالی هیں اُن سے پته چلتا هے که ذوق جمہوری مذاق سے بہت قریب تھے - خصوصاً جو ردیفیں ذوق کی طبعزاد هوتی هیں وہ اکثر خاص و عام کی بول چال کے ، اُن هلکے کھٹکوں کو لیے هوتی هیں جنہیں ذوق اپنی چابکدستی سے کچھ اس طرح سانچے میں ڈھال دیتے هیں که عامیت میں بھی سگھڑاپا پیدا هو جاتا هے - ان کی ردیفوں میں بھی اُردوئیت کا عنصر غالب نظر آتا هے - کبھی کبھی مومن ، کچھ جرأت کے زیر اثر، کچھ ذوق کے اس انداز سے للچا کر ایسی ردیفیں اور زمینیں اختیار کرتے هیں ، ''تمہیں یاد هو که نه یاد هو'' ، ''کیا کیا نه کریں گے'' - ذوق کے جن اشعار کا انتخاب میں نے دیا هے ان میں کئی کئی زمینیں اور ردیفیں جمہوری مذاق گفتگو سے ذوق کی قربت و مناسبت کا پته دیتی هیں مثلاً ''محبت کے مزے'' ، محبت والے'' ، ''کوئی هم سے سیکھ جائے'' ، ''ذرا دیکھیں تو''، ''محبت هو تو هو'' ، ''جھگڑے هیں'' ـــ ''اس کو کہتے هیں'' ـــ وغیرہ وغیرہ -

ذوق کے اشعار سے همیں وهی فرحت ملتی هے جو معمولی یا سطحی یا رسمی و روایتی باتوں کے کہنے میں غیر معمولی قوت اظہار کے مظاهرے سے ملتی هے ؛ ایسے شعر عموماً همیں یاد تو رہ جاتے هیں ،

ھمارے دماغ میں تو جڑ پکڑ لیتے ھیں لیکن دل میں جڑ نہیں پھوڑتے۔ آزاد نے دیوان ذوق مرتب کرنے میں کئی غزلوں پر اس قسم کے حاشیے دئے ھیں کہ استاد کی طبیعت جوش پر تھی یا لہر پر تھی، ایسے میں کسی خاص موقع پر یا خاص بات پر یہ شعر ھوا یا یہ غزل ھوئی۔ یہ کہیں نہیں لکھا کہ استاد بہت مغموم تھے یا بہت نازک دور سے گزر رھے تھے یا گزر چکے تھے یا کوئی گہری کیفیت استاد پر طاری تھی یا کسی بات یا واردات یا خیال سے ذوق متاثر ھوئے تھے تب یہ غزل ھوئی۔ آزاد نے ذوق کے بارے میں جو باتیں نہیں لکھیں وہ ان باتوں سے کم اھم نہیں ھیں جو باتیں انہوں نے ذوق کے متعلق لکھیں۔ آزاد اپنے اسلوب بیان سے ھمیں محوحیرت کرکے ھماری توجہ ان نفوی امور کی طرف جانے نہیں دیتے۔ ذوق کی طبیعت کن محرکات سے جوش پر آتی تھی یا لہراتی تھی ؟ وہ محرکات تھے خود زبان کے محرکات۔ آزاد کا ان موقعوں پر مطلب یہ ھے کہ استاد کی طبیعت حاضر تھی۔ ذوق کی طبیعت کا جوش نشاط کسی بہت گہری کیفیت کا حامل نہیں ھوتا تھا نہ کسی بہت لطیف یا شدید احساس کا، پھر بھی ھم ان کے اشعار کی خوشگوار سطحیت سے لطف اندوز ھو جاتے ھیں اور ھماری طبیعتیں بھی ذوق کی طبیعت کی طرح ان اشعار پر بار بار نہ سہی مگر کبھی کبھار تو ضرور لہرا اٹھتی ھیں۔ جب ھم یہ کہتے ھیں کہ ذوق کے شعر لوگوں کو یاد ھیں، غالب کے شعر لوگوں کو یاد ھیں، میر کے شعر لوگوں کو یاد ھیں، تو ھر فقرے میں یاد لفظ کے معنی بدل جاتے ھیں۔ یاد کی تمامتر نوعیت اس میں ھے کہ کیسا یا کیسے یاد ھے۔ غالب کے مروجہ اردو دیوان میں جتنے اشعار ھیں اس سے کہیں زیادہ اشعار ذوق کی تلف ھو جانے سے بچی ھوئی غزلوں میں ھیں۔ لیکن دیوان غالب چھوٹی سی چیز ھوتے ھوئے ایک بھری دنیا معلوم ھوتا ھے۔ یہ بات ذوق کے نسبتاً ضخیم دیوان میں نہیں۔ پھیلا ھؤا خوشگوار پتلاپن ٹھوس چیز نہیں معلوم ھو سکتا۔ دور تک پانی کا چھڑکاؤ زمین پھوڑ کر بہنے والے چشمے سے مختلف چیز ھے۔

لیکن یہ کہنا درست نہیں ھوگا کہ ذوق کے یہاں سرے سے سوجھ بوجھ کی باتیں نہیں ھیں یا ان کے دماغ میں کوئی اپنا خیال تھا ھی نہیں۔ روائتی اور پنچائتی خیالات کو جس زندہ شکل میں ذوق نے

اپنایا ہے اور جس جاندار پنچائتی زبان میں ان کا اظہار کیا ہے وہ ایک مفکرانہ شان لیے ہوئے ہے۔ پنچایت میں ہر پنچ پنچائتی معاملات اور باتوں میں یکساں زندہ دل نہیں ہوتا۔ ذوق کی یہی انفرادیت ہے کہ وہ پنچائتی خیالات کے بولتے ہوئے نمائندہ ہیں۔ وہ ایک ممتاز سرپنچ ہیں۔ ذوق کے یہاں حیات وکائنات پر، اخلاقیات پر، جو اردو غزل کے مسلمات میں سے ہیں سب پر، ہر طرح کے اشعار ملیں گے۔ لیکن میر و غالب جب انہی موضوعات پر شعر کہتے ہیں تو ان کا ادراک جذبات اور شدت احساس سے بوجھل اور تھرتھراتا ہؤا نظر آتا ہے۔ آتش جب ان موضوعات پر زبان کھولتا ہے تو اس کے تخئیل میں اس کی قوت ارادی لہراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ذوق کے یہاں حیات، کائنات، اخلاقیات کے مضامین پر ہمیں کبھی بزلہ سنجانہ اور کبھی سنجیدہ انداز میں اظہار رائے ملتا ہے۔ یہ نظرئیت (Abstractness) اس لاطینی کلاسکئیت کی خصوصیت ہے جسے ہم ذوق کے کلام کی صفت بتا چکے ہیں۔ معلوم نہیں ذوق نے کبھی عشق کیا تھا یا نہیں۔ معرکہ آرا عشقیہ شعر کہنا تو در حقیقت ''کرتے کی و دیا'' ہے۔ لیکن حسن و عشق پر مروجہ خیالات کے حامل اچھے اشعار ذوق نے کہے ہیں، اور ہر شخص کی جنسی زندگی و نفسیات اسے کچھ تجربات تو کرا ہی دیتی ہیں۔ اصلیت یا واقعیت کی ایک ہلکی چاشنی ذوق کے کئی عشقیہ اشعار میں ہے۔ اس لیے ان کے اشعار بالکل بے کیف نہیں ہیں۔ ان کے عشقیہ اشعار میں کہیں کہیں ایک ہلکا سا اوچھاپن بھی ہے اور جذبات سے لبریز طنز کے بدلے کچھ پھبتی کا انداز بھی پیدا ہو گیا ہے۔ رائے عامہ کے درک سے لہک اٹھنے کا عالم بھی تو ایک جذبہ ہے۔ ذوق کا کلام ایک دم نرس اور خشک نہیں ہے۔ اس میں جس قسم کی شگفتگی ہے وہ لکھنوی مدرسئہ شاعری کے انداز بیان کی پر تصنع شگفتگی سے جدا ہے۔ یہ کہنا غلط ہو گا کہ ذوق سرے سے دلی کا شاعر ہی نہیں۔ اور یوں تو شاہ نصیر کے دم قدم سے کچھ لکھنوئیت دھلی کی شاعری میں آہی چلی تھی، مگر لکھنوئیت کئی چیزوں سے مرکب ہے۔ ناسخ کی خشک اور بنوٹی شاعری ہی کل کی کل لکھنوئیت نہیں ہے۔ انشا کی شوخی اور جرأت کی معاملہ بندی بھی اسی لکھنوئیت کی دین ہے اور اس شوخی و معاملہ بندی کی ایک ہلکی چاشنی ذوق کے کلام میں ہمیں ملتی ہے۔ لکھنوی شاعری کا سلسلہ بھی دلی تک پہونچ جاتا ہے۔ شاہ حاتم اور سودا دھلوی شاعری کے شگون تھے اور ذوق بقول

اپنے ہی ''سودائی'' تھے نہ کہ ''میری'' ۔ اگرچہ ''نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب'' کہہ کے میر کو سراہا بھی ہے ۔

ذوق کا جب ہم اردو کے کچھ بڑے غزل گو شعرا سے موازنہ کرتے ہیں تو ذوق میں اور ان میں دلچسپ فرق نمایاں ہونے لگتے ہیں ۔ مثلاً سودا سے ذوق بہت متاثر ہیں ۔ سودا میر کے مقابلے میں زبان نمایاں طور پر رواں ، سلیس اور نکھری ہوئی لکھتے ہیں اور ذوق ایسے زبان کے شاعر کو اس صفت کا بھا جانا لازمی تھا ۔ لیکن سودا کی آواز بھرپور ہے اور ذوق کی آواز رقیق ہے ۔ سودا کی آواز کچھ بوجھل ہے اور اس لیے اس میں وزن ہے ۔ ذوق کی آواز ہلکی پھلکی ہے ۔ میر کے یہاں جو گھلاوٹ اور حلاوت ہے وہ ذوق کی رقاقت سے الگ ہے ۔ میر کی سادہ غزلوں اور ذوق کی ان سادہ غزلوں میں جن کی بحریں چھوٹی ہیں نمایاں اور اہم فرق ہے ۔ ''ساتھ اس کارواں کے ہم بھی ہیں'' ، ''جان ہے تو جہان ہے پیارے'' ، ''سو تم ہم سے منہ ہی چھپا کر چلے'' ، میر کی یہ اور ایسی ہی اور غزلیں ذوق کی ''اسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا'' ، ''تو پھر ہوتے ہیں رخصت ہم ابھی سے''، ''تو نے مارا عنایتوں سے مجھے'' ، ''وقت پیری شباب کی باتیں'' والی غزلوں سے بالکل الگ چیزیں ہیں ۔ سہل اور سادہ زبان کی روح اور معنی دونوں کے یہاں بدلے ہوئے ہیں ۔ میر عنصری (Elemental) شاعر ہے ۔ اس کی سادہ زبان میں وہ سوز و ساز ہے جو واقعیت کو ماورائیت کا درجہ دے دیتا ہے ۔ درد کی سادہ اور نرم زبان ان کی روشن ضمیری سے جگمگا رہی ہے اور سادھنا ، ریاضت یا تہذیب نفس سے پیدا شدہ کسک سے چمک رہی ہے ۔ مومن کی بھی وہ غزلیں جو بہت سادہ ہیں اور جن کی زبان ذوق کی زبان کی طرح سلیس ہے ، ذوق کی غزلوں سے بہت مختلف ہیں ۔ غالب کا اسلوب یوں تو ذوق کے اسلوب سے بہت الگ ہے لیکن غالب کے سادہ اور سہل اشعار جن کے بے پناہ ہونے کا احساس ذوق کو بھی تھا ، ذوق کے سادہ اشعار سے بالکل الگ چیزیں ہیں ۔ غالب کے دماغ کی رگیں دل کی رگوں کی طرح حساس ہیں ۔ غالب کے جذبات اور کلام میں ایک ارتکاز (Concen-tration) ہے ، ایک نوک (Point) ہے اور ایک تیز دھار ہے ، جو شعاعوں کی طرح چمکتی اور جگمگاتی ہے ۔ ذوق کی رقیق سادگی ان باتوں

سے معرا ہے - غالب بڑا پاجی شاعر ہے - آپ غالب کے رنگ میں کامیاب شعر کہیئے ، غالب کا تو کچھ نہیں بگڑے گا مگر آپ کا شعر خراب ہو جائے گا - کیونکہ غالب کی ترکیبوں اور غالب کی زبان کا دھوکا آپ کے شعر پر ہوتے ہوئے بھی غالب کے کلام کا نکیلاپن اور اس کی تیز دھار پیدا نہ ہو سکے گی - ذوق کے رنگ میں کامیات شعر کوئی کہے تو کچھ کہہ لے گا - ذوق کی شاعری کے صناعیانہ خوبیوں کے انیس قدرداں تھے ، اور انیس نے بھی سہل اور سادہ زبان کو اعلیٰ انشا پردازی کا معجزہ بنا دیا ہے - ذوق کی زبان اور ذوق کا اسلوب خارجی یا بیانیہ شاعری ، زرمیہ اور بزمیہ شاعری کے لیے بہت موزوں تھا - سلاست اور روانی میں پتھریلی اور ناہموار زمینوں کو پانی کر دکھانے میں ذوق سے پہلے مصحفی نے کمال دکھایا ہے ، لیکن مصحفی کے کلام کی اٹھلاہٹ ، رسمساہٹ اور رنگینی ذوق کے یہاں نہیں ہے - ذوق کا کلام نہایت خوش سلیقگی سے کلپ کیے ہوئے کپڑے کی طرح ہے - ذوق کے اشعار پر الفاظ کے لباس کا آتار (Fall) بہت سجل ہے - داغ تو ذوق کے شاگرد ہی تھے اور استاد ہی کی ڈگر پر انہوں نے اپنے آپ کو ڈالا - لیکن سادہ بول چال کی زبان کو داغ نے ایسی شوخ و شنگ انگلیوں سے گدگدایا کہ اردو کی پسلیاں پھڑک پھڑک اٹھیں - داغ کے اسلوب کا نقش اول اگر کہیں ملتا ہے تو ذوق ہی کے وہاں - آتش اور شاگردان آتش نے بھی زبان کو اسی طرح صاف اور رواں دواں کیا جیسے ذوق نے - ہاں اس میں ایک خاص تیور اور بانکپن اور چستی سے پیدا ہونے والی روانی کا اضافہ بھی کر دیا -

ذوق کا نام ہم غالب و مومن کے نام کے پہلے لیں یا بعد ، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شہرت کی جولا نگاہ میں غالب و مومن تو آگے بڑھ گیے اور ہاں ذوق بھی دوڑے (Also ran) - ذوق زبان کی شاعری کا بابا آدم ہے - ذوق کی شاعری جزویست از پیغمبری نہ سہی ، ساحری نہ سہی ، اس میں نشتریت نہ سہی ، نمک نہ سہی، لیکن ذوق کی زبان میں جو شیرینی ہے اس سے انکار ممکن ہی نہیں - ذوق کے کلام میں اردو نے اپنے آپ کو پایا - روایتی باتوں کو ، خیالات عامہ کو ، اتنے سنورے ہوئے اور مکمل شکل میں پیش کر دینا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا - شہرت دوام کے دربار

میں غالب و مومن کی صف میں ان کے برابر بلکہ مومن سے کچھ آگے، زبان کی شاعری کے پختہ نمائندہ کی حیثیت سے بیٹھے اور دستار فضیلت زیب سر کیے ہوئے استاد ذوق وہ نظر آ رہے ہیں !!

غالب

(پھر اس دنیا میں)

جب میں اس دنیا میں تھا تو بے چین ہو کر ایک بار میں نے کہا تھا :—

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آج موت کی گہری نیند پھر اچٹ گئی - کیا نیند ، کیا موت ، دونوں میں کسی کا اعتبار نہیں - جب زندہ تھے تو زندگی کا رونا تھا اور موت کی تمنا تھی ، میں نے کہا تھا :—

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

شمع اور سحر کا کیا ذکر ؟ میں نے تو کھلی کھلی بات یوں کہی ہے -

کس سے محرومئی قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

لیکن ذوق نے اس سے بھی زیادہ لگتی ہوئی بات کہی تھی - وہ نہ جانے یہ شعر کیسے کہہ گئے تھے -

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ہاں تو میں کہاں ہوں ؟ ابھی میرے حواس درست نہیں ، لیکن یہ زمین اور یہ آسمان تو کچھ جانے پہچانے معلوم ہوتے ہیں - لوگوں کو کسی طرف بڑھتا ہؤا دیکھ رہا ہوں - میں بھی انہی کے ساتھ ہو لوں - ''پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں'' -

اب ان راستوں پر پالکیاں جاتی ہوئی نظر نہیں آتیں - گھوڑوں کی گاڑیاں چل رہی ہیں - لیکن ان کی شکل و صورت بالکل بدلی ہوئی ہے - آنکھوں کے سامنے بیسیوں ایسی گاڑیاں بھی گزرگئیں جن میں کوئی جانور جتا ہؤا نہیں تھا - سن رہا ہوں کہ لوگ انہیں موٹر کار کہتے ہیں - ان کل پرزوں سے چلنے والی گاڑیوں میں تیزی اور بھڑک تو بہت ہے لیکن پرانی سواریوں کی بات ان میں کہاں - خیر یہ تو ہونا تھا - آج سے نہ جانے کتنے برس پہلے جب میں اس دنیا میں تھا زمانہ کروٹ بدل چکا تھا - یہ کایا پلٹ آنکھوں کے لیے نئی چیز ہو اور دل و دماغ کو بھی حیرت میں ڈال دے ، لیکن میری آنکھوں نے تو اسی وقت جب پچھلی زندگی پائی تھی وہ وہ انقلاب دیکھے تھے کہ اب کیا کہوں ، حیرت کیا کیا کروں اور کس بات پر کروں؟ بچپن اور جوانی میں قلعہ کے رنگ ڈھنگ کو دیکھا تھا - مغل دربار کی جھلملاتی ہوئی ''داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی'' شمع پھر بھی ایک نیا رنگ پیدا کر رہی تھی - شہر کے شریفوں اور رئیسوں کی زندگیاں دیکھی تھیں - دور دور تک کا سفر گھوڑوں پر ، بہیلوں پر ، پالکیوں پر اور ڈاک گاڑیوں پر طے کیا تھا - پھر ۱۸۵۷ء کا غدر ہؤا ، غدر کیا ہؤا قیامت آگئی! (اس کے بعد پچھلی ہی زندگی میں ریل کی سواری پر دلی سے کلکتہ کا لمبا سفر طے کیا) معلوم نہیں کلکتہ کی شان اب کہاں سے کہاں پہونچ گئی ہوگی ! اس وقت یہ شہر دلہن بنا ہؤا تھا ، جس کی یاد سے اب بھی تڑپ اٹھتا ہوں :—

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
ایک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

اور یوں تو نہ کچھ رونق میں رکھا ہے نہ اجڑی حالت میں رکھا ہے نہ آبادی میں نہ ویرانے میں ، پھر بھی جو کچھ ہے اور جیسا کچھ ہے غنیمت ہے :—

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

انسان جب زندگی کی مصیبتوں سے پریشان ہو جاتا ہے تو اسے دنیا چھوڑنے کی سوجھتی ہے - اپنے کو دھوکا دینے اور غلط راستے پر چلنے کو اکثر لوگ خدا کی تلاش یا سچائی کا پا جانا سمجھتے ہیں ؛ لیکن اس حقیقت کی بھی حقیقت مجھے معلوم ہے :—

ہاں اہل طلب کون سنے طعنۂ نایافت
جب پا نہ سکے اس کو تو آپ اپنے کو کھوآئے

دنیا کو چھوڑ کر تو پیغمبر بھی کچھ نہیں ہوتا -

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے !

میں اپنے خیالات کی دھن میں کہاں نکل آیا - یہ تمام چیزیں یہ مکانات اور یہ آبادی نئی بھی معلوم ہوتی ہیں اور پرانی بھی ، اجنبی بھی اور مانوس بھی - وہ سامنے دھند لکے میں لال قلعہ نظر آ رہا ہے - کچھ دور پر جامع مسجد کے برج اور مینار نظر آ رہے ہیں - میں دلی ھی یں ہوں - ہائے دلی ! وائے دلی !!

اس بازار کی شان تو دیکھنے کی چیز ہے - چاندنی چوک !! اچھا یہ وہی پرانا چاندنی چوک ہے جو بار بار لٹا اور بار بار آباد ہؤا ، اجڑا اور بسا ، اس کا نام تک نہیں بدلا - یہاں تو نئی زندگی کے شور و پکار میں بھی ، یہاں کی نئی آوازوں میں بھی پرانے نام کان میں پڑ رہے ہیں - کوچہ چیلاں کوچہ بلیماراں ، ان دو محلوں میں برسوں میرا قیام رہا ہے - بہار آتی ہے اور چلی جاتی ہے لیکن باغ وہی رہتا ہے -

اس بازار میں اس دوسری دنیا سے پلٹ کر کیا خریدیں - جب زندہ تھے ، حال یہ تھا :—

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

لیکن اس طرف کچھ کتاب بیچنے والوں کی دوکانیں ھیں - کتابوں کی دنیا مردوں اور زندوں دونوں کے بیچ کی دنیا ھے - یہاں ھر شخص کہہ سکتا ھے کہ ”ھم بھی اک اپنی ھوا باندھتے ھیں“- چلیں ذرا کتابوں کی اس خیالی دنیا کی سیر کریں - وہ ایک طرف الماری میں کوئی نہایت اچھی اور قیمتی کتاب رکھی ھوئی ھے - جلد تو دیکھو کیسی خوبصورت ھے - سنہرے حرفوں سے کچھ لکھا ھوا بھی ھے - اس کے برابر چھوٹی چھوٹی کتابیں دیکھنے میں نہایت نظر فریب معلوم ھوتی ھیں - ارے بھئی ذرا یہ سامنے لگی ھوئی کتابیں تو اٹھا دینا ، وھی جو سامنے کے تختے پر الماری میں لگی ھوئی ھیں - چھپائی اور لکھائی کے یہ کھیل پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے - دیوان غالب ، دیوان غالب ، دیوان غالب - مرقع چغتائی ! میری آنکھیں کیا دیکھ رھی ھیں ! برلن اور ھندوستان کے کئی شہروں سے یہ کتابیں نکلی ھیں - کیوں بھئی ذوق اور مومن ، ناسخ اور آتش، میر اور سودا، یہ سب کے سب غالب سے زیادہ مشہور تھے، ان کے کلام تو اور ٹھاٹ سے چھپے ھوں گے - ذرا انہیں بھی دیکھوں - کیا کہا ؟ صرف غالب کے دیوان اس اھتمام سے نکلے ھیں - پھر کیا کہا ؟ آج غالب کے نام کا سارے ھندوستان میں شور ھے - غالب پر کتابیں اور غالب پر مضامین کثرت سے نکل رھے ھیں - اچھا یہ کہنا بھی کسی ڈاکٹر بجنوری کا ملک میں مشہور ھے کہ ھندوستان کی الہامی کتابیں دو ھیں ایک وید مقدس اور دوسری دیوان غالب - تو صرف رھنا سہنا ھی اس ملک کا نہیں بدلا ھے بلکہ مذاق شاعری کی بھی کایا پلٹ گئی ھے - ھاں اب آپ دوسرے گاھکوں کی طرف متوجہ ھوں ، شکریہ ! یہ اب میں اپنے اس شعر کو کیا کہوں -

ھوں خفائی کے مقابل میں ظہوری غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ھے کہ مشہور نہیں

پہلی زندگی میں دوسروں کی شہرت کے کھیل دیکھے تھے مرنے کے بعد اپنی شہرت کے کھیل دیکھ رھا ھوں ، وہ زندگی کی ستم ظریفی تھی یہ موت کی چھیڑ ھے -

پوچھتے ھیں وہ کہ غالب کون ھے
کوئی بتلاؤ کہ ھم بتلائیں کیا

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اس مرقع چغتائی کو کیا کہوں ؟ (اگر میرے اشعار تصویر کے نیچے نہ لکھے ہوتے تو میں بھی ان تصویروں کو نہ سمجھتا) خیر تو ان لکیروں اور رنگوں سے میرے شعروں کا مطلب سمجھایا گیا ہے۔ نہ دیوان غالب ہوتا نہ تصویر بنانے والا اپنا یہ کمال دکھا سکتا۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

بہر حال غزل کے مطلب کو تصویر کے پردوں سے ظاہر کرنے کی ادا کو میں کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا زیادہ تر تصویریں بے لباس ہیں۔

شوق ہر رنگ رقیب سرو ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

خیر اتنا تو ہؤا کہ "چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط" ایک جگہ جمع کر دیے گیے۔ حسینوں کے خط یعنی ان کی شوخ طبیعت، ان کے چنچل مزاج کی وہ تصویریں جو میرے اشعار میں اکثر دکھائی دیتی ہیں اور یوں تو حسینوں کے خطوط بھی معلوم۔

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتاں ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

خیر مشہور ہوئے تو کیا اور نہ ہوئے تو کیا ! میرا وہ فارسی کلام جس کا ہندوستان میں جواب نہیں تھا وہ اس دکان میں نظر نہیں آتا۔ میرے چند اشعار سے اگلے وقتوں کے لوگوں کو اور ممکن ہے آج کل کے لوگوں کو بھی یہ دھوکا ہو کہ میں نے اپنی شہرت کی ساری وجہ اپنے فارسی کلام کو جانا تھا اور اردو کی قدر و اهمیت کو میں نہیں سمجھتا تھا۔ یہ ایک مزیدار دھوکا ہے۔ آردو آگے بڑھ کر کیا کچھ ہونے والی تھی اسی کی جھلک میں دیکھ چکا تھا۔ میرے آردو کلام

کے چند شعر جن میں فارسی زیادہ تھی لوگ لے اڑے تھے اور یہ نہ دیکھ سکے تھے کہ میں نے اردو غزل کتنی چنچل ، کتنی ٹکسالی ، کتنی جیتی جاگتی ، بولتی چالتی چیز بنا دی تھی - اگر میں اردو کی اھمیت کو نہ سمجھتا تو اپنے ان خطوط کو جن میں میں نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا تھا ، اس احتیاط اور اس اهتمام سے بچا کر نہ رکھتا - قریب قریب سب سے چھوٹا اردو دیوان میں نے چھوڑا تھا اور مجھے یقین تھا کہ سب سے زیادہ میرے ھی اشعار لوگوں کی زبان پر ھوں گے -

اب یہاں مجھے بہت دیر ھو چکی - کتاب بیچنے والا بھی اپنے دل میں کیا کہتا ھوگا - یہ ایک اخبار رکھا ھؤا ھے - کیوں بھئی اس پر آج ھی کی تاریخ ھے نا ؟ اچھا تو آج ۲۳ جون ۳۸ ھے - مجھے کچھ یاد آتا ھے کہ میں ۱۸۶۹ ء تک زندہ تھا - اس کے بعد دوسری دنیا کی زندگی تھی اور اس میں ماہ وسال کہاں ؟ آج دنیا سے گئے ھوئے ستر برس ھونے کو آئے ، اتنے بڑے عرصے میں ، میں محض اپنی شہرت اور کامیابی کا حال جان کر خیر ، ایک طرح خوش تو ھوں - لیکن یہ جاننے کے لیے بے چین ھوں کہ ھندوستان میں اب کیسی شاعری ھو رھی ھے ؟ کوئی کتب خانہ تو پاس ھوگا - لوگ کسی ھارڈنگ لائبریری کا پتہ دے رھے ھیں - اچھا دیکھو یہاں کیا ھے - داغ ، امیر ، حالی ، اکبر ، اقبال ، حسرت موھانی ، جگر ، اصغر ، شاد عظیم آبادی ، عزیز ، جوش اور دوسرے شعرا کے مجموعے یہاں نظر آ رھے ھیں - ان میں داغ اور امیر کو تو میں پچھلی زندگی ھی میں جانتا تھا - حالی تو میرے سب سے ھونہار شاگردوں میں تھے - اکبر سے بیسیوں برس پہلے اس دوسری دنیا میں ملا تھا جہاں سے خود آیا ھوں اور جہاں تمام مرے ھوئے شعرا کے ساتھ یہ سب بزم سخن کی رونق بن گیے ھیں - وھاں اکبر کا ساتھ چھوڑنے کو تو جی نہیں چاھتا تھا ، اور اقبال تو ابھی ابھی وھاں پہونچے ھیں - اس شخص کی شہرت وھاں برسوں پہلے پہونچ چکی تھی اور فرشتوں کی زبانوں پر اقبال کے نغمے برسوں پہلے سے تھے - میں نے اردو میں جس طرح کی شاعری کی داغ بیل ڈالی تھی ، شاعری کو جو عظمت دینا چاھا تھا ، میری یہ کوشش اقبال ھی کے ھاتھوں پروان چڑھی - حسرت موھانی کا کلام دیکھا - مومن ، جرأت ، مصحفی کا نام اس کلام سے چمک گیا - جگر ، اصغر ،

شاد، عزیز، چکبست اور سرور جہاں آبادی ان سب کی شاعری اپنی اپنی جگہ اونچی ہے لیکن کہیں کہیں روک تھام اور گہری نظر کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ دیکھوں یہ یاس یگانہ کون شخص ہے اور اس کی آیات وجدانی میں کیا ہے؟ شعر تو جاندار ہیں، بیان کا طریقہ بھی استادانہ ہے۔ آتش کی گرما گرمی اور تیزی بھی مل جاتی ہے لیکن غالب کا نام اس شخص پر بھوت کی طرح سوار ہے۔ خیر۔ ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی''۔ مرزا قتیل کی یاد تازہ ہو گئی۔ غالب نہ جانے کتنے شاعروں کی دکھتی ہوئی رگ ہے۔ میں اردو میں مسلسل نظم کی ترقی دیکھ کر خوش ہوں۔

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کیلئے

غزل ہو یا نظم، سنجیدگی، مذاق کی پاکیزگی، معنی آفرینی اور پست خیالی سے بچنا وہ خوبیاں ہیں جو شاعری کو پیغمبری کا درجہ دیتی ہیں ہاں کچھ عجیب اور غلط باتیں بھی میرے بعد کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ایک صاحب غالب کی جانشینی کا دعویٰ یوں کرتے ہیں کہ جس طرح میر کے ستاسی برس بعد غالب کا زمانہ آیا اسی طرح غالب کے ستاسی برس بعد وہ پیدا ہوئے۔ حالانکہ ہر وقت اور میرے زمانہ کے ستاسی برس بعد بھی بیوقوف دنیا میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اپنے کچھ اچھے کچھ برے اشعار کو لوگ الہام بھی بتانے لگے ہیں۔ اپنی غلط اور بے ڈھنگی نقالی بھی دیکھتا ہوں بہت ہو رہی ہے۔ مہمل فارسی ترکیبیں ایک رسمی قسم کی مشکل پسندی، لفظ پرستی اور شعریت سے معرا بلند آہنگی اور اظہار علمیت، یہاں تک کہ غیر موزوں کلام کو بھی شاعری بتانا یہ سب باتیں بھی آج کل کے شعرا میں آ گئی ہیں۔ میں اردو نثر اور رسالوں اور اخباروں کی کثرت اور آب و تاب دیکھ کر بھی خوش ہوں۔ رقعات غالب گویا اس بات کی پیش گوئی تھے۔ یہ سب صحیح، لیکن دلی کی پچھلی صحبتیں یاد آ گئیں اور دل کو تڑپا گئیں۔ اب نہ ذوق ہیں نہ مومن و شیفتہ، نہ حالی نہ داغ، نہ مجروح نہ انوراؤ نہ میں۔ خیر شعر و شاعری ہی تو ساری زندگی نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ملک پھر بیدار ہو رہا ہے۔ اس کی تمام

قوتیں مل کر ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں - اپنے شعر یاد آ رہے ہیں -

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

میری نظریں یہ بھی دیکھ کر خوش ہیں کہ انگریزوں کی تہذیب اُن کے علم و فن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی ہندوستان اپنی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ پھر سے چاہتا ہے -

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
مانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

آم بک رہے ہیں ، لیکن اب اس دنیا کے آم کیا کھاؤں ! جن کے بارے میں میرا قول تھا کہ بس میٹھے ہوں اور بہت سے ہوں ! یہ تو جنت کا پھل ہے اور وہاں کے آم سیر ہو کر کھاتا ہوں - اب شام ہو رہی ہے ، میں صرف ایک پل کے لیے اس دنیا میں آیا تھا - شاید مجھے آئے ابھی کچھ وقت نہیں ہؤا اور پل مارتے میں نے یہ سب کچھ دیکھ لیا - دوسری دنیا کا ایک پل اس دنیا کی کئی صدیوں کے برابر ہوتا ہے - ہم اہل عدم ایک پل میں جو کچھ دیکھ لیتے ہیں دنیا میں اس کے لیے ایک عمر چاہیے - اب نہ وہ دلی ہے نہ ستر برس پہلے کا زمانہ ، نہ مرزا (ہرگوپال تفتہ) ہیں کہ اس بے سرو سامانی میں میری پیاس بجھائیں - اب تو قرض کی بھی نہیں پی سکتے - اخباروں سے یہ بھی معلوم ہؤا کہ اب شراب اس ملک میں بند ہونے والی ہے -

مے بہ زہاد مکن عرض کہ ایں جوہر ناب
پیش ایں قوم بہ شوربۂ زمزم نرسد

ہندوستان بہت بدل چکا ہے لیکن اگلے وقتوں کے لوگ معلوم ہوتا ہے ابھی باقی ہیں -

اگلے وقتوں کے ھیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ھیں !

خیر شراب سے نشاط اور خوشی کس کافر کو درکار ھے۔

یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاھیئے —— اور وہ بے خودی مجھ پر چھاچکی ھے۔ دنیا کے حسن کے کرشمے دیکھ چکا۔ میں اس تماشہ کو قیامت کہتا ھوں۔ میں خاک ھو چکا تھا،

بجز پرواز ناز شوق کیا باقی رھا ھوگا
قیامت اک ھوائے تند ھے خاک شہیداں پر

پھر آنکھ کھل گئی۔

ھم وھاں ھیں جہاں سے ھم کو بھی
اب ھماری خبر نہیں آتی

———

حالی

(۱)

حالی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا - ستتر برس کی عمر پائی - جس پانی پت میں ان کی آنکھ کھلی اسی پانی پت میں ان کی آنکھ بند ہوئی - میں نے اور شاید آپ نے بھی سات آٹھ برس کی عمر میں پہلے پہل حالی کا نام سنا ہوگا - آج تو حالی کے نام پر آنکھوں میں کچھ آنسو سے تھر تھرا آٹھتے ہیں اور دلوں میں ایک نرم کسک سی پیدا ہو جاتی ہے - لیکن ۱۹۰۷ء میں ''احسن الانتخاب'' نامی کتاب جو کورس میں داخل تھی ، اس میں حالی کا لکھا ہؤا رحم اور انصاف کا جھگڑا پڑھا - نظم کچھ اچھی لگی کچھ بری - جب وطن والی نظم بھی اس عمر میں کچھ مزیدار اور کچھ مشکل معلوم ہوئی - برکھا رت والی نظم بھی آئی اور گزر گئی - کہیں مناجات بیوہ والی نظم اسی کورس کی کتاب میں مل جاتی تو البتہ کلاس کا کلاس رو پڑتا - معلوم نہیں مناجات بیوہ کو کورس میں شامل نہ کرکے مؤلف نے ہم لوگوں پر رحم کیا یا ظلم کیا ! اس کا فیصلہ میں اب تک نہیں کر سکا ہوں ، اگرچہ اس نظم سے برسوں تک محروم رکھے جانے کی شکایت اب تک میرے اور غالباً بہتوں کے دلوں میں ہے - یہ تو ہوا اسکول کا حال ، اب حالی کو جس طرح میں نے گھر پر جانا" اس کا حال سنیے - میرے والد مرحوم منشی گووکھ پرشاد عبرت ، حالی کی نثر و نظم اور حالی کی غزل اور حالی کے نام پر جان دیتے تھے - لیکن میرے پھوپھی زاد بھائی بابو راجکشور لال سحر پر جادو چل چکا تھا امیر اور داغ کا - گھر میں دو پارٹیاں ہو گئی تھیں - حالی پارٹی میں تنہا والد مرحوم تھے ، اور امیر و داغ پارٹی میں سحر بھائی اور ہم لڑکے - میں چودہ پندرہ برس کا تھا - گھر کے کتب خانہ میں والد نے

اپنے شوق سے تو حالی کی کل کتابیں مثلاً دیوان حالی، مقدمہ شعر و شاعری ، یاد گار سعدی ، یاد گار غالب ، حیات جاوید منگا کر رکھ لی تھیں، اور بھائی صاحب کی تحریک سے امیر اور داغ کے دیوان اور پیام یار کے پرچے آیا کرتے تھے - باپ سے بے تکلف ہونے میں تو ادب مانع تھا لیکن بھائی صاحب سے میں بہت ھلا ملا تھا وہ دونوں شاعر تھے ، میں نہیں تھا -

اسکول کا زمانہ ادھر آیا اُدھر آ گیا - میور سنٹرل کالج الہ آباد میں جب ۱۹۱۳ء میں داخل ہؤا تو امیر مینائی کا کلمہ پڑھتا ہؤا داخل ہؤا - بڑے بڑے عالم و فاضل، ادھیڑ عمر والے اور بڑے ، اڈیڑ ، ٹیچر اور پروفیسر ، امیر و غریب ، راجے اور نواب ، معمولی حیثیت کے لوگ اور پھٹے حال سبھی حالی کے نام کو تو محض تبرک سمجھتے تھے اور امیر و داغ کے اشعار پر سر دھنتے تھے، اور وہ بھی ان کے بلند پایہ یا کامیاب ترین اشعار پر نہیں - اپنےاسکول اورکالج کی تعایم کی ڈگری کا گھمنڈ ذرا کم ہو جاتا ہے ، جب مجھے یہ یاد آتا ہے کہ طلباء میں اور پروفیسروں میں کسی نے بھی مجھ سے حالی کا ذکر نہیں کیا - آج بھی نظیر اکبر آبادی کا نام پھر سے ابھر رہا ہے اور پہلے پہل اس کا پتہ چل رہا ہے کہ نظیر اکبر آبادی کوئی ایسا ویسا شاعر نہیں ہے ، لیکن ابھی ہماری یونیورسٹیوں کو نظیر اکبر آبادی کی قدر و منزلت کا احساس نہیں ہو سکا ہے - خیر جب میں بی - اے کلاس میں آیا تو کالج میں اورنٹیئل سوسائٹی نے جنم لیا - میں اس کے سرگرم ممبروں میں تھا ، شاید میں اس سوسائٹی میں کسی عہدہ پر بھی تھا - لیکن میں نے جو مقالہ اس سوسائٹی میں پڑھا اور جس کی بہت دھوم ہوئی وہ امیر مینائی پر تھا - حالی پر کسی نے کچھ نہیں پڑھا - آج اگرچہ حالی کا کلام اور حالی کا مقدمہ شعر و شاعری بی اے اور ایم - اے کے کورس میں داخل ہے اور آئی ، سی ، ایس ، پی ، سی ، ایس کے پرچوں میں بار ھا حالی پر سوالات آ چکے ھیں، پھر بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر یونیورسٹی والوں کو حالی سے کچھ شکایت سی ہے - اس الزام سے علی گڑھ یونیورسٹی بری ہے -

اب سے پچھتر برس پہلے بلکہ کچھ اس سے بھی پہلے حالی نے اپنا راگ چھیڑا تھا - اس راگ میں بظاھر نہ کوئی بغاوت تھی ، نہ کوئی

نعرۂ انقلاب تھا اور نہ کوئی انمل بے جوڑ بات تھی ۔ اس راگ میں تو اتنا بھی نیا پن نہیں تھا جتنا غالب اور مومن کے نغموں میں تھا ، بلکہ سادگی میں تو حالی کی لے، ذوق کی آواز اور ظفر کی راگنی سے بھی بڑھی ہوئی تھی ۔ حالی کہتے تو بس اتنا تھے کہ دو اور دو چار، لیکن ان کے کہنے میں ، ان کے لفظوں میں نہیں ، بلکہ ان کے لب و لہجہ میں ایک بہت ھلکی سی چٹکی ھوتی تھی ، آواز میں ایک ذرا سی تھر تھراھٹ ھوتی تھی ، سانس میں تازگی اور افسردگی کا ایک میل ھوتا تھا اور نگاہ میں ایک چونکا ھؤا بھولا پن ھوتا تھا ۔ آپ اجازت دیں تو اس طرح کے کچھ شعر حالی کی پرانی غزلوں سے سناؤں :—

تھا آفت جاں اس کا انداز کمانداری
ھم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ھوتا

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھ کو خبر ھوتی
میری ھی طرح تو بھی غیروں سے خفا ھوتا

ھم روز وداع اس سے ھنس ھنس کے ھوئے رخصت
رونا تھا بہت ھم کو روتے بھی تو کیا ھوتا

جو دل پہ گذرتی ھے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ھم سے سنا ھوتا پھر تو نے کہا ھوتا

جو جان سے در گزرے وہ چاھے سو کر گزرے
گر آج نہ تم آتے کیا جانیے کیا ھوتا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہونچا مری رسوائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ھے شکیبائی کا

ایک دن راہ پہ جا پہونچے ھم
شوق تھا باد یہ پیمائی کا

بزم دشمن میں نہ جی سے اترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا

قلق اور دل میں سوا ہو گیا
دلاسا تمہارا بلا ہو گیا
دکھانا پڑے گا مجھے زخم دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا *
ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہامگر نہ کھلے راز داں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
خود رفتگیٔ شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں
یونہی گذرے تو سہل ہے لیکن
فرصت غم کو بھی ثبات نہیں
قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

آپ نے دیکھا کہ جوں کی توں بات کہنے میں حالی اس نرمی سے ایک کن دے دیتے ہیں کہ سامنے کی بات، آئے دن کی بات، جانی بوجھی ہوئی بات، جگ بیتی بات ایک نرم اچانک پن کے ساتھ پتے کی بات ہو جاتی ہے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جسے ہم کھلی ڈھلی چیز سمجھتے تھے وہ کھلی ڈھلی چیز بھی ہے اور بھید بھری بات بھی۔ حالی کے جذبات و تخیل کا، حالی کی شاعری کے رس کا اور حالی کے اسٹائل کا یہی راز ہے۔

---

* والد مرحوم عبرت گورکھپوری کے کلیجے کا ٹکڑا تھا یہ شعر۔ گنگناتے تھے اور وجد کرتے تھے۔ فراق

غالب اور مومن کا آخری زمانہ تھا جب حالی نے وہ نغمہ سرائی شروع کی جس کے بارے میں کانوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ کوئی آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہے یا گنگنا رہا ہے۔ دوسری طرف، میر اور داغ کی محفلوں میں ساز و آواز کا وہ عالم تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ حالی کی شاعری نقارخانہ میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی۔ حالی کے یہ اشعار :—

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

اس قہقہہ میں اڑ کر رہ گئے جو داغ کے اس شعر سے پیدا ہؤا تھا :—

میخانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغ
ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں

حالی تو اپنی لے یوں چھیڑتے تھے :—

اس کے جاتے ہی ہوئی کیا مرے گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

لیکن جب داغ یہ کہتے تھے :—

بزم دشمن میں نہ کھلنا گل تر کی صورت
جاؤ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صورت

اس کے آتے ہی یہ ہوتی ہے نظر کی صورت
ہر بشر دیکھتے لگتا ہے بشر کی صورت

تو لوگ بات کو لے اُڑتے تھے اور حالی کی بات جہاں کی تہاں رہ جاتی تھی - اسی زمانہ میں اُردو کے ایک شاعر کے وہ نغمے جن میں پوری زندگی کی کسک اور سکون دونوں سموئے ہوئے تھے سن کر ان سنے کر دیئے جاتے تھے - میری مراد شاد عظیم آبادی سے ہے - اسی زمانہ میں آسی غازی پوری نے ناسخ اور میر کی آوازوں کو ملا کر ایک کر دیا تھا لیکن اس وقت کے لوگوں نے جہنم کی بھڑکتی ہوئی چنگاریوں کو فردوس کے شگوفوں سے زیادہ چمکدار اور رنگین سمجھا - مجھے پہلے پہل حیدر آباد سے نکلنے والے رسالہ ذخیرہ میں جو منشی پریم چند آنجہانی کے پاس آیا کرتا تھا - حالی کے رنگ تغزل پر عبدالماجد صاحب دریا بادی کے ایک مضمون نے چونکایا - میری عمر اٹھارہ انیس سال کی رہی ہوگی - حالی کا کلام بڑا بدن چور کلام ہے - بہتوں کی نظر میں یہی حال سعدی کی ''گلستاں'' کا ہے - بچپن ہی میں وہ سامنے آئی ہے لیکن اس کی جادو بھری سادگی اس کی من موہ لینے والی بات کا پتہ ذرا آگے چل کر ملتا ہے - حالی کے دل و دماغ کو رچانے میں کلام سعدی نے کیا کام کیا آسے حالی کا تمام کلام بتا رہا ہے اب بھی نہ مانو تو حالی کی لکھی ہوئی حیات سعدی دیکھ لو - آزاد نے آب حیات میں سوز دھلوی کو اردو کا سعدی لکھا ہے - سوز اور سعدی میں بھی مشابہت ہوگی - لیکن کلام حالی میں کلام سعدی کی جیسی مکمل عکاسی پائی جاتی ہے اس کی مثال ار،و میں ملنی محال ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ جو انسانیت و ہمدردی حالی کے واعظانہ اور قومی شاعری میں باوجود اس کی سادگی کے موجود ہے اس رنگ میں وہ سعدی کے یہاں نہیں ہے - سعدی ہمارے لیے تھا - حالی ہم میں سے ہیں - وہ سعدی سے پند و وعظ کے میدان میں اور حیات و کائنات کے مرکزی حقائق پر قدرت رکھنے یا بیان کے جادو میں کم ہیں - لیکن شائد اسی وجہ سے اور قوم کے احساس غلامی کو اپنانے کی وجہ سے حالی کا لہجہ کچھ حساس زیادہ ہے سعدی عقلی اور اخلاق حقائق لکھتا ہے - حالی کے بے لاگ ٹھہراؤ میں ایک تھر تھراھٹ سی ہے - حالی کی آواز میں ایک نیم ساکت ھچکچاھٹ سموئی ہوئی ہے -

جب مجھ پر حالی کا جادو چپ چاپ چل گیا اور ایک خاموش ھنگامہ میرے اندر پیدا ہو گیا تو میں نے دل ہی دل میں یہ سوچا کہ لوگ حالیؔ کے یہاں شعریت اورِ تغزل کےِ قائلِ کیوں نہیں ہوتے - جس

وقت حالی کی آواز کان میں پڑی اس وقت دلی میں زندگی اور شاعری کے چراغ کی روشنی پھیکی پڑ چلی تھی - ہر چند غالب ، مومن ، ذوق اور شیفتہ موجود تھے - لیکن جو لوگ حالی کی شاعری کو خاطر میں نہیں لاتے - کیا انہوں نے اپنے آپ سے کبھی یہ سوال کیا ھے کہ غالب کی نظروں میں حالی کی شاعری کیا چیز تھی - حالانکہ روایتی اور عقیدتی شاگردی اور ہر طرح کی ہم نشینی اور ہم آھنگی کے باوجود حالی کی قدیم غزلوں پر بھی غالب کی پرچھائیں تک نہیں پڑی ھے - حالی کے تغزل پر براہ راست کسی کا اثر پڑ سکتا تھا اور پڑا تو شیفتہ کا اور بالواسطہ مومن کا حالی پر کبھی کبھی دور سے سوز کی ھلکی سی پرچھائیں پڑ جاتی ھے - بلکہ ناباں ، حاتم ، قائم ، اثر اور یقین کی بھی جن کے چہچہوں کو حالی نے اپنے دل کی دبی ھوئی چوٹ بنا لیا تھا - لیکن ابھی ایک نام اور ھے وہ آپ کو یاد نہ آیا ھو تو میں یاد دلادوں وہ نام ھے داغ کا - آپ کہ سکتے ھیں کہ داغ کے ھوتے ھوئے یہ کیونکر مان لیں کہ حالی کے وقت میں دھلی اسکول کی روایتیں دنیا سے اٹھ چکی تھیں - لیکن سچ پوچھئے تو دلی کے تغزل کی روایتیں حالی ھی کے دھیمے سروں میں زندہ تھیں اور داغ کی لہکتی ھوئی آوازوں میں وہ کچھ سے کچھ ھو گئی تھیں -

میں نثر و نظم میں حالی کے اس تمام کلام کا نام لے چکا ھوں جو میرے گھر کے کتب خانہ میں موجود تھا - لیکن اس مجموعہ میں مناجات بیوہ والی نظم نہ تھی یا مجھے نہ ملی - ادھر زندگی کے انتشار اور بے فرصتی نے بھی مدتوں موقع نہیں دیا کہ اس نظم کو دیکھ سکوں - دس بارہ برس ھوئے جب اتفاق سے یہ نظم میرے ھاتھ لگی اور دل میں اس طرح ہر شعر کے ساتھ اترتی گئی کہ ایسا احساس ھوتا تھا - "پڑتی ھے وہ چوٹ جو ابھرتی بھی نہیں" - صرف چند شعر سنئے :—

اے سب سے اول اور آخر
جہاں تہاں حاضر اور ناظر

اے بالا ہر بالا تر سے
چاند سے سورج سے امبر سے

سب سے انوکھے سب سے نرالے
آنکھ سے اوجل دل کے اجالے

ناؤ جہاں کی کھینے والے
دکھ میں تسلی دینے والے
جب اب تک تجھ سا نہیں کوئی
تجھ سے سب تجھ سا نہیں کوئی
بید نرا سے بیماروں کا
گاھک مندے بازاروں کا

پھر سنئے :—

آئیں بہت دنیا میں بہاریں
عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں
پڑے بہت باغوں میں جھولے
ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں
برسیں کھلیں بہت برساتیں
پھر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی
وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی
آس ھی کا یاں نام ھے دنیا
جب نہ رھی یہ ھی تو رھا کیا
حکم سے تیرے پر نہیں چارا
کڑوی میٹھی سب ھے گوارا
تجھ سے کہیں گر بھاگنا چاھیں
بند ھیں چاروں کھونٹ کی راھیں

آخری اشعار سنیے جہاں تسلی اور ڈھارس کے بول رونے دھونے سے بھی بڑھ کر کام کر جاتے ھیں اور جہاں نظم کے خاتمہ کی خاموشی زمین اور آسمان کی ازلی اور ابدی خاموشیوں میں جا کر ڈوب جاتی ھے :—

دکھ سے یہاں کے گھبرانا کیا
سکھ پہ یہاں کے اترانا کیا
عیش کی یاں مہلت ھے نہ غم کی
سب یہ نمائش ھے کوئی دم کی

آنی جانی چیز ہیں خوشیاں
چلتی پھرتی چھاؤں ہے ارماں
منگنی، بیاہ، برات اور رخصت
میل، ملاپ، سہاگ اور سنگت
ہیں دو دن کے سب بہلاوے
آگے چل کر ہیں پچتاوے

اردو شاعری میں تین سو برس کے اندر عورت پر کئی نظمیں کہی گئی ہیں لیکن حالی کی اس نظم کے مقابلے میں ان کا یہ حال ہے کہ ''سو تکلف اور اس کی سیدھی بات''، لیکن افسوس ہے کہ حالی کی حقیقت کو لوگ اس زمانہ میں سمجھے ہی نہیں۔ حالی کو بھول جائیے اور مصحفی کو لیجیے، امیر مینائی کی قابلیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے لیکن اپنے استاد کے استاد مصحفی کے دو ڈھائی ہزار اشعار کا جو انتخاب انہوں نے شائع کیا ہے اس کو دیکھ کے حیرت ہوتی ہے کہ مصحفی کا نام ان کے تلف ہو جانے سے جتنا نہ مٹتا اس سے زیادہ اس انتخاب سے مصحفی کا نام مٹ گیا۔ لکھنؤ کے مذاق نے شاعری کی جو خدمتیں بھی کی ہوں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس نے شعر فہمی کو عجیب چیز بنا دیا۔ جرأت اور مصحفی کے زمانہ تک لکھنؤ میں جو کچھ بھی ہؤا ہو لیکن ناسخ کے بعد سے آتش، انیس، امانت اور امیر مینائی اور ان کے بعد چکبست بھی اپنے تمام اختلافات کے باوجود لکھنؤ اسکول کی وہ عام اور خاص صفت رکھتے ہیں جہاں ایک بات بھی بے تکلف نہیں ہوتی، جہاں الفاظ معنی پر حاوی ہوتے ہیں، یا جہاں معنی زیادہ سے زیادہ الفاظ کے لغوی مفہوم تک محدود رہتا ہے، الفاظ سے آگے کبھی نہیں بڑھتا، جہاں آواز خاموشی پر چھا جاتی ہے، جہاں زور بیان سادگی و نرمی کو دبا لیتا ہے۔ اس شاعری میں الفاظ و معانی تو صاف نظر آتے ہیں لیکن ان کی تہوں کا احساس نہیں ہوتا نہ ان کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ لکھنؤ اسکول کی مضمون آفرینی میں اگر غور کریں تو ایک نہایت مجہول، معذور، بے بس اور قابل رحم سادگی ہے۔ اس کے تمام زور بیان میں ایک مفلوجیت اور مجہولیت ہے۔ اس میں دقتی ہنگامہ ہے، اس میں پر کار و جریب کی سی پیمائش ہے۔ اس میں صنعت تمثیل و تشبیہ ہے لیکن وہ چیز نہیں ہے جسے

واقعی تغزل کہ سکیں اور اسی لیے لکھنؤ حالی کی شاعری کو نہ پہچان سکا - لکھنؤ کے کئی شعرا کے یہاں بہت کچھ ہے لیکن یہاں ذکر لکھنؤ اسکول کا ہے -

. آپ کہیں گے کہ اگر حالی کا کلام سادہ ہے تو اہل لکھنؤ بھی تو سادگی کی داد دیتے ہیں - میں عرض کرتا ہوں کہ حالی کے وقت کا لکھنؤ وہ لکھنؤ نہ تھا جب میر و سوز دہلی سے آئے اور جب جرأت اور ان کے اُستاد حسرت کے سادہ و شیریں کلام پر لوگ جان دیتے تھے - حالی کے زمانہ میں لکھنؤ جس ''سادگی'' کا قدر شناس تھا اس کی مثال امیر مینائی کا یہ شعر ہے -؛

خنجر نے ترے دیا نہ پانی
ترسا ترسا کے مار ڈالا

لیکن حالی کی سادگی ایسی سادگی تھی جو زبان و الفاظ سے نہیں بلکہ خلوص و وجدانی معصومیت سے پیدا ہوتی ہے :—

کر دیا خو گر جفا تو نے
خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

یا :—

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ
ہو گئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

حالی کی طنز بھی انشا ، پیارے صاحب رشید ، جاوید اور تعشق والی طنز نہ تھی - لکھنوی طنز کی یہ مثال ہے :—

پیارے صاحب رشید :—

مار ڈالے گی مجھے یہ خوش بیانی آپ کی
موت بھی آئے گی مجھ کو تو زبانی آپ کی

خاک حسرت دے گیے دلہائے ویراں لے گیے
آپ کے دیوانے ساتھ اپنے بیاباں لے گیے

جاوید :—

منت کا ذکر کیا یہ اسیروں کا صبر ہے
اپنے گلے میں آپ نے زنجیر دیکھ لی

غالباً تعشق :—

باغ میں پھولوں کو روند آئی سواری آپ کی
کس قدر ممنون ہے باد بہاری آپ کی

اب حالی کی طنز سنیے :—

واعظو آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گیے ڈر کی صورت
ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت
قافلے گزریں وہاں کیونکر سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن و راہنما ایک ہی شخص

یا :—

کبک و قمری میں یہ جھگڑا ہے چمن کس کا ہے
کل خزاں آکے بتادے گی وطن کس کا ہے

میں کہہ چکا ہوں کہ حالی نے نغمہ سنجان دھلی تک کے چہچہوں کو اپنے دل کی چوٹ بنا لیا تھا ۔ حالی کی غزلوں اور نظموں کے متفرق اشعار الگ الگ چھل بل نہیں دکھاتے ۔ ان کا اثر تدریجی طور پر آہستہ آہستہ ہوتا ہے میں نے خود جب حالی کی نظم چپ کی داد'' کا مطلع دیکھا ۔

اے ماؤ ، بہنو ، بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے

تو میں اچھی طرح ہوش سنبھال چکا تھا لیکن پھر بھی میں نے کہا یہ کیا شاعری ہے ، کہیں ماؤ ، بہنو ، بیٹیو شعر میں لکھا جاتا ہے ؟ لیکن روکھا سوکھا آغاز نظم رفتہ رفتہ نشتریت میں بدلنے لگا اور

بادل نا خواستہ بالکل نیم شعوری طور پر مجھے اس کا احساس ہؤا کہ نظم ایک کارنامہ ہے جس میں شعریت کی دیوی کل سنگار اتار کر صرف اپنے بھولے بھالے حسن کا وہ کرشمہ دکھا رہی ہے جس سے متاثر ہو کر وجدان بچوں اور فرشتوں کی معصومیت حاصل کر لیتا ہے اس نظم کی لہروں میں سکون ہے اور اس کے سکون میں لہریں ہیں۔ ایک خصوصیت حالی کی زبان کی نثر و نظم اور غزل سب میں قابل ذکر یہ ہے کہ حالی کی زبان انتہائی طور پر سادہ ہے۔ نظیر اکبر آبادی کو چھوڑ کر ذوق و ظفر کی زبان بھی اتنی سادہ نہیں۔ حالی کی زبان نہ میر کی زبان ہے نہ غالب کی اور اتنی سہل ہوتے ہوئے بھی وہ داغ و امیر کی زبان بھی نہیں ہے۔ نہ وہ درد اور سوز دہلوی کی زبان ہے۔ دور سے جھلکیاں سب اہل دہلی کے لہجوں اور آوازوں کی اس میں نظر آ جائیں یہ اور بات ہے لیکن حالی کی زبان خاص حالی کی چیز ہے اور نہایت مہذب و سنجیدہ ہے۔ لوگوں نے حالی کی سادگی کو کبھی خشکی اور کبھی بے کیفی اور بے رنگی سمجھا اس کا سبب یہ تھا کہ لوگ ادب و شعر کو یا تو گدگدی پیدا کرنے والی چیز سمجھتے تھے جس میں کچھ رنگ رلیاں ہوں یا پھر آسمانوں پر آڑالے جانے والی چیز سمجھتے رہے۔ معمولات سے، آئے دن کی باتوں سے ادب کا ہم کوئی تعلق نہیں سمجھتے تھے اور حالی کے اعتدال نے، ان کے وجدان میں واقعیت کے عنصر نے، ان کی سلامت روی اور میانہ روی نے اور بقول مجنوں ان کے ماتھے پر بغیر بل ڈالے بات کہنے کے انداز نے، مانوس باتوں کو مانوس الفاظ میں کہنے کی ادا نے ہمارے لئے حالی کو غیر مانوس بنا دیا تھا۔ ادبی ذوق بچپن سے شروع ہو کر پچیس برس کی عمر تک بہت کچھ بن چکتا ہے لیکن حالی کا کلام عموماً ذرا اس عمر کے بعد کارگر ہونا شروع ہوتا ہے خود مجھ پر جیسا میں بتلا چکا ہوں اگرچہ اٹھارہ انیس برس کی عمر میں حالی کا جادو چل گیا تھا لیکن اس کا مستقل اثر ہونے میں برسوں گزر گئے۔ کیونکہ حالی کے کلام سے متاثر ہونے کے لئے عالم و فاضل ہونا، پروفیسر و اڈیٹر ہونا، ادیب و نقاد ہونا، کامیاب شاعر ہونا جوان اور عاشق ہونا، کافی نہیں بلکہ اس کے لئے سب سے پہلی اور آخری شرط آدمی ہونا ہے۔

بہر حال یہی کیا کم ہے کہ حالی کے مرنے کے بعد ہی حالی کی اہمیت کے بارے میں جو چور دلوں میں تھا وہ چھپ نہ سکا۔ لوگ

کب تک احساس کو بے حسی بنائے رہتے ؟ لوگوں نے دیکھا کہ حالی کے زمانہ میں کسی شاعر نے نہ تو مسدس ایسی اہم نظم لکھی نہ اتنے مختلف اصناف سخن پر کوئی اور قلم اٹھا سکا ، نہ مرثیہ غالب ، نہ حالی کے قصائد ، نہ حالی کی رباعیات ، نہ حالی کی مثنویوں کا جواب کسی سے ہو سکا ۔ رہا حالی کا تغزل سو انکار کے بعد اگر مگر کی نوبت تو آ ہی گئی اور نظم سے دس گنا زیادہ حالی کی نثر کو لوگوں نے مفید پایا ۔ مقدمہ شعر و شاعری پر جب اچھی طرح لوگ جھلا چکے تو اس تلخ شربت کو گوارا کرنا ہی پڑا ۔ پھر حالی کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں تھیں جن میں ادب اور حیات کی نہایت سنجیدہ اور غیر جانبدارانہ قسم کی بحث تھی ، حالی کی نثر کے اور نمونے بھی سامنے آئے ۔ اتنے اصناف سخن پر حالی کے کارناموں کو دیکھتے ہوئے حالی کے ہمعصر شعرا کے حلقہ عمل (Range) کی تنگی کا احساس چور کی طرح دلوں میں سمانے لگا ۔ کس نے ایسا لکھا تھا ۔ پہلے حالی کی شخصیت کی قدر پیدا ہوئی پھر لوگوں نے گریبان میں منہ ڈالا تو کانوں میں بجائے داغ اور امیر کے نغموں کے حالی کے دھیمے سروں کی آواز آئی وہی آواز جسے سن کر ان سنا کر دیا گیا تھا ۔

اس کے بعد جب حالی کی شاعرانہ صلاحیت تسلیم کرلی گئی تو لوگ کہنے لگے کہ حالی کو سرسید نے بدراہ کیا ۔ یا ہم اس حالی کے قائل ہیں جس نے قدیم طرز کی غزلیں لکھیں لیکن جس حالی نے مسدس لکھا ، مقدمہ شعر و شاعری لکھا ، مناجات بیوہ ، چپ کی داد ، حب وطن ، برکھا رت لکھی ۔ ہم اس حالی کے قایل نہیں ۔ لیکن شاید اب یہ خیال بھی ڈانواں ڈول ہو رہا ہے اور یہ احساس ہو چلا ہے کہ دو حالی نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حالی ہے سرسید کے اکساؤ یا دباؤ سے صرف اتنا ہؤا کہ حالی کی شاعری کی زمین میں وسعت آ گئی ۔ لیکن اگر اس ہمہ گیری کی صلاحیت حالی میں نہ ہوتی تو سرسید کا اثر کچھ نہیں کر سکتا تھا ۔ حالی کی قوتیں تنگنائے غزل تک محدود رہ ہی نہیں سکتی تھیں وہ لطیف ترین عشقیہ شاعری کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ وطن و ملت کی شاعری کی صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے ۔ یہ بالکل مضحکہ خیز بات ہے کہ حالی سے غزلیں فطرت نے کہلوائیں اور نظمیں سرسید نے ۔ سرسید حالی کی اندرونی صلاحیتوں کے صرف خارجی محرک کہے

جا سکتے ھیں - ڈاکٹر نذیر احمد بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھے - اور انھوں نے بھی قومی نظمیں کہیں لیکن دونوں کا فرق ظاھر ھے - الغرض ان قدیم وجدید طرز کی غزلوں ، ان تمام نظموں اور اس مسدس کا جو حالی کی تصنیف سے ھیں مقدمہ شعر و شاعری اور نثر کی ان ضخیم تصنیفوں کا جن پر حالی کا نام لکھا ھؤا ھے ان سب کا مصنف ایک ھی غیر منقسم حالی ھے - نہ ان تصنیفوں میں کوئی تصادم ھے نہ کوئی انمل بے جوڑ بات ، حالی ایک ھے اور اس کی سب تصنیفیں بھی ایک ھی کتاب ھیں -

حالی کی نثر بھی ذرا صبر و تحمل سے پڑھنے کی چیز ھے - محمد حسین آزاد اپنی شاعری کو تو جادو نہ بنا سکے لیکن اپنی نثر کو انھوں نے سحر حلال بنا دیا - سرسید کی نثر ایک مدبر کے رواں دواں خیالات کا آئینہ ھے لیکن سرسید کی تمام قومی دلچسپیوں کے باوجود ان کی نثر میں ایک درد مند دل کی دھڑکنوں کا پتہ نہیں چلتا اس نثر کی اھمیت زیادہ تر صحافتی ھے - ڈاکٹر نذیر احمد نے ناول لکھے اور ان کا اسلوب بیان فطری بھی ھے ، سہل بھی دلچسپ بھی اور عالمانہ بھی - لیکن حالی کی نثر اولاً تو زیادہ مستقل اور اہم چیز ھے اور باوجود سادگی اور بے تکلفی کے اس میں بہت پختہ ادبیت پائی جاتی ھے - اس کی ھموار رفتار میں سنبھلی ھوئی کیفیت ھے ، ایک نازک احساس ھے - انصاف و ھمدردی ھر ھر فقرے میں سرایت کئے ھوئے ھیں ، اسی کے ساتھ ایک نرم تیکھا پن ایک دبی ھوئی چوٹ بھی ھے اور بیک وقت لچکدار ھونے اور ٹھوس ھونے کی صفت بھی حالی کی نثر میں ھے جو ڈرائیڈن (Dryden) کی یاد دلاتی ھے ھر چند اس نثر میں وہ چیز نہیں ھے جسے چمک دمک کہتے ھیں - لیکن ھے بڑی محتاط نثر - شاید حالی سے پہلے کوئی اردو نثر میں صحافت کے تمام اقسام اور کاروباری زندگی کے تمام پہلوؤں کے اظہار کی صلاحیت یا لچک نہیں پیدا کر سکا تھا - اس نثر کی ادبیت فضائی صفت رکھتی ھے وہ نمایاں بھی ھے اور پنہاں بھی ھے - حالی کی نثر ادب لطیف نہیں ھے جس سے بہت جلد طبیعت اکتا جاتی ھے - اس کی سنجیدگی ھی میں اس کے سدا بہار ھونے کا راز ھے - اس کی سادگی ھی میں اس کا رس ھے - شاید حالی کی نثر پریم چند کی نثر کی پیش گوئی ھے - اس زمانہ میں لکھنؤ پر سر شار کی نثر کا جادو چل رھا تھا - ریاض کی نثر اپنی شوخی اور سحر کاری دکھا رھی تھی اور اھل

لکھنؤ کا بچا کھچا ہوش و حواس اودھ پنچ کی نثر کی نذر ہو رہا تھا - شرر کی نثر ضرور سمجھ میں آنے والی چیز تھی لیکن حالی کی نثر کے مقابلے میں یہ بھی کم مغز و کم وزن چیز تھی - حقیقی ادب ادبیت سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ زندگی سے اور آدمیت سے پیدا ہوتا ہے - زمانہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے - اقبال کی شاعری کا نظریہ کل کی چیز معلوم ہونے لگا ہے - اکبر الہ آبادی کا پیغام پہلے بھی ایک معمہ تھا اب تو اور بھی معمہ ہو چلا ہے - چکبست کی قومی شاعری بھی کمھلا چلی ، شاید اس دور کی انقلابی شاعری ، مزدور اور سرمایہ دار کی شاعری بھی بہت حد تک بدل چکی - لیکن حالی ایک مخصوص ملت کے افراد کو مخاطب کرتا ہؤا ازلی وابدی انسانیت کا ثبوت دے گیا ہے - عورت پر جس نظریہ سے اکبر ، اقبال ، اور دوسروں نے نظمیں کہی ہیں اس سے حالی کا نظریہ کہیں زیادہ پاکیزہ ہے - ہاں یہ ضرور ہے کہ اب عورت وہ چیز نہ رہے گی جسے سمجھ کر حالی نے مناجات بیوہ لکھی لیکن چپ کی داد میں جو نظریہ ہے وہ ابھی بالکل بیکار نہیں ہؤا ہے - حالی کو ہم مستقبل کا شاعر تو نہیں کہہ سکتے لیکن اگر مستقبل میں بھی ماضی کے کارناموں کی کچھ باتیں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی - تو وہ حالی کے یہاں موجود ہیں - جب دنیا بالکل بدل چکے گی تو بھی حالی کے بارے میں یہ کہا جا سکے گا کہ کتنا شریف دل اس شخص کے سینے میں دھڑکتا تھا - حالی اردو شاعری اردو نثر میں ایک حساس عقلیت کا پیغمبر ہے اور اس کے کلام میں عقلیت کا تمام زور اور عقلیت کی کمزوریاں موجود ہیں - اسی سے غالباً ادب کی انتہائی منزلوں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں حالی کے یہاں ایک کمی کا احساس ہونا لازمی ہے - مثلاً حالی میں وہ پرواز اور اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جانے والی بات نہیں ہے - وہ احساس تحیر نہیں ہے جو آفاق ادب کی خصوصیت ہے اور نہ وہ اچانک کوندے جو میر - غالب - آتش - انیس اور اقبال کی آوازوں سے لپک جاتے ہیں -

(۲)

(چار برس بعد)

ہماری تاریخ ادب میں آج کا زمانہ صرف شاعری اور صرف غزلوں کا زمانہ نہیں ہے - نہ حالی صرف نظموں اور غزلوں کا ادیب ہے - حالی کی نثر ان کے منظوم کلام کی مقدار سے پندرہ بیس گنا زیادہ ہے اور حالی کی غزلوں سے تو قریب قریب سو ڈیڑھ سو گنا زیادہ ہے - حالی کی غزلوں میں کل تیرہ سو اشعار کے قریب ہیں - مشکل سے سو غزلیں دیوان حالی میں ہیں - کتنا مختصر دیوان ہے - حالی کے زمانے میں تو ایسے لوگ کم بہت کم تھے مگر وہ تھے اہل نظر جو حالی کی غزلوں کی صحیح قدر و قیمت آنک سکتے ہوں - لیکن ادھر کچھ دنوں سے حالی کی غزلوں سے غفلت کا حجاب اٹھ چلا ہے - رچی ہوئی سماعت والے حالی کی غزلوں پر اب کان دھرنے لگے ہیں - ملک کا مذاق سنور چلا ہے - لیکن حالی کی غزلوں پر تفصیل و وضاحت سے فکر و تامل سے کچھ کہنے سے پہلے مجھے کچھ اور باتیں کہہ لینے دیجئے -

اب سے پچتر برس پہلے اردو ادب میں جو بھاری بھر کم ہستیاں تھیں ان میں کچھ کے نام یہ ہیں - سرسید احمد (جو ادیب ہونے کے علاوہ اور بہت کچھ تھے) محمد حسین آزاد ، شبلی نعمانی ، ڈپٹی نذیر احمد ، مولوی عبدالحلیم شرر، پنڈت رتن ناتھ سر شارا اور حالی - ان میں حالی اور تنہا حالی کی ہستی ایسی ہے جو نثر میں تنقید ، سوانح عمری ، مقالہ نگاری اور انشا پردازی میں اپنے ان ہمعصروں کی طرح ممتاز حیثیت رکھتی ہوئی شاعری میں بھی بلند ترین کارنامہ چھوڑ گئی - نظیر اکبر آبادی کے وقت سے شاعری میں اتنا بڑا مجتہد پیدا نہیں ہؤا تھا یوں تو شبلی ، آزاد ، نذیر احمد ، سر شار سب نے تھوڑی بہت شاعری کی -

یہ قافلہ ہماری زندگی اور ادب کے ایک نئے موڑ سے گذرتا ہؤا نظر آتا ہے - انگریزی راج یوں تو ۱۸۵۷ء کے غدر کے پہلے ہی قائم

ہو چکا تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ملک بھر کو اس کا احساس ہؤا کہ گویا ہم سے کوئی چیز چھین لی گئی ہے - اردو ادب میں یہ احساس حالی اور اُن کے مندرجہ بالا ہمعصروں کے کارناموں میں کار فرما نظر آتا ہے - اب پہلے پہل ادب برائے ادب کا نظریہ ادب برائے زندگی کے نظریے سے بدلتا ہؤا دکھائی دیتا ہے اور زندگی بھی محض وجدانی یا داخلی زندگی نہیں بلکہ عملی، کاروباری، سماجی اور ملی زندگی - حالی اور انکے رفقانے ادب میں افادی پہلو پیدا کئے - افادی پہلوؤں کو اجاگر کرنا شروع کیا - اردو ادب ہی نہیں ہندوستان کی اور زبانوں کے ادب میں بھی اس وقت یہ احساس پہلے پہل اُبھرتا ہؤا نظر آ رہا ہے - ہندی ادب میں بھارتیندو ہریشچندر اور ان کے ساتھیوں نے دیس کا راگ گانا شروع کیا - بنگالی زبان میں بنکم چندر چڑجی اور ایشور چندر و دیا ساگر نے سیاسی اور کلچری نشاۃ ثانیہ کا جھنڈا بلند کیا اور کچھ آگے پیچھے مراٹھی، گجراتی اور دکھنی ہند کی زبانوں کے ادب میں اس احساس نے کہ ہم سے کوئی چیز چھین لی گئی ہے ادب برائے ادب کے نظریے کو ادب برائے زندگی کے نظریے سے بدل دیا - یہ تحریک کل ہند تحریک تھی - اور ہمارے یہاں کی کل زبانوں میں ایک ہی انداز سے یہ تحریک آگے بڑھی - ہندوستان بھر میں اس نئے ادب کے ہر ادیب کے دل میں کچھ غم ماضی، کچھ غم فردا کی جھلک نظر آتی ہے - حالی کے ادب میں غم ماضی اور غم فردا ایک انفرادی کسک ایک دبا دبا سا سوز و ساز رکھتا ہے - جس پر نگاہیں اٹھ ہی جاتی ہیں - اس تحریک کو ہم اب سے آدھی صدی پہلے کی ترقی پسندی کہہ سکتے ہیں - جن فکریات کی یہ تحریگ حامل تھی ان کی روشنی میں اور ان کے سہارے ہم کل تک آگے بڑھتے رہے ہیں - ہاں اب نئی اور کافی مختلف ترقی پسندی کا دور ہندوستان ہی میں نہیں دنیا بھر میں آ گیا ہے -

جب ہم اردو کی اس دنیا پر نظر کرتے ہیں - جس میں حالی کی آواز گونجنے سے پہلے دوسروں کی آوازیں گونج رہی تھیں تو غالب، ذوق، مومن، شیفتہ یاد آتے ہیں اور لکھنؤ میں آتش، ناسخ، انیس یاد آتے ہیں - حالی کی آواز کے ساتھ ساتھ جن کی آوازیں اُردو کی دنیا میں گونجیں وہ تھے داغ و مجروح امیر و جلال، آسی غازی پوری اور

شاد عظیم آبادی اور کچھ ہی دنوں بعد ریاض و مضطر و جلیل شاگردان امیر اور بیخود ، نسیم بھرتپوری اور دیگر شاگردان داغ جب حالی ادھیڑ عمر کے ہو گئے تو اکبر الہ آبادی ، اقبال اور پھر بعد کو چکبست ، نادر کا کوردی اور درگا سہائے سرور جہاں آبادی کی آوازیں فضا میں تھرتھرائیں بظاہر تو امیر و داغ ہی کی آوازیں فضا پر چھائی ہوئی تھیں لیکن جو چیز دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ بڑھتے ہوئے احساس غلامی کے ساتھ ہندوستان کیا سے کیا ہو رہا تھا اور ہمارا ادب بھی کیا سے کیا ہو رہا تھا ۔ مولانا محمد علی کے اس شعر میں اس زمانے کی ہستیوں اور بعد کو سب کے دلوں کے دھڑکنے کی آواز سنائی دیتی ہے :—

عین پستی ہے کہ پستی کو بلندی سمجھے
پھر بھی احساس ہو اس کا تو ابھرنا ہے یہی

اب حالی اور ان کے زمانے کی تصویر اور اس کے پس منظر و پیش منظر کے خد و خال کچھ نمایاں ہو چلے ہوں گے ۔ یہ فضا تھی اور یہ لوگ تھے جو حالی کا تصور کرتے ہوئے ان کے ارد گرد ہمیں نظر آتے ہیں ۔ اب ہم پھر حالی کے دیوان غزلیات پر تفصیلی نظر ڈالیں گے ۔ کیوں ؟ اس لئے کہ اگرچہ ایک ہزار صفحوں پر پھیلی ہوئی حالی کی نثر اور کئی سو صفحات پر پھیلی ہوئی حالی کی مسلسل نظمیں آسانی سے بھلائی جانے والی چیزیں نہیں ہیں ۔ لیکن کم از کم میرا یہ عقیدہ ہے کہ غزل میں اگر شاعر محض تک بندی اور خیال آرائی نہ کرے اور خلوص کے ساتھ اپنے محسوسات کا اظہار کرے تو اس کی شخصیت کی بہتیری رگیں تھرتھراتی ہوئی نظر آئیں گی ۔ حالی کی شخصیت اور حالی کی نثر و نظم سب کا عطر اور ست حالی کی غزلوں میں ہمیں ملے گا ۔

اس کتاب کے بہت سے پڑھنے والے کم عمر یا نوجوان ہوں گے اس لئے ذیل میں ہم غزلیات حالی کے اندازاً تیرہ سو اشعار سے پانچ سو اشعار کے قریب پیش کئے دیتے ہیں کیونکہ بہت سے پڑھنے والوں کو ممکن ہے شروع سے اخیر تک حالی کا دیوان پڑھنے کا موقع نہ ملا ہو ۔ یہ انتخاب میرا خیال ہے حالی کے مخصوص رنگ تغزل کا مکمل نقشہ پیش کر دے گا ۔ میں نے جو اشعار حالی کے چھوڑ دیئے ہیں وہ

خراب اشعار نہیں تھے - حالی کا کلام بہت ہموار ہے - اس کے خشک سے خشک شعر میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہے لیکن ہمارے اغراض کے لئے یہ پانچسو اشعار کافی ہیں - حالی کے تیرہ سو اشعار جن خوبیوں کے حامل ہیں بہت کم شعرا کے اتنے اشعار کسی کام کے نکلیں گے - موٹے موٹے بہت سے دیوان حالی کے مختصر دیوان کے سامنے دفتر بے معنی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے - حالی بہت محتاط غزل گو ہے - احتیاط حالی کے دل و دماغ کی خاص صفت ہے اسی سے تو تیرہ سو اشعار میں سے پانچ سو سے زائد اشعار کا انتخاب بھی انتخاب کو ہلکا نہیں کرسکا - سنئے :—

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمرو یزید کا
چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا
تسکیں نہیں مشاہدۂ گاہ گاہ سے
یارب یہ روزہ دار ہے مشتاق عید کا

مجہولیت زدہ آردو غزل کو عملیت کی طرف لے جانے کی کوشش قابل توجہ ہے - دوسرے شعر میں بھی مشاہدۂ گاہ گاہ کو روزہ اور بے نقاب نظارہ کی دائمی تسکین کو عید کہہ کر صرف ایک لطیف و پاکیزہ تشبیہ یا استعارہ استعمال نہیں کیا بلکہ مسلمانوں بلکہ ہند و مسلمان دونوں کی سماجی زندگی سے لگاؤ کا ثبوت بھی حالی نے دیا ہے -

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا
کیا منعموں کی دولت کیا زاھدوں کا تقویٰ
جو گنج تونے تاکا اس کو لٹا کے چھوڑا
افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دلکش
شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا
اک دسترس سے تیری حالی بچا ہؤا تھا
اس کے بھی دل پر آخر چرکا لگا کے چھوڑا

مسلسل غزل کو انشا اور جرأت نے کیا چیز بنا رکھا تھا ؟ حالی نے کس لطیف انداز سے یہ مسلسل غزل کہی ہے - یہ غزل قوم کے لئے ایک پیام ہے جس کی دبی دبی ٹیس زبان کی نرمی میں گھلی ملی ہوئی ہے -

دیکھ اے امید کیجو ہم سے نہ تو کنارا
تیرا ہی رہ گیا ہے لے دیکے اک سہارا
اک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے
اے زاہد و تمہارا ہے اس میں کیا اجارا
دنیا کے خرخشوں سے چیخ اٹھے تھے ہم اول
آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا
ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ رو دیئے سوارو
ہے لاکھ لاکھ من کا ایک اک قدم تمہارا
پھرتے ادھر ادھر ہو کس کی تلاش میں تم
گم ہے تمہیں میں یارو باغ ارم تمہارا
جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو حالی
کچھ کرکے بھی دکھائے زور قلم تمہارا

بے ردیف کی غزلوں میں مسلسل نظم کے کچھ امکانات پیدا ہو جاتے ہیں - حالی سے پہلے غیر مردف غزلیں اتنی تعداد میں اور اس صلاحیت سے کسی نے نہیں کہی تھیں - اس غزل میں بھی قومی زندگی کا نرم لے میں ماتم ہے اور ابھرنے کی ترغیب بھی ہے - چوتھا شعر خاص طور پر قابل توجہ ہے - مسلمانوں کے زوال کو یوں بیان کیا ہے کہ شہسواروں کے گھوڑے چھن گئے ہیں ”کچھ رو دیئے سوارو“ کے ٹکڑے میں کتنی سادگی اور کسک ہے اب چلا نہیں جاتا ”ہے لاکھ لاکھ من کا ایک اک قدم تمہارا“ پانچویں شعر کے دوسرے مصرعے میں قوموں کی ترقی کا راز خود اعتمادی اور خود شناسی کو بتایا ہے - ”گم ہے تمہیں یارو باغ ارم تمہارا“ مقطعے میں ادب برائے زندگی کے نظریے کی طرف اشارہ کیا ہے -

وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا
پہونچا ہے بس اب کوچ کا تم سمجھو زمانا

خود مہر وطن سے ہے وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا

دلی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

یارب طلب وصل ہو یا ہو طرب وصل
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

دنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و ارماں
چھل بل میں تم اس زال فسوں گر کی نہ آنا

افسوس کہ غفلت میں کٹا عہد جوانی
تھا آب بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا

یاروں کو ہمیں دیکھ کے عبرت نہیں ہوتی
اب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سنانا

دنیا میں اگر ہے بھی فراغت کا کوئی دن
وہ دن ہے کہ جس دن ہے اسے چھوڑ کے جانا

لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت
فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانا

ڈھارس سی کچھ اے ہمقدمو تم سے بندھی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا

یہ غزل بھی بے ردیف کی ہے۔ اک نرم چٹیلاپن، کچھ تلخی اور تیکھا پن ہے۔ قومی ادبار کی پرچھائیاں شاعر کے شعور پر پڑ رہی ہیں۔ ایک خاموش اسپرٹ غزل بھر میں کام کر رہی ہے۔ غزل کا اٹھان جس انداز سے ہؤا ہے وہ مطلعے کے پہلے مصرعے سے ظاہر ہے۔ پہلے کے تین شعر حب وطن اور درد وطن کی ٹیس اپنے اندر رکھتے ہیں۔ جس اداس اور دکھے ہوئے لہجے میں حالی دلی کا ذکر کرتے ہیں وہ مغل سلطنت کا چراغ گل ہو جانے کا اندھیرا آنکھوں میں بھرا دیتا ہے۔ ساتویں شعر میں عجیب نرم طنز ہے۔ اس غزل کی ''قنوطیت'' بیدل و مجہول بنانے والی قنوطیت نہیں ہے بلکہ اس احساس پستی میں گذشتہ عظمت و رفعت کی یاد بھی شامل ہے۔ ایسا ماتم، ایسا نوحہ قوموں کو اکسا کے رہتا ہے۔

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجئے گا
یہ بھید ھے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجئے گا

ہولا کہ غیروں کا غیر کوئی ، نہ جاننا اس کو غیر ھرگز
جو اپنا سایہ بھی ھو تو اس کو تصور اپنا نہ کیجئے گا

کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ، اور کرتے کچھ ہو
زمانہ کی خو ھے نکتہ چینی کچھ اس کی پروا نہ کیجئے گا

کمال ھے ضد بے کمالی ، نہیں ملاپ ان میں حرف گیرو
جو ھم پہ کچھ چوٹ کیجئے گا تو آپ بے جا نہ کیجئے گا

لگاؤ تم میں نہ لاگ زاھد نہ درد الفت کی آگ زاھد
پھر اور کیا کیجئے گا آخر جو ترک دنیا نہ کیجئے گا

تمہارا تھا دوستدار حالی اور اپنے بیگانہ کا رضا جو
سلوک اس سے کئے یہ تم نے تو ھم سے کیا کیا نہ کیجئے گا

زمین کتنی اچھی نکالی ھے - غزل کی لے آواز کی ھلکی ھلکی لہروں کا سلسلہ باندھ دیتی ھے - اس بحر میں اقبال کی غزل ھے ''زمانہ آیا ھے بے حجابی کا عام دیدار یار ھوگا'' - جس کی لے میں اقبال کی شخصیت کی پوری ڈپٹ موجود ھے - اقبال نے اپنی زمین غزل کو جتنا گرما دیا تھا حالی نے آسے اتنا ھی نرما دیا ھے - یہ دبی دبی سی ، رکی رکی سی آواز اپنے ترنم سے دلوں میں نرم چٹکیاں لیتی چلی جاتی ھے - اس غزل میں بھی وھی تحت الشعری (Sub-lyrical) صفات ھیں جو حالی کی آواز کی خاص پہچان ھے -

ھو عزم دیر شاید کعبہ سے پھر کر اپنا
آتا ھے دور ھی سے ھم کو نظر گھر اپنا

کچھ کذب و افترا ھے کچھ کذب حق نما ھے
یہ ھے بضاعت اپنی اور یہ ھے دفتر اپنا

حالی کا خاص انداز بیان مطلعے میں نہایت کامیاب ھے - دوسرے مصرے کی خاموش برجستگی اور روز مرہ کا لطف دیکھنے کی چیز ھے - دوسرا شعر ملک کی اخلاقی کمزوریوں کا دفتر ھے -

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا
یہ تو بتاؤ حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

اے بانگ طبل شاہی دن ہو گیا جب آخر
خواب گراں سے تو نے ناحق ہمیں جگایا

ویراں ہے باغ تسپر پھولی نہیں سماتی
مژدہ صبا نے یارب بلبل کو کیا سنایا

اے عشق دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا
گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا

ڈرتے رہیں گے اب ہم بے جرم بھی سزا سے
احسان اس کا جس نے ناحق ہمیں ستایا

تقلید قوم ہی پر گر ہے مدار تحسیں
تو ہم نے دوستوں کی تحسیں سے ہاتھ اٹھایا

دیکھا تو کچھ نظر میں حالی جچا نہ اپنی
جو جو گمان تھے ہم کو ان کا نشاں نہ پایا

سیدھی سادی غزل ہے لیکن تاثیر کی ہلکی سی چاشنی سے خالی نہیں ہے ۔ ہر شعر میں نکتے بیان ہوئے ہیں ۔ مروجہ اور روایتی تغزل سے اتنا الگ ہو کر بھی آواز کی نرمی اور غزل کی سبک روی قائم رکھنا حالی کا خاص کارنامہ ہے ۔ دیکھیئے اس غزل میں بھی ردیف نہیں ہے ۔

کہیں الہام منوانا پڑے گا
کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا

نہو صوفی صفا گو تجھ میں لیکن
کرشمہ کوئی دکھلانا پڑے گا

نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد
یہ گر ناصح کو بتلانا پڑے گا

جنہیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا
انہیں سچوں کو جھٹلانا پڑے گا

عوام الناس کا ہوگا جنہیں منہ
انہیں خاصوں پہ منہ آنا پڑے گا

رہے وصف جناں کی مشق واعظ
تمہیں بچوں کو پھسلانا پڑے گا
سخن میں پیروی کی گر سلف کی
انہیں باتوں کو دھرانا پڑے گا
تعلق کا ہے پھندا پیچ در پیچ
یہ عقیدہ ہم کو سلجھانا پڑے گا
بہت یاں ٹھوکریں کھائیں ہیں ہم نے
بس اب دنیا کو ٹھکرانا پڑے گا
نہیں بو آنس کی اس غم کدے میں
کہیں دل جا کے بہلانا پڑے گا
دل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے
ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا
زمانہ کر رہا ہے قطع پیوند
وفا سے ہم کو پچھتانا پڑے گا
جو منصوبے ہیں یہ حالی تو شاید
ارادہ فسخ فرمانا پڑے گا
بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک
اسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا

کتنی نرم آہنگ و نرم رفتار غزل ہے۔ مطلعے کی تعلی کا تیور بھی کس قدر لئے دئے ہوئے ہے۔ چوتھے شعر میں الفاظ کے الٹ پھیر سے دنیا سازی اور پروپگینڈا کے مرحلوں کو کس طنزیہ اور نکتہ رس انداز میں بیان کر گئے ہیں۔ پانچویں شعر میں جمہوریت اور انقلاب کا ایک اصول باتوں باتوں میں بلکہ محاوروں میں بیان کر دیا ہے۔ منہ ہونا بمعنی پاس یا لحاظ ہونا جنہیں عوام الناس یا جمہور کا پاس خاطر ہے انہیں خاصوں پہ منہ آنا پڑیگا بلند طبقہ والوں کو کھوٹی کھری سنانی پڑے گی۔ ساتویں شعر میں نیا ادب پیدا کرنے کی ترغیب کس انداز سے دی ہے دوسرے مصرعے کی نرم بے ساختگی اور ''انہیں باتوں کو'' والے ٹکڑے کی پر زور نرمی و بلاغت دیکھنے کی چیزیں ہیں اور اشعار کی روانی اور نرم چٹکیاں بھی قابل غور ہیں ہر شعر

میں ردیف ایک ھلکا سا چٹیلا پن اور ایک تیکھی طنز پیدا کر دیتی ھے گیارھویں شعر کے دوسرے مصرعے کی خاموش تاثیر دعوت نظر دے رھی ھے پوری غزل میں شاعر کی شخصیت مسلسل طریقے سے نمایاں ھے - آواز کی کفایت اور روک تھام لہجہ کو کچھ دبا کر اسے بے لاگ اور بے باک بنا دینا حالی کا آرٹ ھے - آواز حساس ھے لیکن ضبط و توازن کے ساتھ یہی ضبط و توازن آواز میں وہ مخصوص طنز پیدا کر دیتا ھے جو حالی کی اپنی چیز ھے -

سخن پر ھمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا
رھا دوستی پر نہ تکیہ کسی کا
بس اب دل سے شکووں کو دھونا پڑیگا
بن آئے گی ھرگز نہ یاں کچھ کئے بن
جو کچھ کاٹنا ھے تو بونا پڑے گا
ھوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب میری جان ھونا پڑے گا

اس کے پہلے والی غزل میں جو خوبیاں تھیں انھی کی جھلک اور جھنکار اس غزل میں بھی دکھائی اور سنائی دیتی ھے - ردیف بھی وھی ھے -

پھل کچھ اے نخل وفا تجھ میں نہیں
جو لگائے گا تجھے پچھتائے گا
عیب سے خالی نہ واعظ ھے نہ ھم
ھم پہ منہ آئیگا منہ کی کھائے گا
رنگ گردوں کا ھے کچھ بدلا ھؤا
شعبدہ تازہ کوئی دکھلائے گا
ابر و برق آئے ھیں دونوں ساتھ ساتھ
دیکھئے بر سے گا یا برسائے گا

وھی حساس سنجیدگی اور چٹیلی نرم آھنگی حلق میں کچھ درد پیدا کر دینے والی کیفیت ، دبی ھوئی تلملاھٹ ، طنز کی چاشنی ، وہ

حالت جسے کہتے ہیں جی مسوس مسوس کر رہ جانا ، کچھ ، نہ جانے کیا ، چھن جانے ، لٹ جانے کا احساس ایک تاسف کا لہجہ ان اشعار میں بھی ملتا ہے - آخری شعر میں برسے گا بمعنی قہر نازل کرے گا یا غصہ ظاہر کرے گا -

واں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا
منہ آسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا

دل میں باقی ہے وہی حرص گناہ
پھر کئے سے اپنے ہم پچھتائیں کیا

آؤ اس کو لیں ہمیں جا کر منا
اس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا

جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو
کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا

مان لیجئے شیخ جو دعویٰ کرے
اک بزرگ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

مطلعے کے - دوسرے مصرعے میں ''یہ'' کے چھوٹے سے لفظ میں شاعر بہت کچھ کہہ گیا ہے - اپنے آپ پر ہلکی سی طنز کر جانا حالی کا خاص انداز ہے - گویا اپنے آپ کو کونچے لگا لگا کے چونکانا چاہتے ہیں - قوم کی غفلت بے بسی اور بے کسی ، بے بضاعتی و بے سرو سامانی قوم کی ذلت و پستی کا شاعر نے اپنے آپ کو مجسمہ تصور کر لیا ہے - چوتھے شعر میں ملک کے گرے ہوئے نظریے کی (دنیا کو محض ایک کھیل سمجھنا) کیسی اچھی تنقید کی ہے - حالی بالا رادہ قومی یا سماجی کردار پر اپنے اخلاقی اشعار میں تنقید کرتے ہیں اور شعرا کے اخلاقی اشعار محض انفرادی نیکی و بدی تک محدود رہتے ہیں - نظیر اکبر آبادی کے سو برس بعد اجتماعی زندگی کو حالی نے پھر موضوع سخن بنایا نئی بات یہ کہ غزل کی لطیف اشاریت کے ساتھ ، شیخ اور واعظ کی چٹکیاں لینے میں بھی حالی اس دھول دھپے کو روا نہیں رکھتے جو اس موضوع پر کئی اور شعرا کے پھوہڑ اشعار میں سنائی اور دکھائی دیتا ہے - یہاں بھی خلوص سے اصلاح ہی کی کوشش ملتی ہے -

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اک چراغ اور سر راہ جلایا جاتا

کر دیا اُس نے تو اللہ سے غافل ناصح !
اُس کو کیوں بھولتے گر اس کو بھلایا جاتا

چپ چپاتے اُسے دے آئے دل اک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

دل کو یہ تو نے دکھایا ہے کہ دکھ جاتا ہے
چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دکھایا جاتا

نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو
تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

عشق اس وقت سے سر پر تیرے منڈلاتا تھا
گودیوں میں تجھے تھا جبکہ کھلایا جاتا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ
اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دنیا
ہم سے اب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

کرتے کیا پیتے اگر مئے نہ عشا سے تا صبح
وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا

دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غم عشق
کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

اس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خودبخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی
کہتے پہلے سے تو دے لیکے ہٹایا جاتا

غزل کی سلاست اور اس کا دھیما ترنم دیکھئے - ردیف و قافئے کس نرم آہنگی کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں - بول چال کی زبان

کے استعمال میں اہل دلی و اہل لکھنئو کے یہاں جو فرق ہے، دونوں کی سادگی بیان میں جو فرق ہے اس غزل میں نمایاں ہے - پر خلوص اور فطری بول چال اور سادگی اور پر تکلف یعنی جذبات سے محروم بول چال اور سادگی میں بڑا فرق ہے - مصرعوں کے مصرعے اس غزل کے دیکھئے ٹکڑے اور فقرے دیکھئے اور ایسے الفاظ بھی جیسے ''چکایا'' ''تم تو کہتے تھے'' ''ہے ابھی آیا جاتا'' ''اس کی صورت سے تو'' ''جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا'' ''دھندے'' ''دے لے کے'' وغیرہ - آواز کی روک تھام کے ساتھ یہ سلاست و روانی مصحفی کی یاد دلاتی ہے لیکن طنز اور چٹیلا پن ان اشعار کا خاص حالی کا حصہ ہے - مقطعے کے اوپر والے شعر کو دیکھئے عشق کی ایسی تعریف اردو غزل میں نایاب ہے ''شخص'' کے لفظ کا اتنا بے تکلف اور شعریت لئے ہوئے استعمال اردو شاعری میں آپ نے اور کہاں دیکھا ہے؟ صرف ایک اور مثال ملتی ہے غالب کے اس شعر میں :-

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

''سمایا جاتا'' کا ایسا استعمال کہیں اور ملتا ہے - امیر و داغ کی گرم مسالہ دار شاعری کے مزے سے جب کام و دھن اکتا جائیں اور زبان سے جب رال ٹپکنا بند ہو جائے تب کہیں حالی کے تغزل کا مزہ ملے گا -

خلوت میں تیری صوفی گر نور صفا ہوتا
تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا رہتا
تھا آفت جاں اس کا انداز کمانداری
ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا
کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھ کو خبر ہوتی
میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا
باتوں میں شکایت کی بو آتی ہے الفت کی
گر دل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلا ہوتا
ہم روز وداع اس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

جو جان سے درگذرے وہ چاہے سو کر گزرے
گر آج نہ تم آتے کیا جانئے کیا ہوتا

کل حالی دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سنا ہوتا

اگرچہ مطلع کے سوا ہر شعر عشقیہ ہے لیکن خیالات کی پاکیزگی اور لہجے میں بے باکی اور سنجیدگی کا امتزاج قابل دید ہیں ۔ حالی نے اس غزل کے لئے جو زمین نکالی ہے اور جو بحر اختیار کی ہے وہ حالی کے اس اسلوب بیان کے لئے نہایت موزوں ہے جس کی خاص صفت ہے ایک حساس نثرئت ۔ یہ سوچنا مزے سے خالی نہیں کہ اس بحرو زمین میں امیر ، داغ اور حالی کے دوسرے معاصرین کچھ کہنا چاہتے تو کیا کہتے ۔ مطلعے کا مفہوم نفسیات و اخلاقیات کے ایک لطیف نکتہ کو واضح کر رہا ہے ۔ پانی میں مل کر جس طرح کنول کا پتہ یا روشنی کی چھوٹ بھی آلودہ نہیں ہونے پاتی اسی طرح صوفی کی خلوت یا دل میں اگر نور صفا ہوتا تو وہ سب سے ملا بھی رہتا اور سب سے جدا بھی رہتا ۔ دوسرا شعر حالی ہی کے اس شعر کی یاد دلاتا ہے :-

دکھانا پڑے گا ہمیں زخم دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

تیسرے شعر میں حسن کی ناخود شناسی یا خود ناآگہی اسے پست شخصیت والے رقیبوں سے ملنے دیتی ہے ۔ ورنہ حالی کہتے ہیں ۔ ''میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا'' ''خفا'' کا لفظ بہت لطیف معنوں میں آیا ہے ۔ چوتھے شعر میں یاسیات ۔ عشق کی اس کیفیت کی طرف اشارہ ہے ۔ جب جذبۂ محبت مردہ پڑ جائے اور باہم شکوہ و شکایت بھی نہ رہ جائے ۔ پانچویں شعر میں جس بے بسی اور مجبوری کو ہنس ہنس کے چھپانا پڑا ہے اس سے ہر محبت کرنے والے کو سابقہ پڑا ہوگا اور بارہا ، اور اشعار میں بھی حالی نے اس غزل کے انداز کو بنھاہ دیا ہے ۔

پیش از ظہور عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حسن میزباں کوئی میہماں نہ تھا

ہم کو بہار میں بھی سر گلستاں نہ تھا
یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کیا جانتے تھے جائیگا دل اک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط مگر بیم جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاس خاطر نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

کچھ میری بے خودی سے تمہارا زیاں نہیں
تم جاننا کہ بزم میں ایک خستہ جاں نہ تھا

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیئے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیروسناں نہ تھا

بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالیؔ جادو بیاں نہ تھا

اس غزل کی مترنم نرم آہنگی نا قابل انکار ہے۔ کئی اشعار میں قافیہ سے مل کر ردیف نے آواز میں ایک تحت‌الشعری (Sub-Lyrical) تاثیر پیدا کر دی ہے۔ مطلعے میں فلسفۂ تصوف کا ایک نکتہ تغزل میں ڈوبے ہوئے انداز سے بیان کیا ہے۔ دوسرے مطلعے میں عین بہار میں بھی کسی نا معلوم سبب سے اپنی اداسی بہت لطیف پیرائے میں بیان کی ہے۔ ''یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا''۔ کیا مصرع ہے! تیسرے شعر میں ''بھول گئیں کلفتیں تمام'' کو اس حالت سے تعبیر کرنا کہ ''گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا''۔ حالی کے مخصوص انداز تغزل کی لطیف مثال ہے۔ پانچواں

شعر ہلکا ہے مگر مترنم - چھٹے شعر میں اپنی نازک مزاجی کس نرم و حساس لہجے میں بیان کی ہے - ریاض کا شعر :-

چھیڑ کیسی بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاض
اک حسیں ہر وقت ہو ان کے منانے کیلئے

حالی کے اس رچے ہوئے مہذب انداز بیان کے سامنے کیا رہ جاتا ہے ؟ چھٹا شعر بھی بہت نرمی سے سانچے میں ڈھلا ہے - ''تم جاننا کہ بزم میں اک خستہ جاں نہ تھا'' - حزن و ملال کی کیفیتیں بیان ہوں تو اس طرح ساتواں شعر بھی حالی کے اسلوب بیان کو معجزہ بنا دیتا ہے - کس نرم تحیر کے لہجے میں اپنے کو الزام دیا ہے اور اپنی بے جا جرأت پر افسوس کیا ہے ''خود مجھ کو اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا'' - بقیہ اشعار میں بھی لہجے کی وہی تھرتھراہٹ ہے - شروع سے آخر تک اس غزل کی موسیقیت پر پھر غور کیجئے - حسرت کا لہجہ بھیتری طور پر دکھتی ہوئی آواز کتنی لطیف بن گئی ہے - حالی کی تحت الشعریت کی یہ غزل بہترین مثال ہے -

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہونچا میری رسوائی کا

عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شب تنہائی کا

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

ایک دن راہ پہ جا پہونچے ہم
شوق تھا بادۂ پیمائی کا

اس سے نادان ہی بن کر ملئے
کچھ اجارہ نہیں دانائی کا

سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ
حوصلہ کیا ہے تماشائی کا

بزم دشمن میں نہ جی سے اترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا

محتسب عذر بہت ہیں لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

یہ تغزل قابل توجہ ہے۔ ہر ہر شعر میں نہ جانے کیسا سکوت شاعر نے سمو دیا ہے۔ ہر شعر میں آواز کی آہستہ روی، ہوش و بے خودی کا امتزاج غور کرنے کی چیز ہے۔ مطلعے میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ رنج تنہائی عاشق سے کیا کرا دے کیا نہ کرا دے۔ یہ بات کہنے کی ہے کہ محبت میں بدنامی ہونے کا احتمال اس وقت ہوتا ہے جب محبت غم بن جائے۔ تیسرے شعر کو دیکھئے۔ مجھے اپنا ہی مصرع یاد آ گیا۔ ''لطف و کرم تو مانع جورو جفا نہیں'' معشوق منہ سے منہ ملائے عاشق سے ہم آغوش ہے لیکن عالم یہ ہے کہ بقول میر ''وصل میں رنگ اڑ گیا میرا ــــ کیا جدائی کو منہ دکھاؤں گا'' ''کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا'' اسی طرح ہر شعر میں وہ بات ہے جسے انگریزی شاعر ورڈس ورتھ کہتا ہے معتدل حیرت کا ایک نرم جھٹکا (Agenfle Shock of mild surprise)

اغماض چلتے وقت مروت سے دور تھا
رو رو کے ہم کو اور رولانا ضرور تھا

تھی ہر نظر نہ محروم دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخل ایمن و ہر سنگ طور تھا

در واکہ لب پہ راز دل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا

جاتی نہ قدر رحمت حق پارسا نے کچھ
ٹھہرا قصور وار اگر بے قصور تھا

دردی کشان بزم مغاں کا نہ پوچھ حال
اک ایک رند نشۂ وحدت میں چور تھا

اب باریاب انجمن عام بھی نہیں
وہ دل کہ خاص محرم بزم حضور تھا

روز و داع بھی شب ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ھی سے شام بلا کا ظہور تھا
حالی کو ھجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ آسی کا کہ اتنا صبور تھا

میر اور امیر مینائی کی غزلیں اسی زمین میں یاد آ گئیں ۔ دونوں کی غزلوں سے حالی کی اس غزل کو جھپکنے کی بالکل ضرورت نہیں ۔ حالی کی یہ غزل نہ میر کی غزل سے دبتی ھے نہ امیر مینائی کی غزل سے ۔ مگر اس کو کیا کروں اور کیا کہوں کہ میر کا یہ شعر بری طرح میرے دل کو لگ گیا ھے :—

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اس بیوفا کو راہ پہ لانا ضرور تھا

لیکن پھر بھی حالی میر سے کس قدر متاثر ھیں یہ غزل اس امر کی غمازی کر رھی ھے ۔

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائیگا
سینے میں داغ ھے کہ مٹایا نہ جائیگا
تم کو ھزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ھے کہ چھپایا نہ جائیگا

دونوں شعر سنجیدہ تغزل کی ایسی مثالیں ھیں جن پر کوئی بہت ناز نہ کرے تو زیادہ شرمانے کی بھی ضرورت نہیں ۔

دیکھی ھیں ایسی اُن کی بہت مہر بانیاں
اب ھم سے منہ میں موت کے جایا نہ جائیگا
راضی ھیں ھم کو دوست سے ھو دشمنی مگر
دشمن کو ھم سے دوست بنایا نہ جائیگا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ھیں وہ
ھم وہ نہیں کہ ھم کو منایا نہ جائیگا
ملتا ھے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائیگا

''بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں'' والا شعر والد مرحوم حضرت عبرت گورکھپوری کا محبوب و منتخب شعر تھا۔ شعر خالص اردو یا خالص ہندی میں ہے۔ ایک بھی بدیشی لفظ نہیں۔

قلق اور دل میں سوا ہو گیا
دلاسا تمہارا بلا ہو گیا

دکھانا پڑے گا مجھے زخم دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد
ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا

سمجھتے تھے جس غم کو ہم جاں گذا
وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا

نہ دے میری امید مجھ کو جواب
رہے وہ خفا گر خفا ہو گیا

ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

مطلع اور اس کے بعد والا شعر داخلی تغزل کی نادر مثالیں ہیں۔ مطلع تو سہل ممتنع ہے۔ اسے معجزہ کہئے یا الہام۔ دوسرا شعر بھی سمجھنے کا ہے وہ انداز کمانداری ہے کہ تیر خطا ہو جاتا ہے لیکن دل گھائل ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ زخم دکھا کر معشوق کو تیر خطا ہونے کی ندامت سے بچانا ہے والد مرحوم کا یہ منتخب شعر تھا۔ یہ پوری غزل کس قدر ہموار، کس قدر متوازن ہے اور کتنی نرم و سادہ یہی زیر لب گنگناہٹ حالی کا مخصوص انداز ہے۔

ایک خوسی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب
وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

حالی بس اب یقین ہے کہ دلی کے ہو رہے
ہے ذرہ ذرہ مہر فزا اس دیار کا

خو ، تحمل اور صبر و قرار کے لطیف فرق کی طرف کس دکھی ہوئی مگر سنبھلی ہوئی آواز سے اشارہ کیا ہے - دلی پرستی کا درد دوسرے شعر میں چمک اٹھا ہے -

درد دل کو دوا سے کیا مطلب   کیمیا کو طلا سے کیا مطلب

بے لاگ مطلع ہے - درد دل کیمیا ہے - دوائے درد دل محض طلا ہے -

مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زبان ہے اب
لغزش نہ ہو ، بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمن دیں مہرباں ہے اب
اک جرعہ شراب نے سب کچھ بھلا دیا
ہم ہیں اور آستانۂ پیر مغاں ہے اب
ہے دل غم جہاں سے سبکدوش ان دنوں
سر پڑتا سوجھتا کوئی بار گراں ہے اب
حالی تم اور ملازمت پیر مئے فروش
وہ علم و دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

داغ کا مطلع غالباً یوں ہے :—

ہم مر گئے تو پرسش نام و نشان ہے اب
اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

داغ کا زور بیان مسلم لیکن حالی کے مطلعے میں جو ٹیس اور جلن اور نرمی ہے جو سوز و گداز (Bathog) ہے اس کی بنا پر میں حالی کے مطلعے کو داغ کے مطلعے پر ترجیح دیتا ہوں اور اشعار بھی نہایت خوش سلیقگی سے کہے گئے ہیں -

واعظو ہے ان کو شرمانا گناہ
جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ

کرتے ہیں آباد دوزخ کو حضور
خلد کو ویران کرواتے ہیں آپ
چھیڑ کر واعظ کو حالی خلد سے
بسترا کیوں اپنا پھکواتے ہیں آپ

دیکھئے ان اشعار میں حالی کی سنجیدہ شوخی اور لئے دیئے ہوئے بزلہ سنجی اور سیدھی سادی کھری کھری زبان میں سامنے کی باتیں کہنا اور پتے کی بھی کہہ جانا ۔ اس سادگی کو لوگ پھیکا پن سمجھ بیٹھے تھے ۔

گو جوانی میں تھی کجرائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
ھٹ پہ آس کی اور پس جاتے ہیں دل،
راس ہے کچھ اس کو خود رائی بہت
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت
کر دیا جب واقعات دھر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت
گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی
یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

کتنی سلجھی ہوئی غزل ہے ۔ ہر شعر میں ایک خاموش تاثیر ہے ۔ حالی کے اشعار میں بسا اوقات نشتریت آتے آتے رہ جاتی ہے اور کبھی کبھی حالی کے اشعار ایک تیر نیمکش کا احساس پیدا کرتے ہیں ۔

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

ہے غم روز جدائی نہ نشاط شب وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہوشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

واعظو آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

شوق میں اس کے مزا درد میں اس کے لذت
ناصحو اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کو اور آپ کے گھر کی صورت

داغ کی غزل کا مطلع ہے :۔

بزم دشمن میں نہ کھلنا گل تر کی صورت
جاؤ بجلی کی طرح آؤ نظر کی صورت

شوخی، چھیڑ چھاڑ اور چنچل پن سب کچھ بجا لیکن داغ کی رنگیں بیانی حالی کے اداس اور سادہ مطلع کا جواب نہ دے سکی۔ دوسرے شعر میں زوال حسن پر کس لہجے میں تاسف کیا ہے۔ زیب النسا کا فارسی شعر یاد آ گیا ہے۔

نہال سرکش و گل بیوفا و لالہ دو رنگ
در ایں چمن بہ چہ امید آشیاں بستم

اس غزل کے ہر شعر کے دوسرے مصرعے کی نرم برجستگی اور پہلے مصرعے میں زبان کی شستگی، ہر شعر کی مترنم روانی، کچھ اشعار میں طنز کی چاشنی اور پوری غزل کا سانچے میں ڈھلا ہؤا ہونا اور کلام کی استادانہ شان دیکھنے کی چیزیں ہیں۔

بناتے ہیں وہ مہربانی کی صورت
یہ چھپتی نہیں سر گرانی کی صورت

یقیں ہے کہ ہم جس کو سمجھے ہیں مرنا
یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت

سمجھ کر کرو قتل حالی کو دیکھو
مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

مطلع معمولی ہے لیکن معاملات حسن و عشق میں ایسا ہوتا ہے۔ اس زمین میں مطلعے کا سلپٹ ہونا قریب قریب ناگریز ہے۔ دوسرا شعر اثر سے خالی نہیں۔ مقطع خوب ہے، دوسرا مصرع سجی، رچی اور سجل سادگی کی مثال ہے اور سانچے میں ڈھلا ہؤا ہے۔

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اچاٹ
دل کو یہ کیسی لگادی تو نے چاٹ

ملتیں رستوں کے ہیں سب ہیر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر
ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

تیغ میں برش یہ اے حالی نہیں
جس قدر تیری زباں کرتی ہے کاٹ

چٹکیاں سی دل میں یہ لیتا ہے کون
شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

بے ردیف کی غزل ہے اور ٹھیٹھ ہندی کے قافئے ہیں۔ سپاٹ قافیوں میں ایک لذت پیدا کر دی ہے۔ دوسرا شعر کامیاب اظہار خیال کی اچھی مثال ہے۔ رستوں کے ہیر پھیر کا سبب حافظ کا یہ مصرعہ بتاتا ہے ''چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زوند'' تیسرے شعر میں جو کبھی بہادر تھے ان کا جاٹوں کے ہاتھ قزاقوں، جرائم پیشہ والوں اور بدیشیوں کے ہاتھ لٹ جانا اور ان لٹیروں کو ٹڈی دل کہنا حالی کے ماتم ماضی اور ماتم اسلاف کا ثبوت ہے۔ آخیر کے دونوں اشعار میں حالی نے بظاہر روکھے پھیکے مگر اثر کرنے والے اپنے اسلوب بیان کے جوہر کو پہچانا ہے۔

میر کا مقطع یاد آگیا:—

کیا جانیں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ بات ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

بھید واعظ اپنا کھلوایا عبث
دل جلوں کو تونے گرمایا عبث

کوئی پنچھی آکے اب پھنستا نہیں
آپ نے جال اپنا پھیلایا عبث

آنکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم
تو نے زاھد ہم کو شرمایا عبث

سیدھے سادھے نشرئت آمیز اشعار ھیں اثر کی چاشنی لئے ہوئے تیسرے شعر میں زاھد پر کتنی نرم مگر لگتی ھوئی چوٹ کی ھے - شرمایا کا لفظ کتنا با معنی ھو گیا ھے - ''آنکلتے تھے کبھی مسجد میں ھم'' سو وہ بھی گیا -

بات کچھ ھم سے بن نہ آئی آج
بول کر ھم نے منہ کی کھائی آج

چپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ
بات بگڑی ، بنی بنائی آج

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ھی کچھ بھر آئی آج

چور ھے دل میں کچھ نہ کچھ یارو
نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

کل یہاں کاروبار ھیں سب بند
کر لو کرنی ھے جو کمائی آج

زد سے الفت کی بچ کے چلنا تھا
مفت حالی نے چوٹ کھائی آج

مطلع دیکھئے لفظوں سے کھیلتے ھیں تو یوں کھیلتے ھیں - دوسرے شعر میں بول کر اپنا بھرم کھونے کی طرف کس انداز میں اشارہ کیا ھے - شعر میں ایک فارسی لفظ نہیں - ٹھیٹھ ھندی کا ٹھاٹ ھے - تیسرے شعر میں بھی بغیر یہ کہے ہوئے کہ ھم نے کچھ کہا یا کیا شکایت یا فریاد کر بیٹھنے کی طرف اشارہ کیا ھے بے خوابی کا

سبب دل کا چور ، بہت خوب ! پانچویں شعر میں دعوت عمل بے لاگ زبان میں دی ہے - مقطع بھی اسی انداز میں ہے جس انداز میں پوری غزل ہے -

تلخی دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج
یہ بھی ہے یارو کوئی رنجوں میں رنج

رنج و شادی یاں کے ہیں سب بے ثبات
اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج

تھا قناعت میں نہاں گنج فراغ
پر ہمیں بے وقت ہاتھ آیا یہ گنج

ہم کو بھی آتا تھا ہنسنا بولنا
جب کبھی جیتے تھے ہم اے بذلہ سنج

آ گئی مرگ طبیعی ہم کو یاد
شاخ سے دیکھا جو خود گرتا ترنج

راہ اب سیدھی ہے حالی سوئے دوست
ہو چکے طے سب خم و پیچ و شکنج

یہ غزل بھی بے ردیف کی ہے - حالی کے مطلعے پر مجھے اپنا مطلع یاد آ گیا :-

اے ساکنان دھر یہ کیا اضطراب ہے
اتنا کہاں خراب ، جہان خراب ہے

حالی کے مطلعے کا یہ مطلب لگانا غلط ہو گا کہ تلخئی دوراں کا رنج معمولی رنج ہے - دوسرے مصرعے کا مفہوم سے بالکل بر عکس ہے - انکار کو اقرار کا پردہ بنایا ہے - بقیہ اشعار میں بھی جو بے دلی اداسی اور کسک ہے اسے محض انفرادی غم نہیں سمجھنا چاہیئے - زوال ملت کا ماتم ان اشعار میں ہے - لیکن یہ ماتم برائے ماتم یا ماتم برائے ثواب دارین نہیں -

بزم مے اچھی ہے گو دنیا ہے اے میخوار ہیچ
یاں سمجھ لیتے تو ہیں دنیا کو دم بھر یار ہیچ

شیخ ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ امتیاز
ہے یہ سب اونچی دکان اور رونق بازار ہیچ
ہو گرجتے جس قدر اتنے برستے تم نہیں
اے فصیحو ہے یہ سب گفتار بے کردار ہیچ
ہے ادب مسند پہ جو کچھ ہے رئیس شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ
گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

کس اعتدال و احتیاط سے بزم مے کی تعریف کی ہے ۔ نظم و غزل کے پاٹ یہاں ملتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ کھری کھری زبان میں کھری کھری باتیں ہیں ۔ غزل کے سنگیت میں اس کرخت اور کھردری آواز اس دھچکے (gar) کی ضرورت تھی ۔ اچھے نہ لگیں لیکن ایک بار یہ اشعار پڑھ لینے کے ضرور ہیں ۔ یہ خشکی ضلع جگت والی خشکی نہیں ہے ۔

مئے مغاں کا ہے چسکا اگر برا اے شیخ
تو ایسی ہی کوئی چاٹ اور دے لگا اے شیخ
ریا کو صدق سے ہے جام مے بدل دیتا
تمہیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ
وہ نکلے بھان متی جو بناتے تھے اکسیر
تماشے دیکھے ہیں یہ ہم نے بارہا اے شیخ
غرور فقر و غرور غنا میں فرق ہے کیا
تجھی پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ
زباں پہ ہوتی ہے مہر ان کی جو ہیں محرم راز
پھر ایسا کیجئو ہرگز نہ ادعا اے شیخ
خبر بھی ہے تمہیں کیا بن رہی ہے بیڑے پر
ہیں آپ جون سے بیڑے کے ناخدا اے شیخ
وہ ڈوبتوں سے الگ رہتے ہیں جو ہیں تیراک
شناوری کا یہی گر ہے مرحبا اے شیخ

کمال حسن عقیدت سے آیا تھا حالی
یہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

تغزل کے خلاف الفاظ حالی بے دھڑک استعمال کر جاتے ہیں۔ یہ اکھڑ پن مریض کانوں کو گراں گذرتا ہے ''بھان متی'' یا ''پنچھی'' یا ''ٹڈی'' ایسے الفاظ پنبہ بگوش حضرات کو کیوں بھانے لگے۔ مگر تھی ان جھٹکوں کی ضرورت یہ زمین بھی ہونہار، غیر امید افزا، اوسرا اور بنجر تھی لیکن کیا کیا شعر حالی کہہ گئے ہیں۔ پوری غزل نہایت رواں دواں ہے۔ معانی بھی ہیں اور رس بھی۔ ایک ہلکا سا البیلا پن حالی کے انداز بیان میں ہوتا ہے جو اس مخصوص رنگ میں اور شعرا کے یہاں ہمیں نہیں ملتا۔ یہ البیلا پن ایک سادہ بے تکلفی سے پیدا ہو جاتا ہے۔ غزل کا ہر شعر دعوت فکر و تامل دے رہا ہے۔ پھر بھی یہ اسلوب ایک عبوری دور یا کسی عبوری وقفے کی چیز ہے غزل کی زبان عموماً اس سے نرم و نازک ہونا چاہیئے۔

شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد
اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا رجا کے بعد

ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور
ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

گر درد دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا
آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

یاد خدا میں جب نہ گئی دل سے اس کی یاد
آگے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد

آخر کو ماننا پڑا اے نفس خیرہ سر
تیرا بھی حکم کم نہیں حکم قضا کے بعد

حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش
دلکش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

مطلع گوئی کو حالی کہاں سے کہاں لے جا رہا ہے۔ اخلاق مضامین میں بسا اوقات حالی کے مطلعوں کی سجاوٹ اور رسا کاری و بلاغت بڑے بڑے شعرا کے مطلعوں میں نہیں ملتی۔ ساتھ ہی ردیف و قافئے سے ایک فضا پیدا ہو جاتی ہے جو پوری غزل کی فضا بن جاتی ہے۔ ہر شعر کو قدرے غور و فکر سے پڑھئے۔ پانچواں شعر تو دیکھئے یاد خدا سے کچھ نہ ہؤا۔ اس نفسیاتی حقیقت کو ''آگے خدا کا نام ہے'' کے ٹکڑے سے ظاہر کرنا کتنی لطیف بات ہے۔ مقطع میں اپنی صدائے جگر خراش کی قدر شناسی کی دعوت پنبہ بگوش قوم۔کو دی ہے۔

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاھد
تیرا قبلہ ہے جدا میر جدا اے زاھد

در گذر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے
تو تیرا اور کوئی ہوگا خدا اے زاھد

ہم دکھا دیں گے کہ زاھد اور ہے نیکی کچھ اور
کچھ بہت دور نہیں روز جزا اے زاھد

عیب حالی کے بہت آج کئے تو نے بیاں
ذکر کچھ اور کر اب اس کے سوا اے زاھد

اس غزل پر بھی مندرجہ بالا بیانات صادق آتے ہیں۔ اس خشک ردیف کے ہوتے ہوئے حالی نے غزل کو کتنا نرم رو اور مترنم بنا دیا ہے۔ ہر شعر محتاط اور لئے دیئے ہوئے لہجے میں ایک چیلنج ہے یہ خاموش انداز اکثر ڈپٹ، للکار اور بڑے بول سے زیادہ موثر ہوتا ہے۔ حالی کا اعتدال آگیں تفکر بڑی قابل قدر چیز ہے۔

پیاس تیری بوئے ساغر سے لذیذ
بلکہ جام آب کوثر سے لذیذ

جس کا تو قاتل ہے پھر اس کے لئے
کونسی نعمت ہے خنجر سے لذیذ

قند سے شیریں تیری پہلی نگاہ
دوسری قند مکرر سے لذیذ

جھانجھ میں جس بھوک کی بھولے نہ تو
بھوک ہے وہ شیر مادر سے لذیذ
ہے یہ تجھ میں کس کی بوباس اے صبا
بوئے بید مشک و عنبر سے لذیذ

یہ ردیف بھی بظاھر امید افزا اور ھو نہار نہ تھی لیکن حالی نے اپنے کلام کا مخصوص سواد ان اشعار کو بھی کچھ دے ھی دیا۔ چوتھے شعر میں جھانجھ بمعنی بے حد خواھش جیسے تمباکو کو جھانجھ۔ اس معنی میں یہ لفظ شاید تنہا حالی نے استعمال کیا ھے اور نہایت بر محل۔

ھے یہ تکیہ تری عطاؤں پر
وھی اصرار ھے خطاؤں پر
رھروؤ باخبر رھو کہ گماں
رھزنی کا ھے رھنماؤں پر
ھے وہ دیر آشنا تو عیب ھے کیا
مرتے ھیں ھم انہیں اداؤں پر
اس کے کوچہ میں ھیں وہ بے پروبال
اڑتے پھرتے ھیں جو ھواؤں پر
حق سے درخواست عفو کی حالی
کیجے کس منہ سے ان خطاؤں پر

کرتے ھیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ھوتا ھے اگر ھم میں ھنر
کرنی پڑتی ھے کسی کی مدح جب
کرتے ھیں تقریر اکثر مختصر
کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی
شکر کے ھیں اس سے خواھاں عمر بھر
عیب حالی اپنے یوں کہتا ھے کیوں
خواھش تحسیں ھے حضرت کو مگر

یہ غزل بھی غیر مردف ہے - ترنم اور رنگینی ، لطافت ، شعریت ، سوز و گداز کچھ بھی نہیں - اخلاقی اور نفسیاتی نکات بے کم و کاست نظم کر دیئے گئے ہیں - متوسط طبقہ کے اخلاقی انحطاط سے متعلق یہ بظاہر بے آب و رنگ اشعار ہیں - ہر شعر میں متوسط طبقہ کے اخلاق و نفسیات کی دکھتی ہوئی رگ کو حالی نے چھولیا ہے اور سامنے کی باتیں کہتے ہوئے بھی دقت نظر کا ثبوت دیا ہے - ایسی نثریت بے اثر نہیں ہوتی -

ہوگی نہ قدر جان کے قرباں کئے بغیر
دام اٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کئے بغیر

گو ہوشفا سے یاس پہ جبتک ہے دم میں دم
بن آئے گی نہ درد کا درماں کئے بغیر

بگڑی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا
یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کئے بغیر

آمادہ دھر پردہ دری پر ہے قوم کی
مبروص کو رہے گا نہ عریاں کئے بغیر

عزت سے اپنی یاروں کو کچھ آپڑی ہے ضد
چھوڑیں گے نیمجاں کو نہ بیجاں کئے بغیر

مشکل بہت ہے گو کہ مٹانا سلف کا نام
مشکل کو ہم ٹلیں گے نہ آساں کئے بغیر

گو مے سے تند و تلخ پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑیگی نہ کچھ ھاں کئے بغیر

تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی
چھوڑیگا وقت انہیں نہ مسلماں کئے بغیر

حالی کٹے گا کاٹنے ہی سے یہ بیستوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کئے بغیر

مطلع عشقیہ اور اخلاقی دونوں پہلو لئے ہوئے ہے اور کس سج دھج سے کہا گیا ہے - غزل کے ہر ہر شعر میں ایک نکیلا پن ہے جو اہل وطن کے کردار و نفسیات کی دکھتی رگوں کو چھیڑ رہا ہے

اور ہر شعر میں گویا قوم کے دل کا چور نکل رہا ہے - پوری غزل میں جو کم کم سا ترنم و شعریت ہے وہی اس غزل کا حسن ہے - حساس عقلیت اور واقعیت نے ہر شعر میں ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ پیدا کر دی ہے - اشعار میں جو تسلسل اور ہم آہنگی ہے وہ بھی نظر انداز کرنے کی چیز نہیں ہے - حالی کی معتدل طنز کئی اشعار میں نظر آتی ہے -

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اجاڑ
ہو گئی اک اک گھڑی تجھ بن پہاڑ

آج تک قصر لعل ہے نا تمام
بندھ چکی ہے بار ہا کھل کھل کے پاڑ

ہے پہونچنا اپنا چوٹی تک محال
اے طلب نکلا بہت اونچا پہاڑ

کھیلنا آتا ہے ہم کو بھی شکار
پر نہیں زاھد کوئی ٹٹی کی آڑ

دل نہیں روشن تو ھیں کس کام کے
سو شبستاں میں اگر روشن ھیں جھاڑ

عید اور نوروز ہے سب دل کے ساتھ
دل نہیں حاضر تو ہے دنیا اجاڑ

کھیت رستہ پر ہے اور رہرو سوار
کشت ہے سر سبز اور نیچی ہے باڑ

بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی
ان دنوں کمتر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

تم نے حالی کھول کر ناحق زباں
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

غیر مردف غزل اور ہندی قافئے - مطلع عشقیہ ہے اور نہایت معصوم و پر اثر - بقیہ اشعار میں قافئے اور زبان کے ٹکڑے زندگی کے غیر عشقیہ شعبوں سے لئے گئے ھیں - ہیو ھاری زندگی کی جھلک ہر شعر میں ہے - کس سلیقے اور چابک دستی سے قافئے اپنی جگہوں پر

بڑھائے گئے ہیں ۔ ان قافیوں اور اس زمین میں اشعار کے پھوہڑ ہو جانے کا برابر احتمال ہے لیکن غور سے دیکھو تو بظاہر ناخوش آئند یا کرخت آوازوں سے حالی نے ہر شعر میں دلکشی اور شعریت پیدا کر دی ہے ۔

عہد و صال دل نے بھلایا نہیں ہنوز
عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز

پیغام دوست کا نہیں لایا کوئی ہنوز
جھونکا نسیم مصر کا آیا نہیں ہنوز

ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا
اس نے نقاب رخ سے اٹھایا نہیں ہنوز

یاں دے چکی جواب امید جواب خط
واں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز

پایا ہے ذوق‌وشوق میں ہم کو بھرا ہؤا
کافر نے اختلاط بڑھایا نہیں ہنوز

کیا دل سے بعد مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد
بھولے ہمیں کہ تجھ کو بھلایا نہیں ہنوز

سرمایۂ خلاف دو عالم ہے راز دل
باتوں میں ہم نے زہر ملایا نہیں ہنوز

کس نشہ میں ہے چور خدا جانے اس قدر
حالی نے جام منہ سے لگایا نہیں ہنوز

کیا کہنا ہے اس مطلعے کا ! دوسرا مطلع بھی دیکھئے مصرعہ ثانی نے شعر میں کیسی لطافت ، نزاکت اور پاکیزگی پیدا کر دی ہے ۔ کیا امیر ، داغ یا حالی کے اور معاصروں کے عشقیہ اشعار اس مہذب حس کا پتہ دیتے ہیں ۔ نصف صدی کے بعد سماعتوں میں وہ رچاؤ پیدا ہؤا کہ لوگ اب حالی کی عشقیہ شاعری کی قدر کرنے لگے ہیں ۔ ہر شعر کا مفہوم کتنا نرم اور لطیف ہے اور قافیہ ردیف سے مل کر ہر شعر کی آواز کو اختتام سے پہلے کتنا مترنم بنا دیتا ہے ۔ گنگنا گنگنا پڑھنے سے اس غزل کا لطف آتا ہے ۔ شروع سے آخیر تک آہستہ آہستہ

گھنگرو کی آواز آ رہی ہے - غزل کی یہ تحت النغمہ صفت دعوت سماع دیتی ہے -

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز
دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی
دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

جتنے رمنے تھے ترے ہوگئے ویراں اے عشق
آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

تذکرہ دھلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں بہت یاد آئینگی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی ابتو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو
یاد کر کرکے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

یہ غزل شروع سے آخیر تک قطعہ بند ہے۔ دلی کا مرثیہ ملک اور قوم علوم و فنون اور ایک بیت جانے والے زمانے کا مرثیہ بن گیا ہے۔ ہرگز کی ردیف ہر شعر میں قافئے سے مل کر ایک نغمۂ ماتم چھیڑ دیتی ہے۔ ہر شعر میں گویا ستار کے تار اور طبلے کے پردے آہستہ آہستہ چھیڑے جا رہے ہیں۔ مصیبت آ جانے پر شاعری مقصد حیات سے ہم آہنگ ہو رہی ہے۔ غم روز گار کا نغمہ گویا غم عشق کا بھرم کھول رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے روحانی یا عشقیہ شاعری کا سوز و گداز جھوٹا پڑ جاتا ہے۔ کس لئے دیئے پن کے ساتھ یہ پوری غزل کہی گئی ہے۔ حالی کا ضبط اور ان کا محتاط لہجہ بے چین کئے بغیر نہیں رہتا۔

رنجش و التفات و ناز و نیاز
ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز

عشق کی آنچ اس میں پاتا ہوں
دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز

شیخ؛ اللہ رے تیری عیاری
کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

اک پتے کی جو ہم نے کہ دی آج
رنگ واعظ کا کر گیا پرواز

ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری
تو گئی بھول ہم کو خاک حجاز

آج منکر بھی ناچ اٹھیں گے
گر مغنّی کی ہے یہی آواز

خیر ہے اے فلک کہ چار طرف
چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز

رنگ بدلا ہؤا ہے عالم کا
ہیں دگر گوں زمانہ کے انداز

چھپتے پھرتے ہیں کبک و یتھو سے
گھونسلوں میں عقاب اور شہباز

ٹڈیوں کا ہے کھیتوں پہ ہجوم
بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تر لب آز

تشنہ و خوں ہیں بھو کے شیروں کے
حیلہ گر رو بہوں کے عشوۂ ناز

دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس
اور یاروں کے یار ہیں غمساز

ہوگا انجام دیکھئے کیا کچھ
ہے پر آشوب جب کہ یہ آغاز

لے ابھی تک کھلی نہیں لیکن
غیب سے آ رہی ہے کچھ آواز

وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر
موج حائل ہے اور ہوا نا ساز

یا تھپیڑے ہوا کے لے ابھرے
یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز

کام اسے اپنے سونپ دو حالی
نہیں جس کا شریک اور انباز

ہے وہ مالک ڈبوے خواہ ترائے
چارہ یاں کیا ہے غیر عجز و نیاز

غیر مردف غزل ۔ کیا مطلع ہے ! ”رنجش و التفات ، ناز و نیاز کا ذکر یوں کرنا کہ ”ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز“ کتنی عمدہ

تعمیر ہے ۔ دوسرا شعر بھی خوب ہے ۔ تیسرے شعر میں ''توجہ'' کا لفظ طنز کی جان ہے ۔ چوتھا شعر بھی سادہ بیانی کے ساتھ کس قدر شوخ ہے ۔ پانچویں شعر میں حجازئت اور اتحاد اسلامی (Pan Islam) کے اس جذبہ کا شگون ہو رہا ہے جسے اقبال کی آواز دھکانے اور بھڑکانے والی ہے ۔ ساتویں شعر میں ترکستان کی اس مصیبت کی طرف اشارہ ہے جب آسے سلطان عبدالعزیز خاں کے قتل کے بعد روس اور دیگر ممالک کے مقابلہ میں شکست کا صدمہ اٹھانا پڑا ۔ بقیہ اشعار بھی انہی واقعات و جذبات کے اُس منظر میں کہے گئے ہیں ۔ یہ غزل صاف بال جبریل اور ضرب کلیم میں اقبال کی غزلوں کا پیش خیمہ ہے ۔ غم و غصہ کو ضبط و اختیاط سے پیش کیا گیا ہے ۔ حالی بے بسی کا شاعر ہے لیکن مجہولیت کا نہیں ۔ رہی حجازئت اور اتحاد اسلامی کی تحریک ۔ یہ ایک پیچیدہ بین الاقوامی مسئلہ ہے جسے نظر انداز کر دینا سلجھانا نہیں کہلائے گا ۔ فلسطین اور وسط مشرق کے مسائل آج بھی مدبروں کو دعوت فکر دے رہے ہیں ۔

لَے ابھی تک کھلی نہیں لیکن
غیب سے آ رہی ہے کچھ آواز

چھیڑ اب نہ اے تصور مژگان یار بس
کافی ہے خار خار غم روز گار بس

ڈرہے دلوں کے ساتھ امیدیں بھی پس نہ جائیں
اے آسیائے گردش لیل و نہار بس

دین غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ
یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس

آتا نہیں نظر کہ یہ ہو رات اب سحر
کی نیند کیوں حرام بس اے انتظار بس

تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

مطلعے کی زبان کتنی شستہ ہے اور کتنی مکمل ۔ غم عشق کو غم روزگار کی طرف حالی موڑ رہا ہے ۔ تمام اشعار خار خار غم روز گار

کی کھٹک ، ٹیس اور کم کم جلن رکھتے ہیں - حالی کی ایسی ہی اور غزلیں ہم پیش کر چکے ہیں - ان غزلوں کے ہر شعر کا جو اثر پڑتا ہی ہے لیکن اشعار کے تو اتر سے ایک افزائش پذیر اور مجموعی اثر بھی ہوتا ہے -

اک ہم کو مہم بر سر ایام ہے درپیش
بنتا نظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش

وہ وقت گیا نشہ تھا زوروں پہ جب اپنا
اب وقت خمار مئے گلفام ہے درپیش

جی اس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالی کو کوئی کام ہے درپیش

یہاں بھی غم عشق کو اور قوم کی بے بس کھوئی کھوئی زندگی کو غم روز گار اور اس سے متعلق اعمال کی طرف موڑا جا رہا ہے - غزل کے نئے امکانات حالی کی غزلوں میں دیکھئے - انہیں خشک و بے کیف و بے رنگ بہت دنوں تک کہہ چکے - بہت دنوں کی روحی و جسمانی دونوں طرح کی فاقہ کشی کے بعد کام و دھن اور معدے کی رگیں اب آلایشوں سے صاف ہو چلی ہیں اور حالی کے سادہ اشعار میں ہمیں ایک طرح کی لذت ملنے لگی ہے -

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص

حور و غلماں کے لئے لائیں دل آخر کس کا
ہونے دیتا نہیں یاں عہدہ برا ایک ہی شخص

قافلے گذریں وہاں کیونکہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور راہنما ایک ہی شخص

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ نبی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص

گھر میں برکت ہے مگر فیض ہے جاری شب و روز
کچھ سہی شیخ مگر ہے بخدا ایک ہی شخص
اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالی پہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

کیا زمین نکالی ہے! کتنے کنائے مطلعے میں ہیں اور کتنی جامعیت! ردیف میں حالی کی مخصوص طنز کے تمام امکانات ہیں۔ حالی کی کئی غزلوں میں قافئے الف کے حرف پر ختم ہوتے ہیں اور ان کی صوتیات میں حالی کا مزاج شعری چمک اٹھتا ہے۔ اور مقطع تو ایسا کہا ہے جس کا جواب نہیں۔ نچوڑ کا لفظ شاید سوا حالی کے ایسے موقعے پر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ حالی اپنا مرتبہ خوب سمجھتا تھا۔ پچاس برس بعد خیر سے اب اور لوگ بھی کچھ ایسا سمجھنے لگے ہیں کہ ''شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص'' بے جا دعوی نہیں تھا۔

عشق کو ترک جنوں سے کیا غرض
چرخ گرداں کو سکوں سے کیا غرض
گنگنا کر آپ رو پڑتے ہیں جو
اُن کو چنگ وار غنوں سے کیا غرض

دیکھئے حالی کی نئی تعبیر۔ عشق آسماں ہے جنوں ترغیب و تحریک گردش۔ دوسرے شعر میں حالی نے گویا اپنی شاعری کی تصویر کھینچ دی ہے چنگ وارغنوں کی ضرورت اُن کے ہمعصروں کی شاعری کو ہو تو ہو۔ حالی کی فغان زیر لب اپنے لئے خود چنگ وارغنوں ہے۔

رائے ہے کچھ علیل سی تیری
نبض اپنی بھی دیکھ اے نباض
ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

اھل وطن کی رائے، عقائد، نظریے ''فقیہ و شاعر کی ناخوش اندیشی'' سب علیل و مریض ہیں۔ اس علالت (Morbidity) سے

بچنا ہے ۔ نبض اپنی بھی دیکھ اے نباض ۔ مقطے میں اپنے اوپر چوٹ کرنے کے پردے میں حالی اپنے وقت کے ادب پرستوں پر ہنس رہا ہے۔ یہ غزل بھی بے ردیف کی ہے ۔

رات گزری ہو چکا دور نشاط
تہہ ہوئی بس اب کوئی دم میں بساط
زینۂ ممبر ہے لغزش کی جگہ
جانیو واعظ اسے راہ صراط
تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ
ہم کریں پینے میں پھر کیوں احتیاط

بے ردیف کی غزل ہے ۔ کیا یہ اشعار بالکل خشک اور نرس پند و نصیحت ہیں ؟ آپ مطلعے میں تاسف کا لہجہ اور بعد کے اشعار میں طنز نہیں دیکھتے ؟ حالی بہت لئے دیئے ہوئے انداز کا ہجو گو ہے ۔ اس کی ہجو احجتماعی زندگی کی تنقید ہوتی ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ قوم کو کچھ ڈھارس بندھانے کا وقت رہا بھی ہو (اور حالی نے کئی موقعوں پر ڈھارس بندھائی بھی ہے) لیکن حوصلہ اور جوش پیدا کرنے کا وہ وقت نہیں تھا ۔ ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ ابھی ہندی شاعر بھارتیند و ہریش چندر کے الفاظ میں ''بھارت دردشا'' کا ہی احساس کر سکتی تھی ۔

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزم شعر میں
باری تب ان کی آئی کہ گل ہو گئے چراغ

کیا مقطع ہے ۔ ہندوستان کی آزادی کا چراغ گل ہوتے حالی نے اپنی آنکھوں دیکھا تھا ۔

مکان عاریتی اور لباس بوسیدہ
بہت ہے زندگی مستعار کے لائق
گرہ میں دام نہ دفتر میں نام ہے حالی
تمہیں تو شہر میں ہو اعتبار کے لائق

مجبوری اور بے بسی کا شاعر حالی پہلے شعر میں درس قناعت دے رہا ہے لیکن ایک بے اطمینانی ، ایک بے صبری بوسیدہ لباس سے جھانکتی ہوئی نظر آ رہی ہے - دوسرے شعر کی طنز بھی قابل توجہ ہے -

دلوں کا کھوٹ اگر کھلئے ہر ملا اک ایک
تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا اک ایک

سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں
جہاں ہے راہزن خلق رہنما اک ایک

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہے رند و پارسا اک ایک

بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ
جگر کے پار ہے اب بھی تری نوا اک ایک

نہ ہم رہیں گے نہ حالی یہ دلخراش جہاں
رہے گی حالی دلگیر کی صدا اک ایک

قافئے کے الفاظ الف پر ختم ہو رہے ہیں اور اک ایک کی ردیف سے مل کر حالی کو اپنے خاص انداز میں اظہار مطلب کا موقع دے رہے ہیں - خاموش طنز ، اشعار کی سلاست و روانی ، ان کا گیت ہونے سے بال بال بچ جانا یا نثر موزوں بن جانا ، بظاہر غیر شاعرانہ زمین کا لہک لہک اٹھنا یہ سب صفات دیکھنے کی ہیں اور غور کرنے کی -

شاعروں کے ہیں سب انداز سخن دیکھے ہوئے
درد مندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دوکاں سب سے الگ

پہلے شعر میں مروجہ و مقبول شاعری پر جامع تنقید کر دی ہے - شاعر اور ہی لوگ کہلائیں - حالی اپنے آپ کو صرف درد مند کہلوانا چاہتے ہیں - مقطعے میں اپنے مخصوص انداز میں تعلی کی ہے اور کتنی سچی تعلی -

صلح ہے اک مہلت سامان جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ
علم کیا، اخلاق کیا، ہتھیار کیا،
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ
روکئے بدخو کو بد خوئی سے کیوں
آپ اپنی خو سے آ جائے گا تنگ
زھد و طاعت پر جوانوں کے نہ جاؤ
یہ بھی ہے اک نوجوانی کی ترنگ
پاکبازوں کو نہیں کچھ قید وضع
جو ہیں اچھے اُن پہ سب کھلتے ہیں رنگ
وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل
دیکھ پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ
کاھشوں سے پرورش پاتی ہے روح
اب لگا کھایا پیا سب آ کے انگ
قوم کو حالی نہیں راس اتفاق
پھوٹ ھی کا بس کھلے گا ھم پہ رنگ

یہ غزل بھی غیر مردف ہے - شاعری سے دماغی تعیش و تلذذ کے جو سامان پانے کی ہم توقع رکھتے ہیں ان میں سے اس غزل میں بھی کوئی نہیں - تنقید حیات پوری غزل میں ملے گی اور حالی کی زبان ہم سمجھ سکیں تو ان ''بے نمک'' اشعار میں لذت بھی ملے گی - جی ھاں زباں کی لذت -

ھو گئے ھیں ھم ھی کچھ اور آج کل
یا زمانہ ھی گیا یا رب بدل
رہ گئے ھیں کچھ کچھ آثار سلف
اور ابھی ھونا ہے شاید مبتذل
اک سنبھلتے ھم نظر آتے نہیں
ورنہ گر گر کر گئے لاکھوں سنبھل
کب تک آخر ٹھہر سکتا ہے وہ گھر
آ گیا بنیاد میں جس کی خلل

ناؤ ڈوبے یا کہیں کھیوا ہو پار
تیری حد بھی ہے کچھ اے طول امل

اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی
لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل

دیکھئے نبھتا ہے کب تک پاس وضع
ہم نہ بدلے اور گیا عالم بدل

کوششوں میں کچھ مزا آتا نہیں
وقت کوشش کا گیا شاید نکل

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

یہ غزل بھی بے ردیف کی ہے ۔ ہیں نہ اس میں بھی وہی تمام باتیں ، وہی بدن چور محاسن جنھیں پہلے کی غزلوں میں ہم دیکھ چکے ہیں دیکھئے کن الفاظ کو غزل میں کھپا دیا ہے ۔ ''کھیوا'' ''پود'' وغیرہ ۔ آہستہ آہستہ ایسی غزلوں کا اثر پڑھنے والوں پر ہوتا ہے ۔

پھر وہی ہم ہیں کہ ہر عشوہ پہ ہیں کافر کے لوٹ
زال دنیا سے ابھی ہو کر خفا بیٹھے تھے ہم

سعی کا انجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر
ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اٹھا بیٹھے تھے ہم

ہم سے خود دنیا ہی پتیائی نہ حالی ورنہ یاں
دین تک دنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم

مقطعے ہین ''پتیائی'' کا کیا لفظ رکھ دیا ہے ۔ دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں نا امیدی کی تصویر کھینچ دی ہے ۔

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
پر ہر اک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم

گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا
اک جہاں سے آپ کو لیکن خفا پاتے ہیں ہم

جانتے اپنے سوا سب کو ہیں نے مہرو وفا
اپنے میں گر شمۂ مہرو وفا پاتے ہیں ہم

ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کر سکتے ہیں صبر
درد خود کامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم

ٹھہرتے جاتے ہیں جتنے چشم عالم میں بھلے
حال نفس دوں کا اتنا ہی برا پاتے ہیں ہم

جس قدر جھک جھک کے ملتے ہیں بزرگ و خرد سے
کبرو ناز اتنا ہی اپنے میں سوا پاتے ہیں ہم

ہے ردائے نیکنامی دوش پر اپنے مگر
داغ رسوائی کے کچھ زیر ردا پاتے ہیں ہم

راہ کے طالب ہیں پر بے راہ پڑتے ہیں قدم
دیکھئے کیا ڈھونڈھتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم

نور کے ہم نے گلے دیکھے ہیں اے حالی مگر
رنگ کچھ تیری الاپوں کا نیا پاتے ہیں ہم

دیکھئے یہاں بھی قافئے کے الفاظ الف پر ختم ہوتے ہیں - ایسے الفاظ کی آواز کو حالی کے مزاج سے خاص مناسبت ہے - نفسیاتی حقائق کی تحلیل کئی اشعار میں ملے گی - حالی کے اشعار کا مزہ لینے کے لئے لفظ ''مزہ'' کے معنی بدلنے کی ضرورت پڑتی ہے - ہر شعر دعوت فکر و تامل دے رہا ہے - ردیف میں ''ہم'' کا لفظ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی کریکٹر کی طرف اشارہ کر رہا ہے - یہ انفرادی ''ہم'' نہیں ہے -

آگے بڑھے نہ قصہ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایہ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خود رفتگئی شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

درد فراق رشک عدو تک گراں نہیں
تنگ آ گئے ہیں اپنے دل شادماں سے ہم

ہنستے ہیں اس کے گریۂ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہہ کے کوئی رازداں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرز ادا سے ہم
دلکش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جا کے دیکھئے کب کارواں سے ہم
لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جا کے حالی جادو بیاں سے ہم

یہاں البتہ انفرادی اور ذاتی ''ہم'' ہے - جانکار لوگوں میں حالی کی یہ غزل مشہور ہے - پوری غزل ایک موج ترنم ہے - ایسے مطلعے دوئم درجہ کے غزل گویوں کے یہاں تو درکنار صف اول کے غزل گو شعرا کے یہاں کہاں ملتے ہیں - حالی کے جو مطلعے چمک گئے ہیں وہ عموماً دوسرے استادوں کے چمکے ہوئے مطلعوں سے جدا گانہ فنی و معنوی حیثیت رکھتے ہیں - حالی کے ایسے مطلعوں میں جذبات کا اعتدال ، مفہوم کی تہگیری ، تعبیرات کی نوعیت ، زبان کی شستگی ، بیان کی تکمیل ، سنجیدگی اور سجاوٹ سب مل کر ایک ایسی تھرتھراہٹ پیدا کر دیتے ہیں جو دیگر اساتذہ کے مشہور مطلعوں سے بالکل مختلف چیز ہے - حالی ایک خاص قسم کے مطاعوں کا شاعر ہے - یہی مطلعے وہ فضا پیدا کر دیتے ہیں جو پوری غزل کی فضا بن جاتی ہے - حالی کے مطاعے کلیدی آہنگ یا سُد (key note) ہوتے ہیں پوری غزل کے لئے - یہی اس غزل میں بھی ہؤا ہے - مطلعوں کے بعد اشعار میں بھی وہی تھرتھراتا ہؤا توازن وہی نغمگی ، وہی آنچ جو شعلہ بنتے بنتے اور لو دبتے دبتے رہ جاتی ہے ، وہی رنگ وہی حالت ، وہی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں جو مطاعے سے شروع ہوتی تھی یا جس کی پہلی کرن مطلعے سے پھوٹی تھی - ہر شاعر اپنے مختلف مفہوم کے ساتھ یہی کیفیتیں پیدا کر دیتا ہے بلکہ مختلف مفہوم ایک ہی کیفیت سے ہم آہنگ ہو کر اسی کیفیت کے نوبنو آلۂ اظہار بن جاتے ہیں اور اس طرح غزل میں ایک تسلسل اور وحدت پیدا ہو جاتی ہے -

یاروں کو تجھ سے حالی اب سر گرانیاں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں
رحمت تیری غذا ہے غصہ ترا دوا ہے
شانیں ہیں جتنی تیری جان جہانیاں ہیں
ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نا مہر بانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گلفشانیاں ہیں

مطلعے کے دوسرے مصرعے میں تعقید دیکھئے مگر بری نہیں لگتی - شاعر کا خلوص ، اس کے ملی جذبات ان سیدھے سادے اشعار میں ایک اثر بھر دیتے ہیں - ادبئیت کی دبی دبی سی چاشنی ان اشعار کو خشک نثرئیت سے بچا ہی نہیں لیتی ہے بلکہ ان میں ایک لذت پیدا کر دیتی ہے - جب قوم کا مذاق سخن زہر آلود ہو چکا تھا اس وقت ایسی غزل اور ایسے مصرعے ''کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں'' تکلیف دہ حد تک بے کیف و بے مزہ بلکہ بد مزہ معلوم ہوتے تھے اور ''اف تری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی'' - قسم کی شاعری پر قوم مٹی ہوئی تھی - لیکن اب حالی کی مہیا کی ہوئی سادی غذا اس بے قدری کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی - یہ ضرور ہے کہ اس غزل جیسی شاعری میں ہم جادو تو نہیں پاتے اس میں کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے - حالی کوئی کشفی پیکر (vision) دیکھ نہیں سکتے جس کے نظارہ میں وہ خود گم ہو سکیں اور ہمیں گم کر دیں اس لئے وجدان کو ذرا آتر کے ایسی شاعری کا کچھ مزہ آتا ہے - ایسے اشعار کبھی کبھی گنگنا لینے کی چیزیں ہیں ایسے میں ان اشعار میں جو رکی رکی سی دبی دبی سی کوئی چیز ہے مزہ دے جاتی ہے -

کی تو ہیں ہم نے بھی حالی کوچ کی تیاریاں
سوجھتی ہیں راہ میں لیکن بہت دشواریاں

بے مزہ ہے اہل دیں کی ترشروئی بھی مگر
اس سے پھیکی اہل دنیا کی ہیں ظاہر داریاں

یہ غزل بھی غیر مردف ہے۔ پس ماندہ قوم کو کن کن دشوار گذار منزلوں سے گذرنا ہے اسی طرف اشارہ ہے۔ حالی کا نام پورے کارواں کی جگہ پر ہے۔ حالی اہل دین اور اہل دنیا دونوں سے غیر آسودہ تھے لیکن اہل دین کی ترشروئی اگرچہ بے مزہ تھی اہل دنیا کی ظاہر داریاں اور بھی پھیکی تھیں۔ کیا علی گڈھ کالج والوں سے بے اطمینانی کا جذبہ حالی کے دل میں پیدا ہو چلا تھا؟ یا یہ اہل دنیا کوئی اور لوگ ہیں؟

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید
جنّتی جتنے ہیں سب ہم سےحذر کرتے ہیں
کم سے کم وعظ میں اتنا تو اثر ہو واعظ
بول قوال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں
دل رکاوٹ سے جوان کی کبھی رک جاتا ہے
اک لگاوٹ میں ادھر سے وہ آدھر کرتے ہیں

دین کے ٹھیکیداروں اور جنت کو اپنا اجارہ سمجھنے والوں میں اتنی بھی روا داری نہ تھی کہ مذہب کے معاملات میں عقل کو ذرا بھی روا رکھیں۔ دوسرے شعر میں بھی واعظ کی خشک بیانی کی شکایت ہے۔ تیسرا شعر عشقیہ رنگ میں ہے۔ رکاوٹ اور لگاوٹ کا تقابل خالی از لطف نہیں بات بھی سچی ہے شعر میں محاکاتی پہلو ہے۔

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلیں گے سینکڑوں اس میں
کی نصیحت بری طرح ناصح
اور اک بِس ملا دیا بِس میں
جس سے نفرت ہے اہل نعمت کو
وہی نعمت ہے چشم مفلس میں
ہو فرشتہ بھی تو نہیں انسان
درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں

جانور - آدمی - فرشتہ - خدا
دیکھئے ہو بگاڑ کس کس میں
کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھوگے اس کو مجلس میں

ہلکے پھلکے اشعار ہیں جن میں نثر موزوں کا مزہ ہے - ہر شعر میں ایک بات ہے اور لطف بیان کی ایک ہلکی سی چاشنی -

بوالہوس عشق کی لذت سے خبر دار نہیں
ہیں مئے ناب کے دلال قدح خوار نہیں

شہر میں آن کے نہیں جنس وفا کی بکری
بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے پہ خریدار نہیں

شراب کے دلال اور شراب نوشوں میں وہی فرق ہے جو بوالہوس اور عشاق میں ہے - کتنی عمدہ تعبیر ہے - دوسرا شعر بھی قوم کے مجہول ارادوں پر تنقید ہے - لوگ محض لاچانا جانتے ہیں کچھ کرنا نہیں جانتے ''بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے پہ خریدار نہیں''۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

ہے دور جام اول شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھئے ہم کو سحر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

بس ہو چکا بیان کسل و رنج راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دل وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں
حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈھتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

حالی کی یہ غزل بھی مشہور ہے ان لوگوں میں جن میں مشہور و مقبول ہونا معنی رکھتا ہے۔ میں حالی کے مطلعوں کے بارے میں کچھ باتیں کہہ چکا ہوں اس مطلعے میں بھی حالی کا وہی کمال نمایاں ہے جو ان کے متعدد مطلعوں میں پایا جاتا ہے۔ ایسے کمائے مطلعوں میں بہت کم کئے گئے ہیں۔ پوری غزل تحت النغمہ صوتیات کی سامع نواز مثال ہے۔ ہر شعر میں ردیف کی آواز سے گویا زیر لب نغمہ چونک سا اٹھتا ہے۔ چوتھا شعر اہل نظر کا منتخب شعر ہے ''اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق''۔

زباں تقریر سے قاصر قلم تحریر سے عاجز
نہ پوچھو ہم سے کیا دیکھا ہے ہم نے بزم رنداں میں
نہ دی حیرت نے حالی فرصت سیر جہاں اک دم
رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں ''کیا دیکھا ہے'' کے ٹکڑے میں شاعر بہت کچھ کہہ گیا ہے۔ حالی بات کو کم کرکے بات کا اثر بڑھا دیتے ہیں کم کر کے اور نرم کر کے۔ مقطعے میں پریشان نظری کا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ ہزار ہا آدمیوں کی زندگی بلکہ لاکھوں اور کروڑوں کی زندگی بھرے ہوئے شہروں میں اس سراسیمگی میں اس کھوئی ہوئی حالت میں کٹتی ہے کہ گویا وہ شہر میں بھی رہ کر بیابان میں ہیں۔

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
مجھ کو تم سے ہے پر اعتماد وفا
تم کو مجھ سے پر التفات نہیں

رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں

یونہی گذرے تو سہل ہے لیکن
فرصت غم کو بھی ثبات نہیں

ذرہ ذرہ ہے مظہر خورشید
جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں

قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

اہا ہا، آواز کو کس نرمی سے سانچے میں ڈھال دیا ہے - الہامی مطلع ہے - حالی کو محض نظم کا شاعر کہنے والے حالی کے ہمعصر مشہور غزل گو اور خالص غزل گو شعرا کے دواوین سے ایک ایسا مطلع ڈھونڈھ نکالیں - دوسرے شعر میں ''تم سے پہ'' اور ''مجھ سے پہ'' کے ٹکڑے میر کی یاد دلاتے ہیں - تیسرے شعر کو دیکھئے ''زندگی موت ہے حیات نہیں'' چوتھا شعر کتنا بلیغ ہے - اور احساس کتنا نازک - پانچواں شعر گویا ایک مستقل صبح کا سماں ہے ''جاگ اے آنکھ دن ہے رات نہیں'' - مقطع دیکھئے بقول غالب ''پیشے میں عیب نہیں رکھئے نہ فرہاد کو نام'' یا بقول میر عشق میں ''سید ہو یا چمار'' دوسرا مصرع تو ضرب المثل ہے ''عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں'' کیا کہنا پوری غزل کی نرمی و نغمگی، آواز و سکوت، جاگنے اور سونے کی ملتی ہوئی سرحدوں پر شعور کو لے جاتے ہیں -

کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غم ہجراں میں نہیں
چاک دل میں ہے مرے جو کہ گریباں میں نہیں

محتسب ! صدق و صفایاں ہے انہیں کے دم تک
مصلحت برہمی صحبت رنداں میں نہیں

یاں بھی ہے کون و مکاں سے دل وحشی آزاد
جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں

ٹھہرتے ٹھہرتے دل یوں ہی ٹھہر جائیگا،
بات جو آج ہے وہ کل غم ہجراں میں نہیں

کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں
دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے الجھاؤ ترے کا کل پیچاں میں نہیں
آدمی ہو تو کبھی پاس محبت کے نہ جائے
اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں
بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ھجراں میں نہیں
حالی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاھد باز
یہ تو آثار کچھ اس مرد مسلماں میں نہیں

اس غزل کے مطلعے میں بھی وھی سجی ھوئی معنویت ہے جو حالی کے کئی مطلعوں میں ہے - والد مرحوم حضرت عبرت کا یہ شعر یکایک یاد آ گیا :—

ظاھر مرا خراب ہے باطن مرا درست
جو چاک دل میں ہے وہ گریباں میں نہیں

دوسرے اور تیسرے اشعار میں بندش کا حسن ، روانی ، ترنم اور زبان کی شستگی دیکھئے - چوتھے شعر کا کیا کہنا - یہ تسلی دے کر ''بات جو آج ہے وہ کل غم ھجراں میں نہیں''- معلوم نہیں عشق کی بے چینی بڑھادی یا گھٹادی - پانچواں شعر دیکھئے - غالب تو ''جان نذر دلفریبئی عنواں کئے ہوئے'' نامۂ دلدار بار بار دیکھنا چاھتے ھیں - لیکن حالی نے نفسیات محبت کے ایک نکتہ پر روشنی ڈالی ہے - عنوان میں عاشق سے خطاب کرتے ہوئے محبوب کا قلم کچھ رکا رکا سا تھا اور تکلف نے اس کی اجازت نہ دی کی پیار بھرے خطاب سے خط شروع کرے لیکن آگے چل کر محبت کے جذبات ابل پڑے اور پریم سے بھراھوا القاب و خطاب دوران خط میں لکھ دیا - اب ''کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں''-

ساتواں شعر بھی قابل توجہ ہے اور حالی کی مخصوص سنجیدہ و طنزیہ بذلہ سنجی کی مثال - ''غیر کے نقصان میں نہیں'' کے معنی ھیں

ہم اپنے رقیب کا نقصان نہیں چاہتے - اگر رقیب نے پہلے مصرعے والی بات مان لی تو حالی کے لئے میدان صاف ہو جائے گا - رقیب محبت کی آزمائشوں سے ڈر کر کنارہ کش ہو جائیگا اور حالی جو اس مصیبت میں پڑنے کو تیار ہیں معشوق تک پہونچ سکیں گے - کسی چیز کو مہنگی یا بری بتا کے دوسروں کو اسے حاصل کرنے سے روک کر بسا اوقات لوگ خود اس چیز کو حاصل کر لیتے ہیں - آٹھواں شعر تو قدر اول کی چیز ہے عشق کی ساری مصیبت ''امید ملاقات'' سے پیدا ہوتی ہے - دوسرے مصرعے میں صرف ''اب'' کے لفظ سے اس پر درد یا پرسکون واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اب امید ملاقات جاتی رہی اور سکون یاس حاصل ہو چکا ہے - اس لئے ''اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں'' دیکھئے ''درازی'' کا لفظ کیا کیا معنی دیتا ہے - یہ شعر بیت الغزل ہے - مقطع میں خود کو ''مرد مسلماں'' کہہ کر اپنے آپ پر ایک عجیب طنز کی ہے - شاعد باری کے آثار اس ''مرد مسلماں'' میں نہ سہی لیکن کچھ بات ہے ضرور - پوری غزل میں مفہوم ولحن کا امتزاج اور ان کی باہم ہم آہنگی قابل توجہ ہے -

قول دینے میں تامل ہے نہ قسم سے انکار
ہم کو سچا نظر آتا کوئی اقرار نہیں

بس حسرت موہانی کا یہ شعر سن لیجئے جس کا دوسرا مصرعہ حالی کے شعر کی تائید ہے :—

مرے اصرار پیہم سے عیاں ہے میری بیتابی
ترے اقرار آساں سے ترا انکار پیدا ہے

میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں
اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابل اظہار نہیں

بہت صاف اور رواں دواں بے لاگ اشعار ہیں - کوئی مانے یا نہ مانے حالی کو غزل کے فن اس کی تکنیک و اسلوب پر غیر معمولی

قدرت حاصل تھی وہ غزل کے کئی پہلوؤں کو اپنے ہم عصروں سے زیادہ نازک اور لطیف بنا دیتے تھے -

وحشت میں تھا خیال گل و یاسمن کہاں
لاتی ہے بوئے انس نسیم چمن کہاں
لاتا ہے دل کو وجد میں اک حرف آشنا
لے جائے ہم کو دیکھئے ذوق سخن کہاں
جی ڈھونڈھتا ہے بزم طرب میں انہیں مگر
وہ انجمن میں آئے تو پھر انجمن کہاں
کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو لے گیا ہے وہ بیداد فن کہاں
روکا بہت کل آپ کو حالی نے واں مگر
جاتا ہے محو شوق کا دیوانہ پن کہاں

یہ غزل بھی حالی کے مخصوص انداز تغزل کی نہایت اچھی مثال ہے - اس بحر میں حالی کی طبیعت اپنے خاص جوہر دکہاتی ہے - اس بحر میں ہر شعر کا خاتمہ اور آواز کا بند ہونا ایک نرم اچانک پن کے ساتھ ہوتا ہے - جن خیالات میں حسرت و حرماں کی چاشنی ہوتی ہے، جہاں بنیادی احساس وقت گذر جانے اور کف افسوس ملنے کا ہو، ماتم ماضی کا ہو یا پچھتاوے کا ہو ان کے اظہار کے لئے یہ بحر بہت مناسب ہے - ہر شعر کے آخر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ احساس غم کو غیب کی انگلیاں آہستہ سے چھیڑ دیتی ہیں اور تحت الحیرت (Sub-wonder) کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے - ہر شعر کے خاتمے پر کچھ چونک پڑنے کا عالم پیدا ہو جاتا ہے - حالی کی آواز کی آہستگی اس غزل میں دیکھئے - دوسرے شعر میں ''اک حرف آشنا'' کی اثر انگیزی کے امکانات سوچئے اور پھر دیکھئے کہ دوسرے مصرعے میں ردیف ''کہاں'' کے مفہوم کہاں کہاں پہونچتے ہیں - تیسرا شعر بیت‌الغزل ہے ''وہ انجمن میں آئے تو پھر انجمن کہاں'' یہاں بھی کہاں کی معنی خیزی (Suggestiveness) پر غور کیجئے - بعد کے دونوں اشعار بھی اچھے ہیں اور بہت اچھے - کیا مصرعہ ہے ''شکوے کو لے گیا ہے وہ بیداد فن کہاں''- اور پہلا مصرعہ تو غالب کی یاد دلا دیتا

ہے - اس غزل کے ساتھ کہاں کی ردیف کے ساتھ حالی کی اس غزل کو پھر دیکھ لیجئے ''رکھی ہے آج لذت درد جگر کہاں''۔ جسے اس غزل کے پہلے ہم پیش کر چکے ہیں اور وہ غزل بھی ''کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم''۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہولیں
دھرا کیا ہے اشارات نہاں میں

کہیں انجام آ پہونچا وفا کا
کھلا جاتا ہوں اب کے امتحاں میں

نیا ہے لیجئے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

نہایت کامیاب غزل ہے اور حالی کے مخصوص اسٹائل میں ہے مطلعے میں وہی صفات ہیں جن کا ذکر حالی کے مطلعوں سے بحث کرتے ہوئے میں پہلے کر چکا ہوں - محرم وہ ہے جو اپنے دوست کی مخصوص زبان یا اس کی شعوری و نفسیاتی خصوصیتوں کو سمجھے - الفاظ تو ہر شخص وہی بولتا ہے جو عام ہیں لیکن پھر بھی ہر شخص کی ایک اپنی زبان ہوتی ہے - جس کے معنی مخصوص طرز ادا کے نہیں ہیں بلکہ کچھ اور - دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ دیکھئے ''دھرا کیا ہے اشارات نہاں میں'' کتنی نشتریت ہے -

معشوق کے ''اشارات نہاں'' ارادی چیزیں نہیں ہیں اضطراری چیزیں ہیں - تیسرے شعر کو دیکھئے - اب کے امتحان میں وہ عالم ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ''وفا'' جواب دے جائے گی - چوتھا شعر میرا محبوب شعر ہے - جب اس کا نام ہر بار نیا معلوم ہوتا ہے تو داستان عشق کی وسعتوں کا کیا کہنا - ''وسعت'' مقداری چیز نہیں ہے صفاتی یا داخلی چیز ہے - مقطع سیدھے سادے الفاظ میں کتنا مزہ دے رہا ہے - ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں'' -

مرے دل میں ہو گو مجھ سے نہاں ہو
مجھے بھی ڈھونڈھ لینا تم جہاں ہو

تقاضائے محبت ہے وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

بہت بیقدر ہوں محفل میں تیری
کہیں ناخواندہ، تو بھی میہماں ہو

مطلعے کا بلیغ کنایہ دیکھئے - دوسرے شعر پر بے اختیار آہ نکل جاتی ہے - یہی حال تیسرے شعر کا بھی ہے -

حکم ہے پیر مغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ
خیر کفارۂ عصیاں ہے پئو اور پلاؤ

دوست ہوں جس کے ہزاروں وہ کسی کا نہیں دوست
سچ بتا تجھ کو کسی سے بھی ہے دنیا میں لگاؤ

تو وہی برق جہاں سوز ہے بن خواہ نہ بن
ہے برابر ترا بیساختہ پن اور بناؤ

ایک ہی دوست اور اس سے ہمیں چھڑواتے ہو
ناصحواب تمہیں دشمن کہیں یا دوست بتاؤ

تجھ کو اے ابر بلا دیکھ کے جی چھوٹ گیا
ایک ہی بار تم اے باد لو اس طرح نہ چھاؤ

اے شرافت تجھے بکنا ہے اگر مفت تو بک
آج کل کیجئے کیا ہے یہی بازار کا بھاؤ

قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ
وقت اب ھاتھ سے جاتا ہے جو آتے ہو تو آؤ

اس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

کیا زمین نکالی ہے بے ردیف کی غزل ہے - ہر شعر کی آواز سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے - کس سلاست سے جذبات، خیالات اور مشاھدے بیان ہوتے گئے ہیں - قافیہ ہر شعر میں نمایاں طور پر بیان کی

تکمیل کر رہا ہے باتیں بھی سوچ سمجھ کے موضوعات کو دیکھ بھال کے جانچ پرکھ کے حساس انداز میں نہایت روانی کے ساتھ کہی گئی ہیں - حالی محض الفاظ سے نہیں کھیلتے - باتیں کہتے ہیں - الفاظ ان کے مطلب کو نہیں چمکاتے ان کے مطالب سادہ الفاظ کو چمکا دیتے ہیں - اس غزل کا اٹھان دیکھنے کی چیز ہے اور بعد کے اشعار کی شانیں بھی - مقطعے کے پہلے والے شعر میں ''لگ بھگ'' کا ٹکڑا اور دوسرے مصرعے کی برجستگی ''وقت اب ہاتھ سے جاتا ہے جو آتے ہو تو آؤ'' دیکھئے ''حرم کے لگ بھگ'' محض تمثیلی انداز بیان ہے یہ کہنے کے لئے کہ منزل مقصود کے قریب -

در فیض حق بند جب تھا نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں ہے اب بھی سب کچھ

ہے افسردہ مجلس کی خست سے واعظ
وہ گرمائے گا یہ پسیجیں گے جب کچھ

تم اپنی سی کہنی تھی جو کہہ چکے سب
نہیں ناصحو تم پہ الزام اب کچھ

کوئی لقمۂ چرب تاکا ہے شاید
یہ حالی کی عزلت نہیں بے سبب کچھ

ان اشعار کی کتنی امید نا افزا (Unpromising) زمین ہے - مگر اشعار تو دیکھئے - زمین کی بظاہر نامانوسیت ہی مخصوص خوبیوں کا راز ہے - سچ ہے - ''فقیروں کی جھولی میں اب بھی ہے سب کچھ'' -

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی
نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے
نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ

کرو علم سے اکتساب شرافت
نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو
اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ

وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا
جو دولت سے کرتے ہیں نفرت زیادہ

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

بکے مفت یاں ہم زمانہ کے ہاتھوں
پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ

ہر شعر میں اجتماعی و انفرادی زندگی کے نفسیاتی و اخلاقیاتی نکات بیان ہوئے ہیں - براہ راست و بے کم وکاست - ہر شعر نثرئت سے بال بال بچ گیا ہے - آخری شعر کے انکسار کی کیا داد دی جائے - دوسرا اہم پہلو بھی اس شعر کا بربادئی قوم سے متعلق ہے - قوم مفت زمانہ کے ہاتھوں بک گئی اور پھر بھی مہنگے داموں بکی - کتنی گئی گذری حالت کو قوم پہونچ چکی ہو گی کہ مفت بکی اور مہنگی بکی -

حقیقت محرم اسرار سے پوچھ
مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ

وفا اغیار کی اغیار سے سن
مری الفت درودیوار سے پوچھ

متاع بے بہا ہے شعر حالی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

مطلعے میں تعبیرات کا حسن دیکھئے - دوسرے شعر ایسا کوئی شعر امیر و داغ و جلال یا حالی کے اور معاصرین کے یہاں ملتا ہے ؟ مقطعے کی تعلی میں بالکل مبالغہ نہیں ہے - غزل کی زمیں تو دیکھئے - قافئے اور ردیف میں جو ایک ہاکا سا ٹھسا ہے وہ لطف دے جاتا ہے -

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

ھیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونو ،
دیکھنا یہ ھے کہ بے لاگ سخن کس کا ھے

کیا کہنا ھے اس مشہور مطلعے کا حالی ھی کا شعر کیا آپ کو یاد نہیں آیا :—

کس سے پیمان وفا باندھ رھی ھے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

حالی کا مقطع بھی "بے لاگ سخن" کی مثال ھے ۔ واعظ کی فصاحت جیسی بھی ھو ۔ غالباً باوجود فصاحت کے بجائے بے لاگ بات کے اس کے بیان میں کچھ لگی لپٹی ضرور ھو گی ۔

ھوا کچھ اور ھی عالم میں چلتی جاتی ھے
ھنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ھے
عجب نہیں کہ رھے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ھے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ھے
قلق انھیں نہیں گر دوستوں سے چھٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ھے
نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ھے کچھ حالی
کچھ اک جھجھک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ھے

خوب زمین نکالی ھے ۔ ھر شعر کے ساتھ غزل سانچے میں ڈھلتی جا رھی ھے ۔ تیسرا شعر اور مقطع خاص توجہ کے مستحق ھیں ۔

بری اور بھلی سب گذر جائے گی
یہ کشتی یونہی پار اتر جائے گی
ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتا
ھر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
ادھر ایک ھم اور زمانہ اُدھر
یہ بازی تو سو بسوے ھر جائے گی

نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہوں
یونہی عمر ساری گذر جائے گی
سنیں گے نہ حالی کی کبتک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

تعبیرات مطلعے کے دیکھئے - دوسرے شعر میں قومی زندگی کے انتشار کی کیسی تصویر کھینچی ہے - تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں بول چال اور محاورے کا لطف دیکھئے - حالی محض واعظ نہیں ہے - شاعر ہے اور ماہر فن - چوتھے شعر پر کبیر کا مصرع یاد آ گیا - ''بیتی جائے عمر دھوکے میں''- ''یونہی عمر ساری گذر جائے گی'' - ''اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا'' - یا بقول میر زندگی کو ''دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ'' مقطعے کو دیکھو - کیا حالی کی صدا بالکل بے کار گئی ؟

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی
اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تمیز
اس میں شہری بھی ہیں کوہی بھی ہیں صحرائی بھی
دل غنی رکھتے ہیں اے دولت دنیا جو لوگ
تیور اُن کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی

بڑی البیلی زمین نکالی ہے - اہل معنی کا کام صرف بے لاگ باتوں سے نہیں چلے گا - سننے والوں میں صرف اہل نظر نہیں ہیں ''تماشائی'' بھی ہیں جو صرف ''سخن آرائی'' یا بازیٔ الفاظ کی داد دیتے ہیں - بقیہ دونوں اشعار بھی مزے سے خالی نہیں -

برائی ہے رندوں میں بھی شیخ لیکن
کہاں یہ برائی کہاں وہ برائی
جو کہئے تو جھوٹی جو سنئے تو سچی
خوشامد بھی ہم نے عجب چیز پائی

ڈر نہیں غیر کا جو کچھ ہے سو اپنا ڈر ہے
ہم نے جب کھائی ہے اپنے ہی سے زک کھائی ہے

بات سچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سبکی
سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

توبہ حضرت کی یو نہیں اک دودھ کا سا ہے آبال
ہم دکھا دیں گے ذرا دم بھر توقف کیجئے

فکر فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی
جان کو ہم نے لگائی ہے یہ علت کیسی
نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے حالی انجام
یار کی میں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے
شکوے وہ سب سنا گئے اور مہرباں رہے
کیا کیا ہیں دل میں دیکھئے ارماں بھرے ہوئے
ہم میزباں نہیں جو کوئی میہماں رہے
پوچھی گئی نہ بات کہیں پاس وضع کی
اتنے ہی ہم سبک ہوئے جتنے گراں رہے
دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے
دارا و جم کو تیرے گداؤں پہ رشک ہے
شرح متاع عشق الہیٰ گراں رہے
حالی سے مل کے ہوگئے افسردہ دل بہت
اگلے سے ولولے وہ اب اس میں کہاں رہے

لا جواب مطلع کہا ہے - مومن کے رنگ میں ہے - حالی کے کئی اشعار میں مومن کا رنگ جھلک جاتا ہے - شکوے سنکر خلوص اور بے تکلفی کا تقاضا تو یہ تھا کہ روٹھتے یا بگڑتے لیکن ''شکوے وہ سب سنا گئے اور مہرباں رہے'' اور عاشق کا دل خون ہو گیا - دوسرے شعر میں بھی حسن کے تکلف ہی کا رونا ہے - اگر مہمان بن کے بیٹھو گے تو میں میزبان ہونے سے باز آیا - غزل کا ہر شعر کیا بلحاظ زبان و بیان و روانی و ترنم اور کیا بلحاظ معنی و مفہوم رچے

ھوئے تغزل کا نمونہ ھے - اگلی غزل بھی اسی زمین میں ھے اور انہی خوبیوں سے مزین ھے جو اس غزل میں ھیں -

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اسکی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے
یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے
کل کی خبر غلط ھو تو جھوٹے کا رو سیاہ
تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے
دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ھو یا درمیاں رہے

سخت مشکل ھے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

والد مرحوم عجب کیفیت سے اس شعر کو پڑھا کرتے تھے - دوسرے مصرعے میں ''ہم بھی'' کے ٹکڑے سے بہت متاثر ہوتے تھے -

دوستوں کی بھی نہو پروا جسے
بے نیازی اس کی دیکھا چاھیئے

لا جواب شعر ھے فطرت حسن کی اور حسن و عشق کے المیہ کی تصویر ھے -

خط آنے لگے شکوہ آمیز اُن کے
ملاپ اُن سے گویا ھوا چاھتا ھے
وفا شرط الفت ھے لیکن کہانتک
دل اپنا بھی تجھ سا ھؤا چاھتا ھے

جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لے گا اگر کل نہ لیا یاد رہے

شوق بڑھتا گیا جوں جوں رکے اس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے

یاد آؤ گے بہت لطف سمجھ کر کیجے
اس بھلائی کا ہے انجام برا یاد رہے

چارہ گر! کار باندازۂ تدبیر نہیں
کیجئو ہمت اگر وقت دعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں حالی نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائیں گے مزا یاد رہے

مشہور و مقبول غزل ہے اور حالی کے خاص انداز میں ہے - ہر شعر سمجھنے اور مزہ لینے کا ہے -

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے
آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے

کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

بھولے رہے تصور مژگاں میں چند روز
دیکھا تو دل کو ہم ہدف تیر کر چکے

دل لے کے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ
گویا کہ ایک جہان کو تسخیر کر چکے

نہایت عمدہ مطلع ہے - بقیہ اشعار بھی ایسے ہیں کہ ہر شعر دعوت فکر دے رہا ہے - چوتھا شعر خاص طور پر قابل توجہ ہے -

بہت لگتا ہے دل صحبت میں اسکی
وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہے

بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات
مگر ہر بات میں ایک سادہ پن ہے

حسن اپنی جگہ خود ایک انجمن ہے "بہت" کا لفظ نہایت بلیغ ہے - دوسرے شعر کی کیا تعریف ہو - داغ کا شعر یاد آیا :-

بھر دی ہیں کیا ادائیں اس شوخ سیم تن میں
اک ٹیڑھ سادگی میں ایک سیدھ بانکپن میں

بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول
جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے

انسان کی ماہیت ، انسان ہی کا بجائے خود کل کائنات ہونا کس خوبصورتی سے مندرجہ بالا شعر میں یہ بات کہی ہے۔

دھوم تڈی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح بھی چھیڑ ہے لڑائی کی

اچھے اشعار ہیں۔

کر دیا خوگر جفا تو نے
خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

دور پہنچی تھی اپنی آزادی
پر خدا جانے کیا کیا تو نے

ایک عالم کو خوش کیا اے رشک
ہم کو کس سے خفا کیا تو نے

رہرو تشنہ لب نہ گھبرانا
اب لیا چشمۂ بقا تو نے

ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ
کیا کیا چشم آشنا تو نے

غزل کی غزل نہایت اچھی ہے اور مطلع تو سینے میں دل کو خاموش طریقے سے ملتا جا رہا ہے۔

ان غزلوں کو پڑھ کر ہم پر کیا اثر پڑتا ہے؟ جب ۱۸۵۷ ء کا غدر ہؤا اس وقت حالی کی عمر بیس برس کی تھی - ایک انحطاط پذیر اور تیزی سے بربادیوں کی آندھی میں اکھڑ جانے والی اور اڑ جانے والی مغل سلطنت اور جاگیر دارانہ نظام کی فضا میں حالی نے آنکھیں کھولی تھیں - نوجوانی کے حساس زمانے میں حالی نے یہ کایا پلٹ دیکھی تھی اور ان کے رہبر ملت سرسید نے بھی - جب ہندوستان نے ذرا سنبھالا لیا تو سرسید و حالی اور اس گروپ کے دیگر افراد کو از سر نو قوم کی فکر ہوئی - اُجڑی ہوئی دنیا پھر سے بسائیں تو کیونکر بسائیں - یہ لوگ چاہتے کیا تھے - اسلامی حکومت تو اب واپس آنے والی چیز نہ تھی - شاہی خاندان قتل و برباد ہو چکا تھا - پھر یہ لوگ کہاں پناہ لیں - انگریزی حکومت کی نئی دنیا میں پرانی دنیا کے یہ ماتم دار کیا کریں - جاگیر دارانہ نظام کے بچے کھچے آثار بھی باقی تھے لیکن متوسط طبقے کے لاکھوں مسلمان خاندانوں کا گذارہ اب جاگیروں سے نہیں ہو سکتا تھا - چنانچہ سرسید نے قومی تحریک شروع کی - انگریزی حکومت کو مسلمانوں کی وفا داری کا یقین دلایا - پھر مسلمانوں کے عقائد اور رسوم میں اصلاحوں کی طرف مائل ہوئے - یہ کوششیں آج بالکل سطحی چیزیں معلوم ہوتی ہیں لیکن اس وقت بہت اہم معلوم ہوتی تھیں اور مریض قوم نے انہیں نسخۂ کیمیا سمجھا - پھر کچھ غرور ماضی ، اس سے زیادہ ماتم ماضی کا سہارا مسلمانوں کو دیا - اب کیا کرو؟ یہ کرو کہ انگریزی پڑھو اور ملازمت کرو - کم انگریزی پڑھو ، زیادہ انگریزی پڑھو ، چھوٹی ملازمت کرو ، بڑی ملازمت کرو - اس کے بعد؟

ع ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

یہی تھی علیگڈھ تحریک اور یہی تھا علی گڈھ تحریک کا لے دے کے کل سرمایہ - علی گڈھ کالج قائم ہؤا اور علیگڈھ کالج کو ہندوستان بھر کے کئی کروڑ مسلمانوں کی اُمید مستقبل کا مکہ سمجھا جانے لگا - قوم اور کالج کے لئے بقول اکبر ع

"مجھ سے چندہ لیجئے مجھ کو مسلماں کیجئے"

اسی جذبے کو لے کر سرسید اور اُن کے نقیب حالی اٹھے اور آگے بڑھے - یہی جذبہ ان کی تحریک اصلاح کی روح و رواں تھا - ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے - اس سے اتنا ہو گا کہ نئی دنیا میں ہمیں ایک ٹھکانا تو مل جائے گا - ابھی علیگڈھ تحریک کا بھرم قائم تھا - ابھی تہائی صدی بعد اکبر الہ آبادی اس تمام تحریک کا فیضان ان الفاظ میں بتانے والے تھے :—

بی - اے - ہوئے ، نوکر ہوئے ، پنشن ملی اور مر گئے

اور اب تو بی - اے - ہونے کے بعد یہ صورت بھی نہ رہی کہ ''نوکر ہوئے پنشن ملی'' مرنا تو خیر لازمی ہے -

اس وقت اگر ان سے کوئی کہتا کہ سو فیصدی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ ہونا خوش حال ہونا ، دولت و ثروت میں برابر ہونا ، مشقت پیشوں کے نمائندوں کی حکومت ہونا قومی تحریک کا مقصد ہونا چاہیئے تو اُن کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی ان کی قومی تحریک کا نتیجہ تو پانچ سات فیصدی مسلمانوں یعنی صرف متوسط طبقہ کے مسلمانوں کی حالت سدھارنا تھا - غدر کے بعد ھی ھندوستان کیا دنیا کے کسی حصے میں اشتراکی تہذیب کا تصور ذرا قبل از وقت تھا - متوسط طبقے سے آگے اس وقت تک بلکہ نصف صدی بعد تک بیدار مغزوں کے بھی خیالات نہیں جا سکتے تھے - اقبال تک کے لئے جب یہ تصور غیر مانوس تھا تو ہم حالی کو اس نقص یا کمی کے لئے کیسے الزام دے سکتے ھیں - ۱۸۵۷ ء کیا ۱۹۱۸ ء کی دنیا بھی ۱۹۴۳ ء کی دنیا نہیں تھی - مگر اتنا تو ہؤا کہ اجتماعی زندگی کا تصور خواہ وہ اجتماعی زندگی متوسط طبقے کی ھی زندگی ھو شعور میں کار فرما ھونے لگا - غالب ، ذوق ، مومن ، شیفتہ ، داغ و امیر ، آسی غازی پوری ، شاد عظیم آبادی یا اس زمانہ کے کسی اور غزل گو کی غزلوں میں اجتماعی زندگی کا یہ محدود تصور بھی نہیں ملتا - اردو ادب کی تاریخ میں حالی پہلا شخص ھے جس نے غزل کو سماجی اور اجتماعی زندگی سے متعلق مسائل و خیالات کا آلہ اظہار بنایا - دربار اور درباری ماحول ، محض انفرادی زندگی و جذبات ، جاگیر دارانہ نظام کی فضا و نفسیات کو حالی کی غزل الوداع کہہ رہی ھے - حالی ھندوستان اور اردو ادب کی تاریخ میں ایک درمیانی اور عبوری دور کا شاعر ھے -

نیا جگ آئے یا نہ آئے پرانا جگ بیت چکا تب حالی نے اپنی غزل گوئی شروع کی :—

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزم شعر میں
باری تب ان کی آئی کہ گل ہو گئے چراغ

مگر کوئی ہرج نہیں - چراغ گل ہو گئے تو رات بھی کٹ چلی ہے - صبح کاذب کے دھند لکے میں دھیمے سروں سے حالی کی غزل نے اپنی بھیرویں چھیڑ دی - پروفیسر مجنوں نے حالی کی غزلوں کی فضا ، مزاج ، ترنم اور لب و لہجہ کا احساس کرتے ہوئے بالکل صحیح طور پر حالی کو انگریزی شاعر کالنس (Collins) سے مشابہ بتایا ہے - میرا بھی بالکل یہی خیال ہے - حالی کی نثر کے سلسلے میں اس مضمون کے پہلے حصے میں میں نے ڈرائیڈن (Dryden) کا ذکر کیا تھا - لیکن جو زمانہ ہندوستان میں حالی کا زمانہ تھا وھی زمانہ انگلستان میں میتھو آرنلڈ کا زمانہ تھا - ایک ھی وقت میں ایک قوم کا عروج اور دوسری قوم کے زوال کے باوجود ایک زمانہ ایک ھی زمانہ رھتا ھے اور خوش نصیب و بد نصیب پر یکساں اثر انداز ھوتا ھے فاتح و مفتوح سمیت - پھولے پھلے اور لہلہاتے ہوئے انگلستان کے بارے میں میتھوآرنلڈ کہتا ھے کہ ھم دو دنیاؤں کے درمیان جی رھے ھیں - ایک دنیا مر چکی ھے اور دوسری دنیا میں پیدا ھونے کی سکت نہیں - بے بسی کا یہی احساس حالی کی غزلوں میں بھی ھمیں ملتا ھے - اردو کے کسی دوسرے غزل گو میں بے بسی کا احساس اس طرح ھمیں نہیں ملتا جس طرح حالی کی غزلوں میں ملتا ھے - حالی بے بسی کا شاعر ھے ، بے بسی کا لیکن بے دلی کا نہیں - یہ احساس مفلوجیت و مجہولیت کا مرادف نہیں ھے - حالی کی بے بسی میں ایک دبی دبی سی رکی رکی سی تلملاھٹ ھے - ھاتھ پاؤں مارنے کی کچھ بے چینی ھے - اس کی گھبراھٹ میں درماندگی ، وا ماندگی ، پس ماندگی کے باوجود قدم مارنے کی کچھ ھمک ھے -

یاران تیز گام نے محمل کو جالیا
ھم محو نالۂ جرس کارواں رھے

حالی اور میتھو آرنلڈ کی متوازیت اور لحاظوں سے بھی قابل توجہ ہے جو انتقادی وضاحت (Critic Clearness) سفاکلیس کی طرح روح کی جو مغموم تابندگی و شفافی (A sad Lucidity of Soul) آرنلڈ کے یہاں ملتی ہے وہی ذرا کمزور اور دھندلی شکل میں ہمیں حالی کے یہاں بھی ملتی ہے - میر اور میر کے ہم نوا دوسرے شاعروں کو جن معنوں میں ہم درد و الم کا شاعر کہتے ہیں اس سے مختلف معنوں میں ہم حالی کو ہندوستان کی اداسی کا شاعر کہہ سکتے ہیں - حالی کی غزلوں میں اداسی کی فضا انفرادی یا عشقیہ ناکامی کے ماتم کی فضا نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی اداسی کی فضا ہے - دونوں اداسیوں میں وہی فرق ہے جو غم عشق و غم روزگار میں ہے - حالی کے ہاتھوں اردو غزل غم دو راں کی منزلوں میں قدم رکھ رہی ہے - آرنلڈ اور حالی کی یہ مشابہت بھی کم قابل توجہ نہیں کہ دونوں اپنے اپنے ملک کے ادب میں نئی وسعتیں پیدا کرنا چاہتے تھے - آرنلڈ پورے یورپ کے کلچر سے انگریزی ادب کو ہم آہنگ کرنا چاہتا تھا - حالی بھی کہتے ہیں - ''حالی اب آؤ پیروئی مغربی کریں'' حالی اور آرنلڈ دونوں شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ضخیم تنقیدیں لکھتے ہیں - ادب و شاعری کے اصول مرتب کرتے ہیں - یہ ظاہر ہے کہ آرنلڈ کا کلچر حالی سے بہت وسیع ہے اور اس کی فکر بھی بلیغ ہے - آرنلڈ کی قوت اظہار بھی حالی سے بہت زیادہ ہے لیکن ہم حالی کی غزلوں اور نظموں پر کھلی ہوئی آنکھ ڈالیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ اپنے ہم عصر اردو شاعروں میں حالی قوت اظہار و صلاحیت اظہار مختلف موضوعات و مسائل پر سب سے آگے بڑھی ہوئی ہے - امیر و داغ اپنے استادوں کا نوحہ یا چپ کی داد لکھتے ، قوم کی تاریخ کا مسدس لکھتے حب وطن بر کھارت یا مناجات بیوہ اور حالی کی کئی زمینوں میں غزلیں لکھتے تو شاید ہی عہدہ برا ہو سکتے - آرنلڈ کی شاعری بھی حسین اور خوشگوار فریبوں یا دھوکوں (Illusions) سے معرا ہے اور حالی کی شاعری بھی ٹھیٹھ عقلیت و واقعیت کی شاعری ہے - دونوں کو رومانیت سے وحشت اور کلاسکیت سے ہم آہنگی ہے - دونوں کی شاعری ہماری سوجھ بوجھ کو اکساتی اور جذبات کو چونکاتی ہے اور دونوں کی شاعری سے متاثر ہوتے ہوئے بھی ہم ان میں کسی چیز کی کمی سی محسوس کرتے ہیں - حالی کی غزلوں میں جس کمی کو ہم محسوس کرتے ہیں اس کا پتہ دینے کی کوشش میں آگے چل کر کروں گا -

ہاں تو حالی نے غزل میں ہمیں سچ بولنا سکھایا ، عشقیہ غزلوں میں اور اخلاقی غزلوں میں بھی - حالی سے پہلے اور بعد آردو کا کوئی مشہور غزل گو ایسا نہیں جس نے دانستہ غزل کو دو ٹوک باتیں کہنے کا ، دو اور دو چار کہنے کا آلہ اور فن بنایا ہو - ایسا کرتے ہوئے بھی حالی اپنی واعظانہ و ناصحانہ غزل کو خشک و بے کیف ہونے سے بچا لے جاتے ہیں - حالی کی ان غزلوں کی چٹیلی نثریت ان کی رکی رکی سی تلملاہٹ ، ان کا حساس خلوص ، ہلکی سی طنز و تلخی لئے ہوئے ان کا تیور ، زندگی اور واقعات زندگی سے ان کا قرب ، ان میں اصلیت کا عنصر ، ان کا اعتدال و توازن ، عقل کے ناخن سے شعور انسانی کو چھیڑنا ، کبھی کبھی ان میں ایک اکھڑ پن اور کھردرا پن ، عموماً ان کا نرم اور دبا دبا ترنم یعنی ان میں تحت النغمگی کی صفت ، ان کی متین و مہذب بذلہ سنجی ، ان کی روک تھام اور لئے دیئے ہوئے انداز میں کہنے کی بات کہہ گذرنا ، عشق کا پاکیزہ معیار ، جذبات کا انضباط ، حسین سے حسین جھوٹ سے ان کا احتراز ، رال ٹپکانے والی محبت بے اختیارانہ طور پر لہلوٹ ہو جانے سے غیر خود دارانہ للچاہٹ آلودگی اور گلگلے پن سے اس جنسیت زدگی سے جسے شدید شعریت رچ اور سنوار ضرور دیتی ہے لیکن جو رہتی ہے پھر بھی فساد اعصاب کی حامل ، اس چھچھورے پن سے جسے فن کارانہ شوخی و طراری سے دلکش بنانے کی کوشش کی جاتی ہے ان کا پاک و صاف ہونا یہ حالی کے تغزل کے وہ صفات ہیں جو آسے چوٹی کے متغزلین میں جگہ دیں یا نہ دیں لیکن جو حالی کو ایسا غزل گو ضرور بنا دیتے ہیں کہ چوٹی کے غزل گو اس کی عزت کریں اور اس سے بڑے غزل گو ہوتے ہوئے بھی اس کے اشعار پر للچائیں جیسے پر تکلف اور تیز مسالہ دار کھانا کھانے والے کبھی کبھی سادہ کھانے پر للچا اٹھتے ہیں - حالی نے اردو غزل کو ایک ضمیر یا کانشنس دی - حالی نے غزل کو نئی ذمہ داریوں سے روشناس کیا - حالی نے غزل کو احساس عمل دیا - حالی کی غزلوں میں ہمیں نئی فہرست مضامین ملتی ہے ، روایتی تمثیلوں کے نئے پہلو نمایاں ہوتے ہیں - غزل کی صوتیات میں وطن کی زندگی کی گونج سنائی دیتی ہے - غزل میں پہلے پہل ایک سماجی مافیہ (Social Content) داخل ہوتا ہے - پر خلوص اور حساس ہوتے ہوئے بھی حالی کی غزلیں اس خود بینی و خود پرستی (Egotisro)

سے بالکل پاک ہیں جو رومانی تغزل یا جذباتی دبستان شاعری پرچھائی ہوئی ہے اور جو دلکش ہوتے ہوئے بھی سمیت کے اثر سے محفوظ نہیں رہتی - حالی نے غزل میں افادیت کے عناصر شامل کئے - حالی نے غزل خوانی کو حدی خوانی بنایا - وہ تخاص لیا جو اس وقت کسی اور کو سوجھ ھی نہیں سکتا تھا اور جسے اسم بامسمیٰ بنا دیا -

حالی کی تقلید اپنی غزلوں میں مولوی اسمٰعیل نے بھی کی لیکن مولوی اسمٰعیل کی طبیعت کو غزل سے مناسبت نہ تھی - غزل میں حالی کے تتبع اور تقلید کا پورا پورا حق اگر ادا ھو سکا تو حالی کے شاگرد آزاد انصاری سے اور میرے والد مرحوم حضرت عبرت گورکھپوری سے - بیان و یزدانی میرٹھی ، نادر کاکوروی ، تلوک چند محروم اور کچھ اور لوگوں نے بھی اپنی نظموں میں تو حالی سے کامیاب استفادہ کیا لیکن غزلوں میں ان حضرات سے حالی کا رنگ نبھ نہ سکا - کہیں کہیں اکبر الہ آبادی کی غزلیں حالی کی یاد دلا دیتی ھیں - غیر مردف غزلوں کو حالی نے اپنے دیوان میں رواج دیا - بہت دنوں بعد اقبال نے بال جبریل اور ضرب کلیم میں غیر مردف غزلوں کے نئے امکانات پیش کئے صرف طریق کار یا تکنیک کے لحاظ سے نہیں بلکہ مقصد و معنی کے لحاظ سے بھی اقبال کی ان غزلوں کا سلسلہ حالی کی غیر مردف غزلوں تک پہونچتا ہے اگرچہ حالی کے بعد کی غزل گوئی یعنی عزیز ، حسرت ، اصغر ، فانی ، یگانہ اور جگر کی غزل گوئی حالی سے بہت مختلف ہے لیکن اصلیت اور سچائی ، خلوص جذبات و شرافت جذبات کا جو عنصر ہم بیسویں صدی کی غزل میں پاتے ھیں کیا حالی کا اس میں کوئی حصہ نہیں ؟

حالی کا موازنہ کبھی کبھی نظیر اکبر آبادی سے کیا جاتا ہے - نظیر کے بعد (مثنوی ، قطعہ ، قصیدہ اور مرثیہ کو اگر ہم نظر انداز کر دیں) مسلسل اردو نظم ایک صدی تک سوئی رہی اور پھر حالی کے جگانے سے جاگی - حالی اور نظیر دونوں سچائی ، واقعیت اور عقلیت کے شاعر ھیں - دونوں کی شاعری میں ایک ٹھوس پن ہے ، کچھ لوگ کہہ دیں گے کہ دونوں کی شاعری میں ایک ٹھس پن بھی ہے لیکن جس شیفتہ نے نظیر کی زبان کو ناقابل اعتبار بتایا وہ حالی کے ادبی رفیق تھے اور حالی کی زبان کو سند جانتے تھے - ادب کی تاریخ میں بھی ایسا

بہت ہوتا ہے کہ مدعی سست ، گواہ چست - پرستاران غالب و مومن ، ذوق کو جس طرح ہیچ سمجھتے و بتاتے ہیں کیا غالب و مومن بھی ذوق کو اسی طرح خاطر میں نہیں لاتے تھے ؟ اور تو اور داغ کے شاگرد اپنے آستاد کے آستاد ذوق کا ذکر بسا اوقات ایک مضحکہ آمیز یا سرپرستانہ لہجے میں کرتے ہیں اور ذوق کو داغ کے لئے محض ایک تبرک سمجھتے ہیں - امیر اور داغ کے ہزار ہا شاگرد اور معتقد حالی کو سرے سے شاعر ہی نہیں مانتے - یہ حضرات یہ نہیں سوچتے کہ غالب ، مومن ، شیفتہ ، داغ و مجروح کا مقتدر ہم نشین ایسا گیا گذرا َشاعر نہ ہوگا جیسا اپنی کم نظری سے مغلوب ہو کر انہوں نے اسے سمجھ لیا ہے - خود داغ و امیر حالی کے رنگ کو اپنے رنگ سے بالکل مختلف پاتے ہونے بھی حالی کو نظر انداز نہیں کرتے تھے اور نہیں کر سکتے تھے - حالی کے زمانے میں قدامت پرست سے قدامت پرست چوٹی کے شاعر و ادیب حالی کو کنکھیوں سے دیکھ ضرور لیتے تھے - کوئی ناقابل توجہ شاعر اپنے لئے یہ نہیں کہہ سکتا -

اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالی یہ نچوڑ
شاعر اس ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

حالی پر اعتراض کرنا حالی کا لوہا ماننا ہے - ہاں تو یہ بات تھی حالی اور نظیر کی - کئی باتوں میں مشابہت کے باوجود حالی اور نظیر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں - دونوں شاعری اور زندگی کو یکساں طور پر ، ایک ہی نظریا نظریئے یا زاویے سے نہیں دیکھتے - نظیر سچے معنوں میں جمہور اور عوام کا شاعر ہے - حالی متوسط طبقے یا جاگیریں کھو بیٹھنے والے طبقہ یا بگڑے ہوئے رئیسوں یا حسب نسب والوں کے شاعر ہیں - دونوں کی وطنیت اور ملیت میں فرق ہے - قوم کے جو معنی نظیر کے یہاں ہیں وہ معنی حالی کے یہاں نہیں ہیں حال ہی میں نظیر کی بہت سی غزلیں ملی ہیں - اگرچہ ان غزلوں میں کسی سماجی مقصد کی ترجمانی نہیں ہے لیکن ان غزلوں میں وہ زندگی ہے جس کی اسپرٹ حالی کی غزلوں کی اسپرٹ سے وسیع ہے - نظیر کی شخصیت حالی سے زیادہ بھرپور ہے - نظیر حالی سے بڑا شاعر تھا - لیکن حالی و نظیر دونوں کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بہ حیثیت شاعر وہی کہا جو بہ حیثیت انسان محسوس کیا - نظیر کی

عظمت کا احساس کرتے ہوئے بھی حالی کی جو قدر و محبت میرے دل میں ہے وہ کم نہیں ہوتی ۔ آخر خلوص بھی کوئی چیز ہے ۔ حالی نہ معمولی ادیب تھا ، نہ معمولی نظم نگار ، نہ معمولی غزل گو ۔ قوم کے لئے حالی کے دل میں درد و خلوص تھا ۔ کوئی نقاد ادب ہو کر کیا کسی کا گھر لے گا ؟

حالی کا دیوان غزلیات بہت مختصر ہے ۔ ان کے اس مختصر دیوان کو دیکھ کر خواجہ میر درد کے دیوان کی یاد آتی ہے ۔ اعتدال اختصار ، لئے دیئے پن دونوں کے یہاں ہیں ۔ لیکن درد کے یہاں انسان اور دیوتا کا ایسا امتزاج ملتا ہے ۔ درد کے یہاں انسانیت میں روحانیت کی ایسی جھلک ملتی ہے جو حالی کے یہاں مفقود ہے ۔ حالی کا رکا رکا پن درد کا رکا تھما پن نہیں ہے ۔ حالی کا پاکیزہ اور پاکیزہ سے زیادہ مہذب معیار عشق نہ اس معیاری نیکی کا پتہ دیتا ہے ، نہ اس سپردگی و خلوص کا ، نہ اس طہارت قلب کا جس کا آئینہ‌دار درد کا کلام ہے ۔ حالی کی شخصیت و شعور کی ھیر یا بطن (Core) میں کوئی سخت حصہ یا عنصر تھا جو حل ہونے سے رہ گیا تھا اور اسی امر میں ہم اس کمی ، اس عدم تکمیل ، اس نا آسودگی کا راز پا سکتے ہیں ۔ جس کا احساس حالی کی شاعری میں ہم کو ہوتا ہے ۔

میں نے ابھی کہا تھا کہ حالی نے غزل کو احساس عمل دیا ۔ لیکن عملیت زدگی خواہ اس میں خلوص کی پٹ بھی دے دی جائے رہتی ہے کچھ چھوٹی اور سستی چیز ۔ حالی کی غزلوں میں عمل کی جو تحریک و ترغیب ہمیں ملتی ہے واقعیت و عقلیت و اصلیت کا جو عنصر ہمیں ملتا ہے ان میں اس چیز کی کمی ہے جس کا ذکر ابھی میں کر چکا ہوں یعنی کسی کشف یا روحانیت یا رویا (Vision) کی کمی ۔ اسی سبب سے ان کے پیام و آواز میں ایک سکڑن آ جاتی ہے ۔ حالی عمل میں وہ جمال و جلال نہیں پیدا کر سکتے ، بیداری میں ، خواب و محویت کے وہ اجزا شامل نہیں کر سکتے ۔ عمل کی عظمت کے عناصر نہیں ملا سکتے جس کے لئے انسان کی روح پیاسی رہتی ہے ۔ واقعیت و اصلیت برحق لیکن بغیر اس عینئیت (Idealisim) کے واقعیت و اصلیت بھی اٹک کے رہ جاتی ہے ۔ اٹکاؤ کا یہی احساس حالی کے کلام میں ہمیں ملتا ہے خاص کر ان کی غزلوں میں شاعر کا پاؤں ضرور

زمین پر جما رہنا چاہیے لیکن انگلیوں سے کبھی کبھی اسے ستاروں کو بھی چھیڑ دینا چاہیئے۔ اعتدال کے باوجود زندگی و شاعری دونوں میں ایک انتہا پسندی کی بھی ضرورت ہے۔ لامحدود کا احساس حالی کو نہ تھا۔ عمل کے علمبردار ہوتے ہوئے تقدیر انسانی کا کوئی بلند و مؤثر تخیئل یا احساس حالی کے پاس نہ تھا نہ سرسید احمد کے پاس تھا۔ گویا حالی کا لاشعور ان کی اس کمی پر انہیں ملامت کر رہا ہے اور اسی سے ان کی آواز میں ایک جھجھک اور ھچکچاھٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اصلاحی شاعری عمل کو بھی بلند نہیں بنا سکتی۔ ایسی شاعری میں عمل چالاکی اور نیکی مصلحت وقت ہو کر رہ جاتی ہے۔ حالی کی پر خلوص تلملاھٹ ان کے پیام عمل کو بالکل بے کیف ہونے سے بچا ضرور لیتی ہے۔ حالی کی آواز ایک شریف دل کی آواز معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا چھوٹی آواز معلوم ہوتی ہے۔ حالی کی رکی رکی آواز میں جو دل کشی ہے، اس کی طرف کئی بار اشارہ ہو چکا ہے۔ لیکن یہ رکاؤ کچھ تو ان گتھیوں اور الجھنوں (Complexes) کی وجہ سے ہے جو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ناگزیر تھیں اور چونکہ حالی اپنے زمانہ کے نمائندہ ھیں اس لئے ان کے شعور میں یہ گرھیں پڑ گئی تھیں اور کچھ حالی کی شخصیت کی اس محتاط سنجیدگی کی وجہ سے بھی ہے اس شاعرانہ لا آبالی پن اور بیباکی (Lyric abandon) کے فقدان کی وجہ سے ہے جو کچھ نفسیاتی گتھیوں کا پتہ دیتا ہے۔ حالی کی شخصیت، شعور و وجدان کی یہی خصوصیتیں حالی کی عشقیہ غزلوں اور عشقیہ اشعار میں بھی کارگر ھیں۔ ان کے عشقیہ اشعار میں ایک دلکش چٹیلا پن، ایک حساس متانت، ایک غنائی عنصر ضرور ہے لیکن حالی کے یہاں ان عناصر کا فقدان ہے جو عمل یا عشق کی شاعری کو ماورائیت و عظمت دے سکیں۔ کھل کے نہ بول سکنا اس امر کی چغلی کھاتا ہے کہ دل میں چور ہے۔ میں نے مصحفی کے اعتدال و توازن جذبات کا ذکر مصحفی والے مضمون میں کیا ہے۔ مصحفی کے اعتدال کو میں نے ایک اثباتی صفت بتایا ہے۔ لیکن مصحفی کے یہاں جو ٹھہراؤ اور سکون ہے (اس کی بے چینی میں بھی) وہ مصحفی کے اعتدال کو حالی کی احتیاط سے ذرا الگ کر دیتی ہے۔ مصحفی کا اعتدال اس امر کی غمازی نہیں کرتا کہ شاعر کے دل میں چور ہے۔ مصحفی کا اعتدال کھلا کھلا ہے۔ حالی کی احتیاط رکی رکی ہے حالی اپنے عشقیہ جذبات سے خود

کچھ ڈرے ڈرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں - ع

کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

یہی سبب ہے کہ متعدد خوبیوں اور لذتوں کے حامل ہوتے ہوئے بھی حالی کے عشقیہ اشعار میر ، غالب ، آتش ، مومن بلکہ داغ و امیر کے بھی عشقیہ اشعار سے کچھ دب سے جاتے ہیں۔ شدتِ خواہش نہ ہونا تو خیر ایک بات ہے (حالانکہ کیا یہ بھی ایک طرح کی "نامردی" نہیں ہے ؟) لیکن شدت تخئیل و شدت تصور نہ ہونا ، وہ سپردگی وہ گم شدگی نہ ہونا وہ ماورائی معصومیت نہ ہونا ایک ایسی کمی ہے جس کے سبب سے عشقیہ شاعری میں خواہ اور بہت سے محاسن جمع ہو جائیں لیکن عظمت نہیں آ سکتی - ان کے بغیر آواز میں وہ موج سامانی ، وہ آبھار ، وہ وسعت و بلندی ، وہ گہرائی و گیرائی نہیں پیدا ہونے پاتی جسے ہم بڑی شاعری میں پاتے ہیں - سب سے بڑی شاعری وہ ہے جس میں ناقابل برداشت شدت احساس سکون کی شکل اختیار کر لے - حالی کی غزلیں پڑھتے ہوئے یہ خیال دبے پاؤں دل میں سمانے لگتا ہے کہ حالی کا دل حسن عمل یا حسن صورت پر ٹوٹ کر کیوں نہیں آتا - شاعر میں ہوش و بصیرت کی جتنی ضرورت ہے اتنی ہی جوش و سرمستی کی بھی ضرورت ہے - حالی کی شاعری میں حدود شکنی کا عمل نہیں ہے ہم جو کچھ بھی کہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ انتہا اور شدت شاعری کے جزولاینفک ہیں خواہ وہ نرمی و آہستگی کے پردے میں شدت معکوس کیوں نہ ہو - واقعیت و اصلیت بھی شاعری میں پروازخیال سے ہی پروان چڑھتی ہیں اور یہی پرواز خیال حالی کے یہاں نہیں ہے حالی واقعیت کو معجزہ نہیں بنا پاتے - اسی سے ان کی شاعری بھی ساحری نہیں ہونے پاتی - احتیاط حالی کی خوبی بھی ہے اور کمزوری بھی - لیکن یہ احتیاط بالکل ناقابل قبول اس لئے نہیں ہے کہ وہ حساس ہے اور حالی کی نفسیات کی ایک کشمکش کا پتہ دیتی ہے - یہی وہ اسباب ہیں جن سے حالی کی غزل میں ہمیں کسی چیز کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور جو حالی کی شاعری کو عظمت کے قریب سے کترا کے نکال لے جاتے ہیں -

لیکن جب ہماری روحیں تھکی ماندی ہوتی ہیں ، جب ہم جانگداز شاعری بڑے بول والی شاعری یا اپنی رنگینیوں اور جلوہ سامانیوں سے

چکاچوند پیدا کر دینے والی شاعری ، زلزلہ سامان شاعری ، تیز آنچ کی شاعری ، جذبات پر زور ڈالنے والی شاعری برداشت کرنے کی سکت اپنے اندر نہیں پاتے جب ہم کچھ آوبے ہوئے ہوتے ہیں اس وقت ہم دیوان حالی کو ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں اور اس کی نرم کسک ہلکی ہلکی تلملاہٹ کہیں کہیں اس کے ہجویہ لہجے ، تازگی پیدا کر دینے والی سادگی اور سچائی ، اس کا سنجیدہ ٹھٹھول ، اس کی آواز کی آہستگی ، خیالات کی آہستہ روی کچھ دیر کے لئے اچھی لگنے والی اس کی بے رنگی ، اس کی قدرے سامع خراش سامع نوازی ، اس کے دھیمے سُر - اس کی گنگناہٹ اس کی مغمومیت ، اس کی متوجہ کر دینے والی بزدلی اور جھجک ، سوز و ساز کی ٹمٹماہٹ ، اور اس کے اعتدال و توازن کا کچھ دیر کے لئے سہارا لے لیتے ہیں - یہ وہ چیزیں ہیں جو چوٹی کے غزل گو شعرا کو بھی حالی کی طرف متوجہ کر دیتی تھیں - اور جو بہت دنوں تک حالی کی غزلوں کو بھلائے جانے سے محفوظ رکھیں گی - آمین

داغ

میرا لڑکپن ہی رہا ہو گا ۔ لیکن نہ جانے کیوں اس وقت بھی داغ کا کلام پڑھ کر بلکہ داغ کا نام سن کر مجھے غصہ آ جاتا تھا اور شاعر کے متعلق غصہ ، توہین اور نفرت کے جذبات میرے اندر اُبال کھانے لگتے تھے ۔ اُردو کے کسی بھی اور شاعر کے کلام کا یہ ردعمل مجھ پر نہیں ہوتا تھا ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو خوبیاں داغ کے کلام میں ہیں وہ دوسروں کو نظر آئیں اور مجھے نظر نہ آئیں ۔ ان خوبیوں کا احساس مجھے اُس وقت بھی تھا اور رفتہ رفتہ احساس بڑھتا گیا لیکن غصہ اور نفرت کا جذبہ اس بڑھتے ہوئے احساس سے نہ کم ہؤا نہ کمزور پڑا ۔۔ میں بیک وقت داغ کو صفِ اول کا شاعر مانتا رہا ، ان کی فسطنت (genius) کا قائل رہا اور کلام داغ کے متعلق اپنے اندر انتہائی ناپسندیدگی کا جذبہ پاتا رہا ۔

پنتالیس برس سے برابر میرا یہی حال رہا ہے ۔ کلام داغ کے محاسن مجھ سے خراج تحسین بھی حاصل کرتے رہے اور مجھے غصہ بھی دلاتے رہے ۔ جھلاّنے کا لفظ میری حالت کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا بلکہ ہماری طرف کا ایک رائج لفظ زیادہ صحیح مصوری میری حالت کی کرتا ہے ۔ یعنی میں کلام داغ پڑھ کر کچکچا اُٹھتا تھا ۔ اب جبکہ ”نگار“ داغ نمبر نکال رہا ہے تو مجھے اپنے مرکزی رد عمل کو کچھ واضح کرنا پڑے گا ۔ بات کیا ہے ؟ غالب کے مر جانے کے بعد اُردو شاعری بہ استثناء ایک دو شاعروں کے معشوق کی عزت کرنا بھول گئی اور معشوق سے بے گانگی ۔ نرمی ۔ خلوص اور جذباتی قربت محسوس کرنا بھول گئی اور نصف صدی سے زیادہ تر بھولی رہی ۔ تہذیب محبت مٹ چلی تھی ۔ غالب کے بعد تہذیب محبت کا چراغ حالی ، شیفتہ ، شاد عظیم آبادی اور آسی غازی‌پوری کے کلام میں جھلملاتا رہا ۔ یوں تو پرستاری اور ہم آہنگی ، نرمی اور انسانیت کا

جو جذبہ میر کے یہاں ملتا ہے وہ جذبہ اس شکل میں تو غالب کے یہاں بھی نہیں ملتا—لیکن غالب کے یہاں کچھ دوسری اتنی رچی ہوئی خوبیاں ملتی ہیں کہ یہ کمی پوری ہو جاتی ہے۔ غالب کے بعد جن شاعروں کا نام میں نے گنوایا ہے انہیں چھوڑ کر دوسرے شعراء کے کلام سچے اور پرخلوص جذبات محبت سے عموماً محروم ہے۔ پھر بھی ان شاعروں کے یہاں ایسے عشقیہ اشعار نہیں ہیں یا عموماً نہیں ہیں جنہیں سن کر ایک شریف آدمی کے دل میں آگ سی لگ جائے—غالب کے بعد اس طرح غصہ دلانے والا عشقیہ کلام صرف داغ کا ہے۔

دلی کے اخلاقی انحطاط کی انتہا لال قلعہ کی زندگی اور ہزارہا مسلمان جاگیر داروں کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ تہذیب کا ظاہری پہلو اس کے تمام ٹیم ٹام تو ان تمام جگہوں اور لوگوں میں ملتے ہیں۔ لیکن تہذیب کی روح اس زندگی میں مردہ ہو چکی ہے ایک کڑا پن اور خشونت نے تہذیب کی روحانی برکتوں پر غلبہ پا لیا ہے۔ دل سینوں میں ریجھنا اور پگھلنا بھول چکے ہیں۔ اس انحطاطی دور میں دلی کی تہذیب کا دل قصاب کا دل بن گیا ہے—جہاں تک شاعری کا تعلق ہے اب معشوق سے پریم اور محبت مخصوص کرنے اور برتنے کے بدلے اب اس کی چٹکیاں لی جاتی ہیں۔ بجائے اداس یا غمگین ہونے کے اب ایک بے حیا کھسیاہٹ کا اظہار کیا جاتا ہے۔ دل کے معاملے اب کھلی معرکہ آرائی کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ محبت کا جذبہ ایک انتقامی جذبہ بن جاتا ہے۔ اب ذہنی طور پر بجائے معشوق کو گلے لگانے کے جذبہ کے اس پر چڑھ بیٹھنے کا جذبہ کار فرما ہے۔ نرم بولی یا شائستہ لہجہ اب چرب زبانی میں بدل جاتا ہے اور ٹھیٹھ کر کے اسے بیان کیجئے تو کہنا پڑے گا کہ محبت کے دل اور زبان پر چربی چڑھ جاتی ہے۔ دونوں کی لچک مٹ کر ایک خشک کڑے پن میں یا اکڑ پن میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دل اور زبان دونوں ہڈی کے بن گئے ہیں یا نہایت سخت و کرخت گوشت کے۔ اب شاعری اپنی گھلاوٹ سے بجائے نرم بول بولنے کے پتھر مارتی ہے۔ داغ کے کلام میں یہ تمام خرابیاں اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہیں۔ سپردگی کا جذبہ ڈاکہ زنی کا جذبہ بن گیا ہے۔ بازاری عشق نے حسن پر ہلہ بول دیا ہے۔ ہم آہنگی، مغائرت میں بدل گئی ہے۔

لیکن اس تمام عمل میں ایک ہنگامہ آرائی کی شان ہے اور یہ شان اور آن بان ، یہ ہما ہمی جس تیور کے ساتھ داغ کے کلام میں نظر آتی ہے داغ کے پہلے یا داغ کے بعد اردو شاعری میں کہیں نظر نہیں آتی - داغ کی زبان میں فلیتے بھرے ہوئے ہیں - جو رہ رہ کر چھوٹتے چلے جاتے ہیں - دلی کی بھرپور زندگی اور لال قلعہ کی رنگ رلیاں داغ کے کلام میں کچھ اس طرح جلوہ گر ہو گئی ہیں کہ دیکھنے سننے والے دیکھتے سنتے رہ جاتے ہیں - گالی دینے کا بھی ، چیل جھپٹے مارنے کا بھی ایسا سلیقہ سب کو کہاں آتا ہے - دلی کی بولی ٹھولی اپنی پوری موجزنی کے ساتھ داغ کی غزلوں میں لہرا رہی ہے - داغ کے متعلق رائے عامہ بالکل سچائی پر تھی کہ یہ شخص زبان کا لاثانی جادوگر ہے - اردو شاعری نے داغ کے برابر کا فقرے باز نہ آج تک پیدا کیا ہے نہ آئندہ پیدا کر سکے گی - داغ کے جذبات پر نفرین بھیجتے ہوئے بھی بے اختیار منہ سے واہ واہ نکل جاتی ہے - داغ کا تغزل سرا سر واسوخت سہی لیکن اس کی بے پناہ قوت اظہار کا لوہا ماننا پڑتا ہے - مغلیہ خاندان کی تلوار کا فاتحانہ شان اور چکا چوند پیدا کرنے والی چمک دمک جب زندگی اور جذبات کی تاریک پستیوں میں اپنے جلوے دکھاتی ہے تو وہ داغ کی شاعری بن جاتی ہے -

لیکن داغ کو محض غیر شریفانہ اور عامیانہ جذبات کا جادو بیان شاعر سمجھنا پوری سچائی نہیں ہے - الفاظ ، محاوروں ، چست فقروں اور بے لاگ یا فطری بے ساختہ باتوں کا لاثانی شاعر ہونے کے علاوہ داغ کچھ اور بھی ہے - مومن کے نفسیاتی تجزیوں کی پرچھائیاں بھی داغ کے بہت سے اشعار پر پڑتی ہیں - پھر دلی کی زبان میں جو لطیف اشاریت آگئی تھی وہ بھی داغ کی غزلوں میں وہ باتیں پیدا کر دیتی ہے - جنہیں دیکھ کر کہا جاتا ہے کہ غالب بھی للچا اٹھتے تھے - دل کی چٹکیاں لینے والی بے ساختگی کی ایسی مثالیں اردو کا کوئی دوسرا شاعر آج تک پیش نہیں کر سکا - داغ کے ایسے اشعار بیک وقت سامنے کی باتیں بھی معلوم ہوتے ہیں اور جادو بھی -

بول چال کی زبان پر جیسی قدرت داغ کو تھی ویسی قدرت کسی اور شاعر کے یہاں ڈھونڈھنا سعی لا حاصل ہے - اجتماعی زندگی کا وہ حصہ جو بولی ٹھولی کی شکل میں وجود میں آتا ہے سمٹ کر داغ کی

زبان میں جذب ہو گیا تھا ۔ اس امر میں داغ ہمیں شیکسپیئر ، مولیر وغیرہ مصنفین کی یاد دلاتے ہیں ۔ لیکن افسوس داغ کی بولی کے پیچھے جو دنیائے خیال ہے وہ حسین نہیں ہے اگرچہ کبھی کبھی لیکن صرف کبھی کبھی وہ بہت حسین بھی ہے ۔

میں نے اس مضمون کے آغاز کلام میں داغ سے متعلق اپنے اس جذبے یا اس جذباتی رد عمل کا ذکر کیا ہے جس میں بیک وقت شدید جھلاہٹ اور بے اختیارانہ تحسین کی کیفیتیں میں اپنے اندر پاتا تھا اور پاتا ہوں ۔ نصف صدی کے اندر اندر گلزار داغ کا عشق یا ان کا شاعرانہ شعور عشق غور کرنے سے پرخلوص عشق معلوم ہی نہیں ہوتا بلکہ محض ایک جنسی خوش باشی اور خوش وقتی معلوم ہوتا ہے ۔ اس میں پرخلوص داخلیت نہیں ہے ، سوز و ساز نہیں ہے تہذیب اور کلچر کے عناصر اس میں سموئے ہوئے نہیں ہیں ۔ داغ کی شاعری بے پناہ سحر کارانہ فطنت کے ساتھ اس وقت کے اور خود شاعر کے بگڑے ہوئے مذاق عشق کو جادو کا آئینہ دکھاتی ہے ۔ میرے کسی دوست نے آسے چیل جھپٹا قسم کی شاعری بتایا تھا جیسے روایت کے مطابق میر نے جرأت کی شاعری کو چوما چاٹی بتایا تھا ۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ داغ ایک بگڑے ہوئے زمانہ کا سب سے بڑا بگڑا ہؤا یا نہایت اچھی طرح رچا اور بنا ہؤا بگڑا شاعر ہے لیکن آخر اسی بگڑے ہوئے زمانہ میں حالی ، تسلیم ، شاد عظیم آبادی ، آسی غازیپوری ایسی پاکیزہ عشقیہ شاعری ہمیں کیسے دے سکے ؟ جلال صدھا ایسے اشعار کیسے دے گئے جن میں سوز و ساز کی چاشنی ابتک رسمسا رہی ہے ۔ خود امیرمینائی مراۃالغیب میں اور صنمخانۂ عشق میں (جہاں بسا اوقات وہ داغ کی ناکامیاب نقالی کے مرتکب ہو گئے ہیں) ہزار ہا پاکیزہ عشقیہ اشعار ہمیں کیسے دے گئے ۔ داغ کی سب سے بڑی شاعرانہ خوش نصیبی ان کی سب سے بڑی بد نصیبی تھی ۔ ان کی کامیابی ایک مہلک خطرے کی حیثیت اختیار کر گئی تھی ۔ ان کی جادو بیانی واسوخت بن گئی ۔ داغ غزل میں جلی کٹی سنانے کے ملک الشعرا بن گئے ۔ اس سے یہ چھنٹی ہوئی شاعری اپنی تڑک بھڑک سمیت ، اپنے تمام ہاؤ بھاؤ کے باوجود اپنے تمام تیور اور تیکھے پن کے باوصف اس بہار سے محروم ہے جو خود داغ کے ان ہمعصروں کے کلام کو تری اور تازگی ، رنگ اور سگندھ بخش رہی ہے جن کے

نام ابھی میں نے گنوائے ہیں - آج داغ کا کلام ان کے معاصرین اور پیش روؤں کے کلام سے زیادہ پرانی چیز ہو گیا ہے - لیکن اگر ہم داغ کی غزلوں کو معیاری غزلیں نہ مانیں ، اگر ہم داغ پرستی کے خطروں سے اپنے مذاق کو محفوظ رکھ سکیں تو ان غزلوں کی دل فریب بلکہ مسحور کن اوباشی کا قائل ہونا پڑتا ہے - مجھے بھی اب سے چوتھائی یا تہائی صدی پہلے تک داغ کے کلام سے ایک جھلاہٹ محسوس کرنے کی ضرورت تھی - وہ ضرورت اب نہیں رہی - اب ہمیں اپنا غصہ تھوک دینا چاہیئے اور داغ کی قیامت خیز ناسنجیدگی کو کھلے دل سے خراج تحسین ادا کرنا چاہیئے - یہ شخص ہماری شاعری کی بدقسمتی ہو کر بھی ہماری شاعری کی ایک بہت بڑی خوش قسمتی ہے - ہمیں اپنی تہذیب میں مناسب موقعوں پر شرارتوں کو بھی جگہ دینا چاہیئے - داغ شرارت کے انھی موقعوں کا شاعر ہے - اس شخص نے حرمزدگی کو (genius) کا مقام عطا کر دیا ہے - داغ کی شوخی ، داغ کی شرارتیں (جب ہم داغ پر ایک بار پارہ رہ کے غصہ اتار لیتے ہیں) قابل رشک نظر آتی ہیں - ہم داغ کے تغزل پر وجد نہ کریں لیکن پھڑک ضرور آٹھتے ہیں - اس کے کوچوں سے چوٹ بھی لگتی ہے اور گدگدی بھی ہوتی ہے - اس طرح ہمارے دماغوں کو کون شاعر گدگدا سکا ہے -

داغ کے یہاں ہمیں زبان کے جیسے تیز چٹخارے ملتے ہیں جو چٹپٹی زبان کلام داغ میں چلتی ہوئی نظر آتی ہے اردو شاعری میں ہمیں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی شاید کسی زبان کی شاعری میں اس کی مثال نہیں ملے گی - پھر بھی داغ کو زبان کا سب سے بڑا شاعر نہیں مانا جا سکتا ہے - داغ جو باتیں کہنا چاہتے تھے ان باتوں کے لئے جس زبان اور جس قسم کی زبان درکار تھی داغ البتہ ایسی زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں - لیکن جو باتیں میر ، درد ، مصحفی ، آتش ، انیس یا اقبال نے کہی ہیں وہ باتیں داغ کی باتوں سے بڑی اور زیادہ خوبصورت باتیں ہیں اور آن باتوں کو داغ کی زبان ادا نہیں کر سکتی - تو پھر ان شاعروں کو زبان کا شاعر کیوں نہیں کہا گیا - صرف داغ .کو بہت سے لوگوں کے قول کے مطابق زبان کا شاعر کیوں مانا گیا ؟ وجہ صاف ہے - جب بڑے خیالات ، شریفانہ جذبات ، بڑی باتیں کامیابی سے کہہ دی جاتی ہیں تو زبان اور محض زبان پر

(خیالات کو الگ کر کے) ہماری توجہ نہیں جاتی - بلکہ شعر کی روح اور قالب ، معنی اور صورت کی پوری اکائی پر ہماری توجہ جاتی ہے - جب بات یا خیال یا جذبہ معمولی ہو اور طرز بیان سب کچھ یا قریب قریب سب کچھ ہو تو ہم ایسے شاعر کو زبان کا شاعر کہتے ہیں - زبان کا شاعر ہونا سب سے بڑا اور سب سے کامیاب شاعر ہونا نہیں ہے - ہماری زبان کا جادو اسی زبان تک محدود نہیں ہے جو داغ نے لکھی ہے - ہماری زبان کی رنگا رنگ سحر کاریاں ، اس کے لطائف و ظرائف اس کے کثیرالتعداد اسالیب سب داغ کے دواوین میں بند نہیں ہیں - میر ، غالب ، آتش ، انیس ، نظیر ، اقبال ، چکبست سبھی زبان کے بادشاہ ہیں - زبان محض زندہ دل مکالمہ ، چھیڑ چھاڑ ، چہل ، بولی ٹھولی ، حاضر جوابی ، یا پیتروں تک محدود نہیں ہے - ادبی زبان سطحی بولی ٹھولی سے شروع ہو کر لسان غیب اور الہامات تک پہنچ جاتی ہے - زبان محض علم مجلس نہیں ہے - کیا داغ پریم چند کی زبان لکھ سکتے تھے - کیا داغ کے خطوط کا مرتبہ زبان کے لحاظ سے بھی خطوط غالب کے برابر ہے - کیا داغ کی زبان داغ سے ایسے اشعار کہلا سکتی ہے :-

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
میر

کھولی تھی آنکھ خواب عدم سے ترے لئے
آخر کو جاگ جاگ کے ناچار سو گئے
درد

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
غالب

مرا پیام صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ہے بہت پیرہن سے بو تیری
آتش

گئی تھی کہہ کے کہ لاتی ہوں زلف یار کی بو
پھری تو باد صبا کا دماغ بھی نہ ملا
جلال

گور پر عبرت یہ کہتی ہے امیر
آئے تھے دنیا میں اس دن کیلئے
امیر

بزم ماتم کسی کی سونی ہے
دو قدم پر تو گھر ہے چل بیٹھو
امیر

کہا گیا ہے کہ ہنسی ایک سماجی چیز ہے آنسو تنہائی کی چیز ہے لیکن سماجی چیزوں میں تنہائی کے شدید عناصر ہوتے ہیں اور تنہائی کی چیزوں میں تمام انسانیت کو گھیر لینے والی پہنائی ہوتی ہے - محض ہنسنے ہنسانے والا فن‌کار حقیقتاً بہت تنہا انسان ہوتا ہے - ہماری دنیائے ادب میں آج داغ رونق محفل ہونے کے بجائے تنہا رہ گئے ہیں - یہی حال ریاض کا بھی ہؤا جس کے قہقہے گونج کر خاموش ہو گئے اور جن کی جگہ ہمارے دلوں میں جلیل کی تحت الغنائی شاعری نے لے لی - ہنسی میں جب تک آنسوؤں کی نمی کی چاشنی نہ ہو وہ دیر پا نہیں ہوتی - ادب طربیہ اداکاری نہیں ہے - ایسے اداکار سے ایک زمانے تک لطف اندوز ہو کر دنیا اُسے تنہا چھوڑ دیتی ہے - یہ ہے ہنسی کا المیہ -

زمانے کی ہوا بدلی نگاہ آشنا بدلی
اٹھے محفل سے سب بیگانۂ شمع سحر ہو کر
یگانہ

یہی وجہ ہے کہ آج اور آئندہ بھی ہمارے شعرا زبان ، بیان طرز ادا ، طرز احساس اور مذاق سخن میں سب سے کم استفادہ داغ سے کرینگے اور میر ، آتش ، غالب ، انیس ، اقبال اور داغ کے ان معاصرین

سے زیادہ استفادہ کریں گے جن کے کلام میں جذبات کی شبنم کی تھرتھراہٹ اور رسمساہٹ ہے - لیکن جب تک اردو زبان ہے سب کے سب داغ کی جادو بھری شاعری سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے - عید پیچھے ٹر - لیکن سال بھر میں ایک دن عید یا ہولی ضرور منائیں گے - ہم داغ کو بھولنا بھی چاہیں تو بھول نہیں سکتے -

سنئے نا - یہ اشعار ہیں یا آتش کے پرکالے ؟

وہ مزے عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی ایسے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے
آج تو داغ کو ہم لوگ ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

لذت دید دگر چشم تماشا لے گی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹا لے گی

اب وہ یہ کہہ رہے ہیں مری مان جائیے
اللہ تیری شان کے قربان جائیے

خار حسرت بیان سے نکلا   دل کا کانٹا زبان سے نکلا
سمجھو پتھر کی تم لکیر اسے   جو ہماری زبان سے نکلا

کیونکر اب اس نگہ ناز سے جینا ہوگا
زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

دلبر سے جدا ہونا یا دل کو جدا کرنا
اس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا

دوسرے مصرع کی ترکیب میں قیام حیدر آباد کا اثر پڑ گیا ہے -

کر دیا دل نے الگ صاف ہمیں الفت میں
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں بیگانے سے

کیا کہئے کس طرح سے جوانی گذر گئی
بدنام کرنے آئی تھی بدنام کر گئی

جناب شیخ ہیں ؟ آداب عرض کرتا ہوں
اندھیری رات میں چھپ کر کہاں چلے استاد

روح کس مست کی پیاسی گئی میخانے سے
مے اڑی جاتی ہے ساقی ترے پیمانے سے

لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

آنکھ میں آنکھ تو ڈالی نہیں جاتی ظالم
دل میں دل ڈال دے کسطرح سے انساں کوئی

اس بزم میں شریک تو جایا نہ جائے گا
میں جاؤں گا اگر مرا سایا نہ جائے گا

ہماری طرف اب وہ کم دیکھتے ہیں
وہ نظریں نہیں جن کو ہم دیکھتے ہیں

ضد ہر اک بات پر نہیں اچھی
دوست کی دوست مان لیتے ہیں

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

جلوہ دیکھا تری رعنائی کا
کیا کلیجا ہے تماشائی کا

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
ہم سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

زندگی عشق میں دو بھر ہے تو مر جائیں گے
اب سے وہ کام کریں گے کہ جو آساں ہو گا

مبارک خضر کو ہو عمر جاوید
یہ تھوڑی سی گذر جائے تو اچھا

تمہیں کہو کہ کہاں تھی یہ وضع یہ ترکیب
ہمارے عشق نے سانچے میں تم کو ڈھال دیا

لگ گئی چپ تجھے اے داغ کہاں کی ایسی
مجھ کو کچھ حال تو کمبخت بتا تو اپنا

آج راہی جہاں سے داغ ہؤا
خانۂ عشق بے چراغ ہؤا

بھر دی ہیں کیا ادائیں اس شوخ سیم تن میں
اک ٹیڑھ سادگی میں اک سیدھ بانکپن میں

اتنا تو بتا دے مجھے اے ناصح مشفق
دیکھا ہے کہ اس ماہ لقا کو نہیں دیکھا

معرکہ ہے آج حسن و عشق کا
دیکھئے وہ کیا کریں ہم کیا کریں

رنج دشمن بھی گوارا لیکن
تجھ کو مضطر نہیں دیکھا جاتا

بگڑ بیٹھے عبث ذکر عدو پر
سنا کیا آپ نے میں نے کہا کیا

نہ دلاسا نہ تسلی نہ تشفی نہ وفا
دوستی اسی بت بد خو سے نباھیں کیونکر

آپ کے سر کی قسم داغ کو پروا بھی نہیں
آپ کے ملنے کا ہوگا جسے ارماں ہوگا

وہ عیادت کو مری آتے ہیں لو اور سنو
آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

ہم مر گئے تو پرسش نام و نشاں ہے اب
اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

عشق بازی کو ہے سلیقہ شرط
یہ گنہ بھی ہے یہ ثواب بھی ہے

حضرت دل آپ ہیں جس دھیان میں
مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

داغ نے دیکھے ہیں ہزاروں حسیں
آپ نے کس شخص سے دعویٰ کیا

ہمیں تو شوق ہے بے پردہ تم کو دیکھیں کے
تمہیں ہے شرم تو آنکھوں پہ ھاتھ دھر لیا

تمام بزم جسے سن کے رہ گئی مشتاق
کہو وہ تذکرۂ نا تمام کس کا تھا

نگہ نکلی نہ دل کی چور زلف عنبریں نکلی
ادھر لا ھاتھ مٹھی کھول یہ چوری یہیں نکلی

غم سے کہیں نجات ملے چین پائیں ہم
دل خون میں نہائے تو گنگا نہائیں ہم

ہاتھوں سے جو بچے تری باتوں سے مر گئے
چٹکی میں تھا جو تیر وہ لب پر سخن ہؤا

یار کا پاس نزاکت دل ناشاد رہے
نالہ رکتا ہؤا تھمتی ہوئی فریاد رہے

گرے ہوتے الجھ کر آستاں سے
چلے آتے ہو گھبرائے کہاں سے

لے ہی تو آئیں گے اُسے ہمدم
میرے ہی نام سے تو آئے گا

نا روا کہیئے نا سزا کہیئے
کہیئے کہیئے مجھے برا کہیئے

کہاں تھے رات کو ہم سے ذرا نگاہ ملے
تلاش میں ہو کر جھوٹا کوئی گواہ ملے

اب کی کچھ منہ سے نکالا تو تمہیں جانو گے
داغ پھر مجھ کو نہ کہنا جو برابر نہ کہوں

اس کے ہاتھوں سے یہی ذلت و خواری ہوگی
غیر اپنی تو خبر لیں مجھے کیا کہتے ہیں

شریر آنکھ نگہ بے قرار چتون شوخ
تم اپنی شکل تو پیدا کرو حیا کے لئے

ابر رحمت ہی برستا نظر آیا زاھد
خاک اُڑتی کبھی دیکھی نہ خراباتوں میں

آتی ہے بات بات مجھے یاد بار بار
کہتا ہوں دوڑ دوڑ کے قاصد سے راہ میں

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

راہ پر اُن کو لگا لائے تو ہیں باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

دی مؤذن نے اذاں وصل کی شب پچھلے پہر
ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا

چلے جو وہ تو قیامت بپا تھی چار طرف
ٹھہر گئے تو زمانہ کو انقلاب نہ تھا

الٰہی تو نے حسینوں کو کیوں کیا پیدا
کچھ ان کی ذات سے دنیا کا انتظام نہیں
سنائی جاتی ہیں در پردہ گالیاں مجھ کو
کہوں جو میں تو کہیں ''آپ سے کلام نہیں''

سب اہل حشر جب اپنے کئے کو پائینگے
بڑا مزا ہو جو مجھ کو مرے گناہ ملیں

میری فریاد دوسرا نہ سنے
تم سنو اے بتو خدا نہ سنے

کوچہ دشمن کو وہ جنت کہیں
مٹ نہ گیا باغ ارم کی طرح

داغ کے بعد ہندوستان کی زندگی اور شاعری کی نشاۃ ثانیہ شروع ہوتی ہے قومی شعور میں ایک نئی سنجیدگی اور شائستگی آنا شروع ہوتی

ہے - آج داغ کو مرے تقریباً نصف صدی کا زمانہ گذر گیا - اس عرصہ میں اردو شاعری کہاں سے کہاں پہونچ گئی یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ عربی، فارسی لغات کا جتنا اثر اس دور کی شاعری پر نظر آتا ہے اتنا اثر پہلے کی اردو شاعری پر نظر نہیں آتا پھر بھی شاعری کی زمین کو داغ کی خوش خرامیوں نے جس طرح ہموار کر دیا تھا اس کی مٹی کو داغ نے جس طرح نرما دیا تھا، زبان کو داغ نے جس طرح ہندی کی چندی کر دیا تھا جو سلجھاؤ، صفائی، سبک روی داغ نے اردو شاعری کو عطا کی تھی وہ بھی فارسیت کے ساتھ ساتھ داغ کے بعد کی اردو شاعری کا مستقل جزو بن گئی - میر، غالب اور داغ کی زبانیں آج کی اردو شاعری کے اجزائے ترکیبی بن گئی ہیں - اردو کی کامیاب شاعری میں جو آج ہمیں سلجھاؤ نظر آتا ہے وہ بہت کچھ داغ کا رہین منت ہے - داغ نے مستقل اثر اردو زبان پر چھوڑا ہے - اس باب میں شاعری کی زبان پر داغ کا وہی احسان ہے جو انگریزی زبان پر خاص کر انگریزی نثر پر ڈرائیڈن کے کارناموں کا رہا - یوں تو ہر زبان کی شاعری کا آغاز سادہ اور بے تکلف زبان و بیان سے ہوتا ہے لیکن یہ زبان شروع میں توتلی اور ہکلی رہتی ہے - رفتہ رفتہ اس میں پیچیدگیاں اور پیچیدگیوں کے ساتھ بھاری پن پیدا ہونے لگتا ہے - بعد کو، بہت بعد کو ایک ایسا شاعر یا ادیب ہر زبان میں پیدا ہوتا ہے جو سادہ اور بے تکلف بیان کے ایسے سانچے زبان کو دے دے جو اس زبان کے خد و خال اور اس کی نوک پلک کو مستقل طور پر متعین کر دیں - اردو زبان کے حق میں یہ کام ناسخ نے کرنا چاہا تھا لیکن کامیابی داغ کے ہاتھ رہی - داغ نے اردو زبان کے خد و خال کو اس کے نکھ سکھ کو اور اس کے جسم کی لکیروں کو اس طرح ابھارا اور چمکایا کہ اب وہ آسانی سے جانی پہچانی جا سکتی ہے - ملک میں اردو اور ہندی کا مسئلہ چھڑا ہؤا ہے لیکن ہندی والے بھی رہ رہ کر یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اردو زبان میں جو بے ساختگی ہے جس طرح اردو سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے اگر یہ صفت ہندی میں نہ آئی تو ہندی کا مستقبل تاریک ہے — تو کیا یہ صفت جس حد تک جس خوبی سے جس کامیابی سے داغ نے اردو زبان کو دی اس طرح کسی اور نے یہ صفت اور صلاحیت اردو زبان کو دی ؟

ریاض

حضرت ریاض کے کلام پر تبصرہ کرنا دلچسپ مگر غور طلب مسئلہ ہے ۔ آجکل اردو شاعری کی دنیا وسیع ہو گئی ہے ۔ لیکن ریاض اس سے بالکل الگ ہیں ۔ عام شعرا اپنے اوپر کیفیتیں طاری کرتے ہیں ۔ لیکن ریاض کی شخصیت کل کیفیات پر حاوی ہے ۔ وہ جذبات فطرت کے ساتھ کھیلتے ہیں ۔ ان کی شخصیت شاعری کے رنگ محل میں اٹھکھیلیاں کرتی رہتی ہے ۔ وہ حسن اور عشق کے معرکے میں نہایت آزادی سے دل کو سینہ سپر کر دیتے ہیں اور جہاں چوٹ کھا جاتے ہیں ۔ وہاں ایسی چٹیلی مسکراہٹ سے اس کا جواب دیتے ہیں کہ جیت انہی کے ہاتھ رہتی ہے ۔

ریاض کے پہلے جرأت ، انشا اور داغ نے شوخی و شرارت کی مصوری اور حسن و عشق کی معاملہ بندی میں کمال دکھایا ہے لیکن ریاض کے یہاں یہ رنگ کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے ۔ اول الذکر شعرا کی معاملہ بندی میں غالب عنصر واقعیت اور اصلیت ہے ۔ ریاض کے یہاں ایک نٹ کھٹ تخیل ہے ۔ ریاض کی معاملہ بندی کبھی حقیقی اور فطری ہوتی ہے اور کبھی محض خیالی ۔ ریاض کی شاعری تخیئل کے طربیہ کی شوخ مثال ہے اور لطف یہ کہ اسی کے ساتھ ہی وہ تصوف کے لطیف سے لطیف رموز اور فلسفۂ حیات کے عمیق سے عمیق اور مشکل سے مشکل مسائل باتوں باتوں میں بیان کر جاتے ہیں ۔ ریاض کی چھیڑ اور معنی خیز ظرافت اس بلا کی ہوتی ہے کہ سننے والا بے خود ہو جاتا ہے اور سننے والے پر کیا منحصر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود شاعر اپنی شوخ بیانی اور نکتہ سنجی پر مٹا ہؤا ہے اور اپنی شان کو یہ کہہ کر اغیار کی مدح سرائی سے بے نیاز کر دیتا ہے ۔

شاعری ہے ریاض کے دم تک
پھر کہاں لوگ اس طبیعت کے

ریاض اپنے تخئیل کے کبھی شکار نہیں ہوتے - وہ اپنی ہستی کو اپنے تخئیل میں نیست و نابود نہیں ہونے دیتے - جس طرح ایک پھول سے بو پھوٹتی ہے اسی طرح ریاض کے دل سے ایسے ترانے نکلتے ہیں جو کبھی اس دنیا کی اور کبھی دوسری دنیا کی یاد دلاتے ہیں - ان کی شخصیت سے ان کی شاعری پر ہرلحظہ نیا رنگ چڑھتا رہتا ہے - ان کی مسکراہٹ میں نہ جانے کہاں کا راز چھپا ہؤا ہے جس کی مستی میں بے شمار شوخیاں مضطرب ہیں - اسی حسن پرستی و عشق پیشگی پر زھد و اتقا نثار ہوتے ہیں - اس چوٹ کھائے ہوئے دل میں بہار خلد کی شگفتگی ہے - جس کا جادو سب پر اثر کرتا ہے مگر جس پر کسی کا جادو نہیں چلتا - ایسا عاشق کامل عالم کو درس عاشقی دیتا ہے - اگر حسن سدا سہاگ ہے تو عشق سدا بہار ہے - وہ ایک پیار کی چتون سے حسن مجازی اور حسن حقیقی دونوں کو موہ لیتا ہے -

ریاض کی متوالی آنکھوں سے عشق و مستی کی ہزاروں کیفیات چھلکی پڑتی ہیں - وہ ایسا گناھگار ہے جس کی معصیت پر مغفرت کو پیار آتا ہے -

عاشقانہ رنگ میں ریاض کی گلفشانیاں قابل دید ہیں - وھی الفاظ ہیں ، وھی باتیں ہیں ، وھی زمینیں ہیں جو ہر ایک کے کلام میں ملتی ہیں - لیکن ریاض کے دم قدم سے یہی زمینیں آسمان کا مقابلہ کر رھی ہیں - اپنی عاشقانہ شوخیوں سے ریاض نے خود حسن کو بے بس کر دیا ہے - وہ معشوق کو چھیڑ چھیڑ کر خفا کرتے ہیں اور معشوق سے روٹھ کر معشوق کو اپنے بس میں کر لیتے ہیں - اسی کا نام سحر ہے - معشوق خود اس روٹھنے اور منانے کی اداؤں پر نثار ہو جاتا ہے اور خود یہ پرستار حسن اتنا نازک مزاج ہے کہ بات بات پر مچل جاتا ہے -

چھیڑ کیسی بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاض
اک حسیں ہر وقت ہو ان کے منانے کیلئے

اس بد مست روح کو صدمہ بھی ہو جاتا ہے تو اس کے منہ سے قافیے ترانے بن کر نکلتے ہیں :—

کون دل ہے مرے اللہ جو ناشاد نہیں
کون گھر ہے مرے اللہ جو برباد نہیں
اے نسیم سحری ساتھ لئے جا سوئے بام
نفس سرد ہے نالہ نہیں فریاد نہیں
چپ سے ہیں وہ مری آغوش میں کچھ حشر کے دن
یہ وہی ہیں جنہیں پیمان وفا یاد نہیں

ایک دوسری غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :—

ہمارے دل میں ہے جو داغ ایسا کم نکلتا ہے
یہ بن بن کر چراغ محفل ماتم نکلتا ہے
جہاں ہم خشت خم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے
سحر ہوتے وہ اپنا چاک دامن لیکے بیٹھے ہیں
رفو کرنے کو تار دامن مریم نکلتا ہے

دوسرے اور تیسرے اشعار میں سارے عالم کے زہد و اتقا اور پاک باطنی کو للکارا ہے ۔ ریاض نے اپنی سیہ مستی اور ہوا پرستی میں نہ جانے کیا کیا دیکھ لیا ہے ۔ کعبہ ، زمزم اور حضرت مریم کا تار دامن ، خشت خم ، ساغر اور معشوق کے چاک دامن پر قربان ہو رہے ہیں ۔ تیسرے شعر کے پہلے مصرعے کی سج دھج بجائے خود ایک نئی چیز ہے :—

سحر ہوتے وہ اپنا چاک دامن لے کے بیٹھے ہیں

"سحر ہوتے" اور "لے کے بیٹھے ہیں" اس قسم کے ٹکڑے ہیں ، ان میں وہ ٹھٹھول ہے جو ریاض کو اردو کے ہر نظم گو اور غزل گو شاعر سے الگ کر دیتے ہیں ۔

ریاض کا ایک شعر ہے :—

ہم سوئے کوہ گئے قیس کو دینے آواز
یار آ جاؤ ذرا ماتم فرہاد کریں

دامن کوہ میں کھڑے ہو کر قیس کو پکارنا عجیب و غریب شاعرانہ انداز ہے - جنون عشق کی اور ایک المیہ موقع اور ماحول کے باوجود تخئیل کے طربیہ کی اس سے بڑھ کر تصویر نہیں کھینچی جا سکتی - دوسرے مصرعے کے بیساختہ پن میں کھیلتی ہوئی شوخی کے ساتھ کتنا درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے - ریاض کی شوخی اور مستی میں کبھی کبھی وہ درد بھرا ہوتا ہے جو نزع کی الٹی سانسوں میں بھی محسوس نہیں ہوتا -

ذیل کے دو شعر ملاحظہ ہوں :—

یہ محشر ہے یہاں اب ہوش میں دیوانہ آتا ہے
خداوندا مرے لب پر مرا افسانہ آتا ہے

فرشتے عرصہ گاہ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں
ہمیں بھی آج لطف لغزش مستانہ آتا ہے

پہلے شعر میں ایک سماں باندھ دیا ہے - جس کا ٹوٹنا آسان نہیں - پہلے مصرعے میں ''دیوانہ'' کا ذکر کرکے اور دوسرے مصرعے میں اپنے آپ کو وہ دیوانہ بنا کر اس قادر الکلامی کا ریاض نے ثبوت دیا ہے جس کی مثال کم ملتی ہے - دوسرے شعر کا کیا کہنا - اس بدمست ازل کو عرصہ گاہ حشر میں سنبھالے ہوئے ہیں - کون ؟ فرشتے -

ایک دوسری مشہور غزل کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں -

انہیں کے کام الہیٰ مرا لہو آئے
رنگیں جو ھاتھ لہو میں حنا کی بو آئے

اترنے والے ابھی تک نہ بام سے اترے
تڑپنے والے تڑپ کر فلک کو چھو آئے

دبی زبان سے میرا بھی ذکر کر دینا
کلیم طور پر آن سے جو گفتگو آئے

نہ ہو یہ کہنے کو ہم بے کہے گئے واعظ
حرم کو جاتے ہوئے منہ بتوں کا چھو آئے

ریاض تھی جو مقدر میں باز گشت شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنئو آئے

پہلے شعر میں کتنے پامال مضمون کو کس شوخ اور شگفتہ طرز میں بیان کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر عاشق کا لہو معشوق کے کیا کام آسکتا ہے کہ اس کے ہاتھ کی پوری پوری تزئین ہو جائے اور لہو حنا کی بو دینے لگے۔ دوسرے شعر کا انداز بیان کتنا سادہ، کتنا نیچرل اور کتنا اچھوتا ہے۔ دونوں اشعار میں طنز کا لطیف پہلو بھی نظر انداز کرنے کی چیز نہیں جس سے سوز و گداز کے مضامین میں بھی ایک شگفتگی پیدا ہو گئی ہے۔ تیسرے شعر میں ''دبی زبان'' اور ''آن سے'' ریاض کے سوا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ چوتھے شعر میں ایک معمولی بات یعنی بتوں کا منہ چھو لینا کس قدر گہرے معنی رکھتا ہے بظاہر عاشق بتوں کو منا کر، ان کا منہ چھو کر (ان کی خوشامد، ان کی منت سماجت کرکے) حرم کو جاتا ہے اور کبھی نہ بولنے والے بتوں سے محض خاموش ''اجازت'' لے لیتا ہے۔ لیکن اس چھیڑ اور اٹکھیل میں جو ٹیس بھری ہوئی ہے وہ اعلیٰ مذاق کو بیتاب کر دینے کے لئے کافی ہے۔ ریاض نے بتوں کا منہ چھو کو صرف ان کو الوداع ہی نہیں کہی ہے بلکہ اپنا کلیجہ بھی مسوس کر رکھ دیا ہے۔ ''بتوں'' کے لئے بھی یہ کتنا سخت عالم ہے۔ گویا کرشن برندابن کی گوپیوں سے جدا ہو کر کالے کوسوں کی منزل طے کرکے دوارکا جا رہے ہیں۔ اس شوخ اور چلبلے شعر نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے۔ شعر درد میں ڈوبا ہؤا ہے ''نہ ہو یہ کہنے کو'' اس موقع پر اس سے زیادہ پر درد الفاظ ناممکن ہیں۔ جس نے محبوب کو یا جس کو محبوب نے منہ چھو چھو کر کبھی منایا ہو گا یا جو اس عالم کا زندہ تصور کر سکے گا وہی کچھ ریاض کے اس شعر کا لطف اور شعر کے نشاطیہ رنگ کی کسک کا احساس کر سکے گا۔ پانچویں شعر میں لکھنؤ کی چہل پہل کی طرف اشارہ ہے ورنہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ

ریاض کے شباب کے ساتھ کس شہر کا نام وابستہ ہے ۔ *

حسن کی اداؤں کو جیسا ریاض نے سمجھا ہے کم کسی نے سمجھا ہو گا ۔ اُن کی نگاہ سے حسن کی کوئی ادا بچ نہیں سکتی ۔ کمسنی کی اداؤں کی جتنی سچی تصویریں ریاض کے یہاں ملتی ہیں اور کہیں نہیں ملتیں ۔ در اصل ریاض پر ہر وقت شباب ہی کا رنگ چڑھا رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری سے جوانی کا رنگ چھلکا پڑتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نشۂ جوانی سے سر شار ہے ۔ ہر وقت حسن کی بہار لوٹنے ہی کو وہ اپنا محبوب مشغلہ سمجھتا ہے یہی اس کی چشم بینا کے لئے خلد بریں اور اس کی بے چین روح کی آرام گاہ ہے ۔ مذہب اور تصوف کا بھی یہی مقصد ہے کہ دنیا کو ایک سدا بہار باغ بنا دیں جس کے ہر پھول پتے پر حسن ازل کا رنگ جھلکتا ہو ۔ خواہشات نفسانی کو کوسنے سے فطرت کی اصلاح نہیں ہوتی ۔ آخر نفسانیت سرشت انسانی کے راز ہائے پنہاں کے اُبھار ہی کا نام ہے جسے جوان ہونا نہیں آیا اسے کیا آیا ۔ کہنے کو چاہے کچھ کہئے لیکن جوانی کو روتے سب ہیں ۔ حالی ایسا مصلح کہہ گیا ہے ،

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

حساس دل کے لئے شوخ سے شوخ شعر میں بھی سوز و گداز موجود ہوتا ہے ۔ ہاں یہ میر کا سوز و گداز نہیں ہے ۔ یہ ہنستا کھیلتا سوز و گداز ہے ۔ اب اس رنگ میں ریاض کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

شام ہی سے وہ شب وصل یہ کہکر سوئے
جو ستائے ہمیں سوتے میں کبھی شاد نہ ہو

سحر ہوتے گیا کوئی تو یہ کہتا گیا کوئی
یہی تو ہیں کہ ان کے گھر کوئی پھر میہماں ہو گا

* یعني گورکھپور ۔

نگہ سے بڑھکے ہیں گستاخ دست شوق مرے
نہ کوسئے گا ذرا ھاتھ اٹھا اٹھا کے مجھے

قیامت اور قیامت میں آئی قہر ہؤا
بتوں نے چھیڑ دیا سامنے خدا کے مجھے

ریاض کے دو اشعار یہ ہیں :—

ہم تو اس کی ادا پہ مرتے ہیں
منہ چھپائے جو کوستا جائے

ہے ریاض اک جوان مست خرام
نہ پئے اور جھومتا جائے

ریاض کا ایک مطلع ہے :—

مجھ سے بے پردہ ملے مل کے گیا گم مجھ کو
ایک اس ساری خدائی میں ملے تم مجھ کو

اسے شاعری کہیں یا ساحری، ۔ دوسرے مصرعے میں ''ایک'' کا لفظ جادو کا حکم رکھتا ہے ۔ طنز آمیز شوخی کے پردے میں شکر و شکایت اور رنج و راحت کے کتنے پہلو چھپے ہوئے ہیں ''ایک اس ساری خدائی میں ملے تم مجھ کو'' ۔ دوسرے مصرعے میں ''ملے'' کا لفظ بھی کتنا ٹکسالی اور کتنا بلیغ ہے ۔

ان کے آنچل میں ادا بن کر قیامت چھپ چکی
وہ مری جانی ہوئی وہ میری پہچانی ہوئی

شوخی سے چمک کر ادھر آئے ادھر آئے
محشر میں بھی دیکھا تو تمہیں تم نظر آئے

ملا ہو خون جس میں کچھ وہی تو کام آتا ہے
کلیجہ منہ کو آتا ہے جو دل کا نام آتا ہے

آخری شعر کتنا چوٹیلا اور کتنا اچھوتا ھے۔ شعر کے معنے بھی قابل غور ھیں۔ دل کتنی عزیز چیز ھے اور انتہائے محبت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ھو سکتا ھے کہ محبوب چیز کا نام لیتے ھی کلیجہ منہ کو آ جائے۔ ایک اور لطیف پہلو شعر میں ھے۔ مصرعۂ اول میں دل کی پیار بھری طنز سے جو شکایت شاعر نے کی ھے دوسرا مصرعہ اس شکایت کا مفصل بیان بلکہ دل کے مظالم کی خونیں داستان ھو گیا ھے۔ ھائے ھائے ''کلیجہ منہ کو آتا ھے جو دل کا نام آتا ھے''۔

شعر کے دونوں پہلو ایک دوسرے سے وابستہ ھیں۔ انتہائے محبت انتہائے امید یہی تو شکایت کی جان اور ایمان ھیں۔ شاعر کی ھستی دل کو یاد کر کے ھمہ تن درد بن گئی۔ کلیجہ منہ کو آ گیا لیکن اس کی شخصیت نے اپنی آن نہیں چھوڑی اور سر کی ایک با معنی جنبش کے ساتھ ایک انداز خاص سے کہہ اٹھتا ھے ''کچھ وھی تو کام آتا ھے''۔

اسی غزل کا یہ شعر ملاحظہ ھو :—

یہ کہہ کہہ کر فلک تک لے گئی آہ رسا مجھ کو
اب ان کا بام آتا ھے اب ان کا بام آتا ھے

گل و بلبل، قفس و آشیاں کے مضامین میں بھی ریاض نے جو شگفتگی پیدا کر دی ھے۔ وہ انہی کا حصہ ھے۔ حقیقی کیف و سرمستی سوز و گداز ان اشعار میں کم سہی یا نہ سہی لیکن ان اشعار کا اٹکھیل یا چلبلا تصنع دیکھنے کی چیز ھے :—

چھائے پھولوں سے بھی صیاد تو آباد نہ ھو
وہ قفس کیا جو تہ دامن صیاد نہ ھو

بہار آتے ھی پھولوں نے چھاؤنی چھائی
کہ ڈھونڈھتا ھوں تو اب آشیاں نہیں ملتا

گیا چمن میں تو جھک کر بہت ملیں شاخیں
لیا گلوں نے مجھے میرے آشیاں کی طرح

دام اس رنگ سے گلشن میں بچھانا صیاد
میں سر دام چلوں سایہ تہ دام چلے

ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں
داغ دل ہے کہ قفس میں ہے گلستاں کوئی

گلا بیٹھا ہؤا خدمت اذاں کی وہ بڑی کعبے میں
بھلے کو ہم اڑا لائے تھے ناقوس برہمن کو

ریاض کے عاشقانہ کلام میں معاملہ بندی ، حسن و عشق کے راز و نیاز اور چھیڑ چھاڑ کے ساتھ سوز و گداز کی چاشنی ، جوش شباب کی بلاخیز آندھیاں اور شام جوانی کی کیفیات سبھی نظروں میں پھر جاتی ہیں ۔ عجیب رنگ ہے کہ ریاض کے شام جوانی کی خود فراموشی میں صبح ازل انگڑائیاں لے کر اٹھتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ تخیل کی بجلیوں نے چاروں طرف کوند کوند کر اس شام جوانی کے جلوے کو اور بھی نکھار دیا ہے ۔

شراب کا مضمون فارسی اور اردو شعرا برابر باندھتے چلے آے ہیں لیکن ریاض کا انداز بیان سب سے نرالا ہے ۔ شراب کا نام لیتے ہی ریاض اردو شاعری کے آسمان پر ایک متوالی گھٹا کی طرح منڈلانے لگتے ہیں اور اُن کی شوخ طبیعت بجلی بن کر چمکتی اور چنگاریاں اڑاتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے ۔

ہجر و وصال کے اکثر مضامین میں بھی وہ تاثیر اور وہ درد دیکھنے میں نہیں آتا جو ریاض کے یہاں شراب کے مضامین میں موجود ہے ۔ حسن و عشق کی معاملہ بندی میں جس طرح بسا اوقات ریاض خیالات و مفروضات کی لیلا رچا کر سامان تفریح بہم پہونچاتے ہیں اسی طرح اکثر ایک خیالی رمزیت کے ساتھ وہ خمریات میں بھی معاملہ بندی کی فضا اور سماں پیدا کر دیتے ہیں ۔ کیا خمریات میں ہم ایک حسین تصنع کو سرے سے ناروا قرار دے دیں ؟ بہر حال جس وقت یہ بنا ہؤا شرابی ہمارے سامنے آتا ہے تو اسے ساغر ، صہبا ، ساقی و میکدہ وغیرہ کے نام لینے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ اُس کی مدھ بھری

آنکھوں اور اس کی متوالی چال سے شراب چھلکی پڑتی ہے - اس کے اشارے و کنائے ، اس کے حرکات و سکنات خود بزم مے کی تصویر کھینچ دیتے ہیں اور شراب سے وہ کبھی محض ''وہ'' کہہ کر کبھی ''میکدہ والی'' کبھی محض ''پانی'' کہہ کے خطاب کرتے ہیں -

شاعر ساقئی ازل کی آنکھیں دیکھے ہوئے معلوم ہوتا ہے - چھائی ہوئی گھٹا کی طرف شیشہ و جام ، ساغر و خم کی طرف جب وہ دیکھتا ہے تو امید و یاس کی وہ کیفیتیں درد و راحت کے وہ احساس اس پر طاری ہو جاتے ہیں جو اب تک شاید ہی کسی کو نصیب ہوئے ہوں - لیکن یہاں بھی اس کی خصوصیت اس کی شخصیت اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی - ساغر و صہبا ، ساقی و مے خانہ سے بھی بڑھ کر آپ شراب خوار ازل کی شخصیت سے متاثر ہوتے ہیں جس کی شوخی ، جس کا بانکپن اور جس کی بیتابیاں شراب آتشیں کو بھی مات کئے ہوئے ہیں ، جو چھری سے بھی زیادہ تیز اور بجلی سے زیادہ بیتاب ہے - ریاض کی بیتابیوں کے سامنے موج مے بھی لڑکھڑانے لگتی ہے - سچ ہے اس بدمست ازل کا بیقرار دل ساقئی ازل کی نگہ شوق کا پورا پورا جواب ہے -

دیکھئے ریاض نے اس کی تعریف میں کیا کیا کہا ہے :-

گھٹا چھائی یہ بوچھاریں ہمیں پر
ارے واعظ کہاں تک ہم پئے جائیں

دیدے تو میری جوانی ترے صدقے ساقی
ہے وہی تیرے چھلکتے ہوئے پیمانے میں

سمجھا تھا جن کو پھول وہ نکلے شرار سنگ
شیشے مرے نصیب سے پتھر کے ہو گئے

نشے کی پینگ میں سوجھی نہ کسی کو ساقی
موج مے بن کے چھری چل گئی میخواروں میں

پی پی کے اس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا

بزم متوالی تھی کیا خم سے اڑالی میں نے
ہاتھ تھاما نہ کسی نے سر محفل میرا

ایک ہی چلّو کے تھے کوثر و تسنیم ریاض
خاک اڑتی جو لب خشک مرا تر ہوتا

حرم و دیر میں ہوتی ہے پرستش کس کی
میکشو یہ بھی کوئی، نام ہیں میخانوں کے
جام مے توبہ شکن توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

ان چکنا چور ''پیمانوں'' کا انبار بھی قابل دید ہے۔

جہاں ہم خشت خم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر ٹپک دیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

کبھی کی پی ہوئی کام آئی آج حشر کے دن
خدا کے سامنے میخوار سرخرو آئے

دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جبتک شراب آئے کئی دور ہو چکے

وہ آ رہا ہے عصا ٹیکتا ہؤا واعظ
بہا دے اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ ملے

مر گیا ہوں پہ تعلق ہے یہ میخانے سے
میرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

فرشتے عرصہ گاہ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں
ہمیں بھی آج لطف لغزش مستانہ آتا ہے

پاک وصاف ایسی ہے جسنے پی فرشتہ بن گیا
زاہدو یہ حور کے دامن کی ہے چھانی ہوئی

بیٹھے ہوئے ہیں ہاتھ دھرے ہاتھ پر ریاض
واعظ کے سر پہ آج سبو ہم اچھال کے

کاٹے کٹتی نہیں مجھ رند سے برسات کی رات
میکدہ والی جو مل جائے تو کچھ کام چلے

اتنا تو پتہ کیا ہے کہ بہکے ہوئے ہم تھے
مجرم ہیں جو واعظ کی کہیں سے خبر آئے

بعد اک عمر کے میخانے میں آئے ہیں ریاض
آپ بیٹھے ہیں بچائے ہوئے دامن کیسا

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے جام ہو گئی ہے

کچھ ہوا میں عجیب مستی ہے
کہیں برسی ہے آسماں سے آج

دن کو روزہ عید شب کو ہے عجب شغل ریاض
رات بھر پیتا ہے یہ مرد مسلماں آج کل

ریاض نے ان اشعار میں پسی ہوئی بجلیاں ملا دی ہیں ۔ اس پیکر بیتابی سے موج شراب کی لغزش مستانہ پناہ مانگتی ہے ۔ صدائے قلقل مینا سے نوائے الاماں اٹھتی ہوئی سنائی دیتی ہے ۔ اس کی للچائی ہوئی نگاہ ، اس کے نعرۂ مستانہ ، اس کی طبیعت کا چلبلا پن ۔ اس کا کچھ

کہہ کے چپ ہو جانا اس کے اشارات و کنایات ان سب میں وہ راز چھپے ہوئے ہیں جن کا انکشاف شہود غیب الغیب ہے - مذاق سخن رکھنے والے ان اشعار کو سن کے تاملا آٹھتے اور دل تھام لیتے ہیں - درد ہستی بجلی بن کر چمکنے لگتا ہے اور اس برق جولانی کے سامنے پردہ ہائے حقیقت سمٹ سمٹ جاتے ہیں - اس کے اضطراب درد میں شعلے کی لپک ہے اور اس کے آغوش غم و یاس میں امید کچھ اس طرح گیری ہوئی ہے کہ اگر ایک دم کو نکل بھی جائے تو شعلہ بداماں ہو کر نکلے گی - *

شاعری کا اصلی مقصد روح کی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرنا ہے - اور ریاض نے انہیں کچھ اس طرح چونکایا ہے کہ حیات انسانی فضائے بیکراں میں ایک سحر لرزاں کی طرح جلوہ نما ہو کر تسخیر عالم کر رہی ہے - اور ایک لحظہ کے لئے غم ، نشاط ، عقل و بے خبری ، زہد و سیہ کاری ، سجدہ اور سرکشی کا اتصال ہو جاتا ہے اور آن کی آن میں ہزاروں بجلیاں آنکھوں کے سامنے کوندتی ہوئی نکل جاتی ہیں -

اس مضمون کے اختتام پر اس شہر کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جس میں ریاض کی قریب قریب ساری زندگی کٹی ہے -

ریاض نے اپنی عمر کے پچاس سال گورکھپور کے نذر کئے ہیں اور اہل گورکھپور میں اب تک شاید ہی کوئی ایسا ہؤا ہو گا جس کو سر زمین گورکھپور سے اتنا گہرا دلی تعلق رہا ہو جیسا ریاض کو - جب تک وہ گورکھپور میں رہے گورکھپور ان کا تھا اور وہ گورکھپور کے تھے - ریاض کو گورکھپور سے گئے بیس سال کے قریب ہو چکے لیکن ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جنہوں نے گورکھپور میں ریاض کو اس زمانے میں دیکھا تھا - ان کی آنکھوں کے سامنے ابھی تک

---

* یہ مضمون شائع ہونے کے کچھ بعد مجھے یہ احساس ہؤا کہ ریاض کے خمریات میں بہت شوخ حسین و لطیف تصنع ہے یہاں مکر جذبات ہے حقیقی جذبات یا کیفیات نہیں -

فراق

ریاض کی وہ شکل پھرتی ہے - گورا چٹا چھریرا اور کسا بھرا بدن ، بڑی بڑی مونچھیں جو کئی بل کھا کے اس بھرے ہوئے چہرے پر لٹکتی پڑی تھیں - مدھ بھری آنکھیں ، متوالی چال ، حسین چہرہ اور اس پر قیامت ریاض کی وضع - ایڑی تک لٹکتا ہؤا چپکن اور سر کے کاکوں پر پڑی ہوئی ٹوپی جس پر ''حضرت ریاض'' لکھا ہؤا تھا . ریاض خود بھی حسین تھے اور حسن پرست بھی - اُن کے حسن و عشق کے معرکے اسی شہر میں ہوئے ہیں - کہتے ہیں :-

وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے
بڑی حسرت سے لب پر ذکر گورکھپور رہتا ہے

ہم اپنے خون تمنا سے سینچ آئے ہیں
حسین لگائیں منگا کر حنائے گورکھپور

اے ریاض اس طرح آ جاتا ہے دو دن کو شباب
داغ کہنہ تازہ کر لاتے ہیں گورکھپور کے

ریاض اب کیا کریں اس شہر سے ہم قصد جانے کا
نصیبوں میں لکھا ہے خاک گورکھپور ہو جانا

ریاض کو گورکھپور سے اپنے وطن خیر آباد گئے ہوئے بیس برس کے قریب ہو گئے ہیں لیکن پیرانہ سالی میں ''داغ کہنہ تازہ کرنے کو'' ہر سال وہ اس شہر کی زیارت کو جاتے ہیں جہاں ان کے دل نے غالباً پہلے پہل چوٹ کھائی تھی -

راقم الحروف کو آج سے چار سال پہلے حضرت ریاض کی زیارت نصیب ہوئی تھی جب وہ استاد و سیم خیر آبادی کے ساتھ راقم کے غریب خانہ پر آئے تھے - پیرانہ سالی میں بھی وہی سیدھی سادی چال تھی وہی مدھ بھری آنکھیں تھیں ، وہی نورانی چہرہ تھا جس کا ذکر اکثر لوگوں سے سنا تھا - بال سب سفید ہو گئے تھے اور وضع سادہ تھی - میرے ساتھ بیک وقت دوستانہ و پدرانہ شفقت سے پیش آئے اور مجھے دیکھ کر کہا - ''آپ کو دیکھ کر آپ کے والد مرحوم

حضرت عبرت کی یاد آتی ہے"۔ راقم اس وقت تحریک ترک موالات میں شریک ہو چکا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ "اصلی شاعری یہی ہے"۔ شعر و سخن سے راقم کا کچھ شوق دیکھ کر فرمایا کہ "سیدھی سادی سامنے کی باتیں شعر میں ہونا چاہئیں۔ اغلاق سے بچنا چاہئیے"۔

ریاض کو اپنے شعر بالکل یاد نہیں رہتے۔ چنانچہ راقم کی خاطر سے بڑی کاوش سے اپنے دو تین اشعار یاد کر کے سنائے۔ ان میں سے کچھ مجھے اب تک یاد ہیں:-

آہ کے مارے اشک کے چاٹے
آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں
کتنی نازک ہیں چوڑیاں ان کی
ایسی تو چین آستیں بھی نہیں

اس کے بعد سے اب تک تین چار بار آستاذی حضرت و سیم کے ساتھ ریاض غریب خانہ پر تشریف لا چکے ہیں۔

ریاض کی طبیعت تکلف سے بالکل مبّرا ہے۔ وہ اپنی شاعرانہ عظمت سے بھی شاید واقف نہیں۔ ہاں اس کا حال کچھ وہی جانتے ہیں جن کے دلوں پر ان کے کلام کا گھاؤ لگا ہے۔

ریاض سے ملاقات کی یہ گھڑیاں یاد کر کے راقم الحروف آبدیدہ ہو گیا ہے۔ آئندہ نسلیں رشک کریں گی ان آنکھوں پر جو بند ہونے کے پیشتر اس پیکر نورانی کی جس کا نام ریاض ہے زیارت کر چکی ہیں۔ ریاض کا نام دنیائے شاعری میں ہمیشہ قائم رہے گا۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

فانی

بات ہے ۱۹۲۰ء کے قریب کی - میں آگرہ جیل میں سیاسی قیدی تھا - ڈیڑھ دو سو سیاسی قیدی تھے - انھی اسیران فرنگ میں کسی کے پاس علی گڑھ میگزین کا کوئی نمبر تھا - قید میں لٹریچر کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے خواہ وہ کسی میگزین یا اخبار ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو - کسی کو جیل میں میگزین کیا ملی بھگوان ملے - خدا قدیم سہی میگزین بھی پرانی سہی لیکن قید میں جیل کے باہر کی ہر چیز نئی نظر آتی ہے - وہ میگزین میرے ھاتھ لگی - اور اس میں پہلے پہل فانی کی یہ غزل میں نے دیکھی تھی -

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاھے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

میری عمر اس وقت تئیس برس کی تھی - غزل سے اتنا متاثر ھؤا کہ دل ھی دل میں فیصلہ کر لیا کہ فانی کوئی بہت بڑا شاعر ہے - اس وقت تک فانی کی بڑھتی ہوئی شہرت کی مجھے کانوں کان خبر نہ تھی - کچھ دنوں کے بعد نیاز فتحپوری کے ھاتھوں نگار کا پہلا نمبر نکل کر جیل میں آیا اس میں فانی کی دوسری غزل دیکھی اور پھر تیسری غزل دوسرے نمبر میں دیکھی -

تجھے خبر ہے ترے تیر بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں ملتا *

---

* اس پر نیاز فتحپوری کا نوٹ تھا - ''مومن کا شعر بے اختیار یاد آیا -

اک تیر کی واں ترکش قاتل میں کمی ہے
یاں سینے میں اپنا دل مضطر نہیں ملتا''

فانی کف قاتل میں شمشیر نظر آئی
لے خواب محبت کی تعبیر نظر آئی

یہ تھیں فانی سے میری پہلی ماقاتیں - جسمانی ملاقاتیں آن سے کبھی نہ ہو سکیں بعد کو تو باقیات فانی اور پھر عرفانیات فانی نے میری فانی سے نہ جانے کتنی روحانی ملاقاتیں کرائیں - فانی کی تصویر بھی دیکھی اور وہ نشتر کی طرح تب سے اب تک میرے اندر ڈوبتی ہی جا رہی ہے اور ڈوبتی ہی جائیگی شاید ہی کسی شاعر کی تصویر میں اتنی نشتریت ہو - ہاں تو اگرچہ بعد کو فانی کی شاعری یا ان کی روح اپنے پورے فروغ کے ساتھ تھرتھرا تھرتھرا کر فضا کو مرتعش اور منور کرتی رہی لیکن جوانی میں اور جیل میں جس پہلی ملاقات کا ذکر کر چکا ہوں اس کا چٹیلا پن کچھ ایسا تھا ، آس کی نشتریت میں کچھ ایسی تازگی تھی کہ مجھے یہ سوچکر در پردہ رشک ہونے لگا کہ اس وقت فانی جیسے تھے آس سے زیادہ کیوں مشہور ہوئے - کسی شاعر کی عالمگیر شہرت آس کے اثرات سے وہ اپنا پن چھین لیتی ہے جو طلوع شہرت کے وقت لوگ محسوس کرتے ہیں - شاعر کی پہلی شہرت اس کے بعد کی شہرت کی رقیب بن جاتی ہے اور شاعر کی مکمل مجموعی اور مستقل شہرت کے متعلق ہی یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ اس کی ہر نظم اور ہر غزل کے بارے میں صحیح ہے - فانی کی غزلوں کو پہلے پہل رسالوں میں دیکھ کر جو اچانک چونکا دینے والی بات ملتی تھی بعد کو دیوان میں انہی غزلوں کو دیکھ کر وہ حیرت ، وہ خلش اور چبھن رشک کی صورت اختیار کر لیتی تھی - ''دیوان میں یہ غزل کیوں ہے'' یہ طفلانہ اعتراض دل میں اٹھنے لگتا ہے - کم سے کم مرے دل میں - کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی شاعر کا کلام جستہ جستہ سننے یا دیکھنے کو ملے تو یہ شاعرانہ بات ہوئی - اور پھر وہی کلام اس شاعر کے مجموعۂ کلام کی شکل میں ھاتھ آنے تو یہ کچھ غیر شاعرانہ بات ہوئی - گویا شاعر سے روحانی ملاقات کی تازگی ، نرالا پن اور نوعیت مجموعہ کلام بن کر میکانکی (Mechanical) چیزیں ہو گئیں -

میں ۱۹۴۰ ء سے اب تک بہت کچھ بن اور بگڑ چکا ہوں اور شاید بدل بھی چکا ہوں - شہید شعر سے شہید شاعری یا مجروح شاعری

تو ہو ہی چکا ہوں ۔ اور یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ شاعر ہونے کی بہت مہنگی قیمت بھی دینی پڑتی ہے ۔ خون جگر کھانے کے معنوں میں نہیں بلکہ ان معنوں میں کہ وجدانی شخصیت متعین اور محدود سی ہو جاتی ہے ۔ دوسروں کے کلام سے شاعر بمقابلہ دوسرے پڑھنے والوں کے بیک وقت زیادہ اور کم متاثر ہو پاتا ہے ۔ میرا بھی کچھ ایسا ہی حال ہؤا ۔ شاعری میں میرا رنگ طبیعت جیسے جیسے نکھرتا گیا اس میں ایک انفرادیت آتی گئی ، اپنی پہلی بھولی بھالی سپردگی میں کھو بیٹھا ۔

فانی کے شعراب بھی نشتر کی طرح میرے دل میں اتر جاتے تھے لیکن میری بھی ایک وجدانیت بن چکی تھی ۔ اس لئے ''اک خلش ہوتی ہے محسوس رگ جاں کے قریب'' والی بات تو فانی کے کلام سے اب بھی ہوتی تھی ضرور ہوتی تھی اور ہوتی ہے پھر بھی اس ''قریب'' کے بعید ہونے کا بھی کچھ احساس ہونے لگا ۔ میں بھی دکھی آدمی ہوں لیکن میرا دل اسی عنوان و انداز سے نہیں دکھتا جس عنوان و انداز سے فانی کا دل دکھتا ہے ۔ غالب نے کیوں کہا ۔ ''فریاد کی کوئی لے نہیں ہے'' غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ نالہ بھی ''پابند نے'' ہے ۔ اپنا اپنا رونا ، اپنا اپنا ہنسنا ۔

فانی کا دل بہت دکھا ہؤا ہے ۔ غمزدہ اردو غزل گوئی کی تاریخ میں بھی اتنے دکھے ہوئے دل اور اتنی دکھی ہوئی آواز کی انی گنی مثالیں مل سکیں گی ان کی عشقیہ زندگی کے تجربوں نے ان کے دکھ اور غم کو جنم دیا اور پالا ۔ ان تجربوں اور محسوسات نے ان کے لئے حیات و کائنات کی پوری فضا کو رنگ ڈالا تھا ۔ ان کی جنسی ، شہوانی یا روحانی ناکامیاں (Frustrations) ان کا فلسفۂ زندگی ، ان کا نقدحیات ہو کر رہ گئیں ۔ فانی میں ظرافت و بذلہ سنجی اتنی تو ہی کہ آن کی باتیں اور ان کی شخصیت من کو موہ لیتی ہیں اور جی کو لبھالیتی ہیں ۔ آن کے آنسوؤں میں نشتروں کی طرح موج ہائے تبسم تھرتھراتی ، ڈوبتی اور اچھلتی ہیں ۔ نہ وہ گم سم آدمی تھے ، نہ ٹھس آدمی تھے ۔ نہ چڑچڑے ۔ یہ شرافت ، نیکی ، معصومیت ، یہ تہذیب اور لطافت ، یہ نرمی اور بھولا پن سب کے حصے میں نہیں آتے ۔ شاید ہی کوئی اردو غزل گو ساٹھ برس کی عمر تک اس بال سبھاؤ (بچوں کی

طبیعت) کا ثبوت دے سکے - یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ نرمی ان کے مزاج میں ضبط غم کی وجہ سے آئی تھی یا یہ ضبط اُن کے مزاج کی نرمی کی وجہ سے اُن میں آ گیا تھا - سب کچھ دیکھتے سنتے ہوئے سب کچھ سہتے ہوئے یہ شخص کتنا بھولا بھالا تھا - میر کا شعر ہے -

آتے ہیں میر منہ کو بنائے خفا سے آج ،
شاید بگڑ گئی ہے کچھ اس بیوفا سے آج

فانی کبھی ''منہ کو بنائے خفا سے'' نظر آتے - اُن پر سب کچھ بیت چکی ہے - لیکن کسی بے وفا سے ''شاید بگڑ گئی ہے'' یہ ان کے معاملات حسن و عشق کی صحیح رپورٹ نہ ہوگی - فانی ہنس مکھ عاشق نہیں تھے - لیکن انہیں منہ بنانا اور ''خفا سے'' نظر آنا بھی نہیں آتا تھا - انہوں نے غم اور قنوطیت کو ایک نیا مزاج دیا ، ایک نیا کلچر دیا - انہوں نے غم کو ایک نئی چمکار دی - اسے بہت نرم اور لچکدار انگلیوں سے رچایا اور نکھارا ، اُسے نئی لوریاں سنائیں ، اسے اپنی آواز کے ایک خاص لوچ سے سلایا اور جگایا - زندگئیِ غم کو فانی نے نئے آداب (Etiquette) سے سنوارا ، نئے تکلفات سے نکھارا غم کے اندر نئی روک تھام ، نئی تھرتھری پیدا کی ، نئی چٹکیاں نئی گدگدی نئی لرزشیں نئی سہرن ان کے ہاتھوں سے غم کی دکھی ہوئی رگوں کو ملیں -

فانی کے کلام سے باوجود متاثر ہونے کے کچھ بے اطمینانی یا غیر آسودگی فطری چیز ہے - اُن کی زندگی ہی میں لٹکن (Pendulum) نے دوسری انتہا (Opposite Extreme) کی جانب پینگ ماری تھی - اصغر کی ''نشاط روح'' ''سرود زندگی'' کے نغموں میں - لیکن اصغر کے رد عمل سے بھی بے اطمینانی اور غیر آسودگی ہو ہی جاتی ہے - زندگی نہ غم سےخوش نہ خوشی سے خوش - مارکس اور اُس کے ہم خیال جہاں اقبال کے کلام کو فاشستی بتائیں گے فانی اور اصغر کی کائنات خیال و فکریات کو حقیر شہری متوسط طبقے کے اثرات (Petty Bourgeois) بتائیں گے - بہر حال یہ بات سوچنے کی ہے ضرور کہ فانی اشترا کی تہذیب و تمدن کی فضا میں آنکھیں کھولتے ، پلتے اور بڑھتے اپنی حسن و عشق پرستی سمیت تو کیا وہ اور اُن کی شاعری بہت کچھ بدلی ہوئی چیزیں نہ ہوتیں - برنارڈ شا نے اپنی ایک ناٹک میں لکھا ہے کہ ٹوٹا ہؤا دل

اور بھری ہوئی جیب آدمی کو بہت موافق آتے ہیں - دور سرمایہ داری خاص کر کسی غیر سرمایہ دار ملک کی غلامی میں رونا تو یہی ہے کہ انفرادیت (Individualism) یا نفسی نفسی انفرادیت یا شخصیت کو مٹا کر رکھ دیتی ہے - کم سے کم فرد کو مٹانے میں انفرادیت کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتی ، مجھے اپنا شعر یاد آ گیا -

خود اپنے جیتے مردے کو تجھے دینا پڑے کاندھا
گراں اس درجہ بار انفرادیت نہ ہو جائے

ٹیگور بھی کہتے ہیں :-

O' fool, to try to carry thyself on thine own shoulders, to beg at thine own door !

میر ، غالب ، فانی ، اگر یہ بوجھ ڈھونے میں کھیپ ہو گئے یا کھیپ ہوتے ہوتے رہ گئے ، اور اگر سودا ، ذوق ، آتش وغیرہ کسی طرح اس ہلچل میں نکل بھاگے تو بھی یہ سوال ضرور اٹھتا ہے کہ شاعرانہ سوز و گداز کا کیا یہی مفہوم ہے کہ ہم دکھ سے ہم آہنگ ہو جائیں ، دکھ سے وجدانی کیفیت حاصل کرنے کی صلاحیتیں اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں ، دکھ میں جمالیاتی قدریں (Aesthetic Values) ڈھونڈھتے پھریں یا روحانی قدریں فانی کی شاعری کی غرض و غایت ایک خاص دلکش و دلفریب انداز سے خفیف و لطیف چٹخاروں کے ساتھ اپنے دل کا لہو چاٹنے ، تلخ کو خوشگوار بنانے ، دکھ کو سکھ بنانے اور بیماری کو پہلے مدتی (Chronic) بنا کر اسے صحت سمجھنے کے سوا اور کیا ہے - فانی کے پہلے میر درد دہلوی کے بھائی میر اثر کا دیوان ایک ایسی چیز ہے جس کے اثر تخیل کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ سینہ دکھنے لگتا ہے - اثر کے یہاں ٹھیٹھ درد ملتا ہے فانی کے یہاں وہ لطیف ہو گیا ہے اور کچھ نفسیاتی سکون کے عناصر اس کے یہاں مل گئے ہیں - کیونکہ فانی میں ایک ایسی رگ ہے جو دکھی ہوئی بھی ہے اور فلسفیانہ بھی ، مگر بات جہاں کی تہاں رہتی ہے -

سو سوالوں کا ایک سوال یہ ہے کہ زمانہ یا تاریخ جس انسان کے منتظر ھیں اور جس انسان کو جنم لینے میں مدد دینا ادب اور شاعری کا کام ہے وہ انسان فانی کی شاعری میں انگڑائی لیتا ہؤا نظر آتا ہے یا نہیں ؟ حافظ کی شاعری میں تو کچھ ایسے انسان کی جھلک مل جاتی ہے ۔ کچھ خیام کی رباعیوں میں بھی ، کچھ والمیک اور کالیداس اور فردوسی کے صفحات میں بھی اور اگرچہ آپ یہ سن کر کچھ چونکیں گے میر کے نغموں میں بھی رجائیت و قنوطیت بر طرف ، کیا ہم شاعروں کی کوئی ایسی تقسیم نہیں کر سکتے جس کی رو سے ایک قسم کے شاعر تو وہ ہونگے جو زمانہ اور زندگی کے ھاتھوں مٹنے میں ایک شان پیدا کر لیتے ھیں ۔ انحطاط اور موت کو حسین بنا دیتے ھیں جو ''زمانہ باتونہ سازد توبازمانہ‌ستیز'' کے نعرے پر آگے بڑھتے ھیں اور شکست و فتح جو کچھ بھی ہو اتنا تو کہلوا ھی لیتے ھیں کہ ''مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا'' ۔ فانی کے یہاں جو چیز ھمیں بیک وقت اپیل کرتی ہے اور ھمیں غیر آسودہ بھی کرتی ہے وہ ہے روحانی ناکامیوں کے ھاتھوں مٹنا اور اس مٹنے کو اتنا معصوم اور پاکیزہ اور حسین بنا دینا یہ مساکیت (Masochism) ھوتی ہے بہت دلکش و نظر فریب لیکن ہے خطر ناک چیز ۔

اگرچہ زندگی غم و خوشی سے بالا تر چیز ہے ، اگرچہ انسانی فلاح و ترقی کا محض یہ مقصد نہیں کہ انسان خوش رہے بقول برنارڈشا کے محض احمق آدمی خوش رھنا چاھتا ہے پھر بھی غم و خوشی مقصد زندگی نہ ھوتے ھوئے بھی مقصد زندگی کی طرف بڑھنے میں محرک ضرور ھیں ۔ نطشے کا قول ہے کہ درد کے روحانی بننے کا نام ترقی ہے (All progress is the spiritualisation of pain) ولیم جیمس خوشی یا نشاط کو زندگی کا مسئلہ نہیں مانتا مگر غم کا مسئلہ اور معمہ مانتا ہے There is a problem of evil, there (is no problem of good) سچ اور جھوٹ کے بارے میں بھی کچھ اسی قسم کی بات کہی جاتی ہے :—

(There is simple but there is no such thing) (as a simple lie) ھاں مہاتما گوتم بدھ نے ضرور خوشی ، نشاط اور آنند کو بھی کرب معکوس کہا ہے ۔ بہر حال انسانی تہذیب کے آغاز

سے انسانی علوم و فنون کے آغاز سے دکھ سکھ ، درد و راحت ، اضطراب و سکون ، غم و نشاط وہ چیزیں ھیں جو زندگی اور شاعری میں رچی بسی ھیں ۔ غم منزل نہ سہی لیکن کاروان حیات کی بانگ جرس کی آواز کا ایک جزو تھا ، ھے اور رھے گا ۔ کوئی سمجھدار ترقی پسند یا اشتراکی یہ نہیں مانتا کہ نئے نظام کے قائم ھونے کے بعد زندگی سے غم غائب ھو جائے گا ۔ غم تو جنت میں بھی آدمی کا ساتھ نہ چھوڑے گا ع

ھم کو معلوم ھے جنت کی حقیقت لیکن

سوال یہ ھے کہ غم ھمارے ساتھ کیا کرے اور ھم غم کے ساتھ کیا کریں ۔ شاید اس کا بہترین جواب شاعر دے سکتا ھے ۔ لیکن کیا دیتا بھی ھے ؟

بقول اقبال :—

خبر نہیں کہ سفینے ڈبو چکی کتنے
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

پس اگر غم بھی ھمارے لئے حیاتیات (Vitamins) میں سے ھے تو وہ غم کیسا ھو ، کیا ھو ھمیں وہ کس طرح بنائے اور بگاڑے ؟ اس کو سمجھنے میں شاید یوں کچھ مدد ملے کہ ھم اپنے آپ سے پوچھیں کہ زندگی کیا ھو ، کیسی ھو ؟ ھم آسے اور وہ ھمیں کس طرح بنائے اور بگاڑے یعنی زندگی کے جدلیات کا ھم کیا نظریہ رکھتے ھیں یہ بہت بڑے اور پیچیدہ اھم سوالات ھیں ۔ یہ آدم کی الجھائی گتھی کو سلجھانا ھے ۔ صرف چند اشارے ممکن ھیں ۔ ناخن کے چند کچوکوں سے زندگی میں زندگی کی گتھی سلجھانے کی فرصت کہاں ۔ لیکن جو فرصت کے لمحے ھیں غنیمت ھیں ۔ میں تو یہی کہوں گا کہ غم ھو یا خوشی انسان کو کبھی نہیں بھولنا چاھئے کہ وہ جزو کائنات ھے ۔ وہ کائنات سے علیحدہ ھو چکا ھے وہ ایک تارا ھے جو آسمان سے ٹوٹ چکا ھے اس علیحدگی کا راز اور نئے سرے سے آفاقیت کی طرف بڑھنا انسانی تاریخ کا یہی وہ راز ھے جس کی طرف اقبال نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ھے ع

کار جہاں دراز ھے اب مرا انتظار کر

ھاں تو غم میں بھی آفاق وسعت پیدا کرنا غم کا صحیح استعمال ھے - فانی کی دلفریب شاعری میں اس وسعت کا احساس ھمیں اس سے آسودہ رکھتا ھے لیکن محض آفاقیت کافی نہیں شوپنہار کے فلسفہ میں ٹامس ھارڈی کی نظموں اور افسانوں میں غم کو ھم آفاق پیمانے پر کار فرما دیکھتے ھیں اور پھر بھی ھم کو تشفی نہیں ھوتی نہ ھمارا دل غم کے اس نظریہ و فلسفہ کے صحیح ھونے کی گواھی دیتا ھے آفاق وسعتیں رکھتا ھؤا بھی یہ غم اک طرفہ معلوم ھوتا ھے - والٹر رالے نے شیکسپئر کے متعلق لکھا ھے : (Shakespear was that rarest of all things, a whole whole man) اور بن‌جانسن نے شکسپئر میں یہ صفت بتائی ھے :-

(To see life steadily and to see at whole) خود شیکسپئر نے شاعر کا مقصد یوں بیان کیا ھے :-

To hold the Mirror upto Nature

ھاں تو شاعری میں عظمت ، عالمگیری اور پائندگی کے لئے آفاق وسعت ایک صفت ضرور ھے ، لیکن وہ سب کچھ نہیں ھے - کائنات ایک بیکراں خلا نہیں ھے ، وہ محض ایک وسیع البسیط فضا نہیں ھے - وہ ایک ٹھوس بھرپور حقیقت ھے - وہ ''رنگا رنگ بزم آرائی'' ھے ، جیتی جاگتی چلتی پھرتی دنیا ھے - ایک دائمی محشرستان ھے - اس کا جدلیاتی تنوع اس کے بحر ذخار میں موج کا موج سے ٹکرانا پھر مل کر ایک لہر بن جانا اور اس طرح جوار بھاٹوں کا ایک لامتناھی سلسلہ ، یہ ٹھاٹھیں مارتا ھؤا جیون ساگر ، یہ چڑھتا اور اترتا ھؤا پانی شاعر کے نغموں میں چھلکتا ھؤا اور لہراتا ھؤا نظر آنا چاھیئے - کائنات و حیات کی ترجمانی یا مصوری وہ شاعری بہت ناقص طور پر کرے گی

جس میں فنکارانہ خوبیوں کے باوجود یک رنگی یا اک سُراپن ھو - بڑی شاعری میں شاعر کی آواز نہیں سنائی دیتی سنسار سنگیت سنائی دیتا ھے - وھی صاحب طرز بڑا شاعر ھے جس کا طرز ، طرز کائنات ھے - شاعری میں جیون کا ناٹک صاف صاف دکھائی دینا چاھیئے - اس کا

المیہ اور طربیہ اُس کے قہقہے اور اس کے نالے ، اس کی حسرتیں اور مانوسیتیں ، اُس کی شگفتگی اور اُداسیاں ، اُبھار اور درماندگی ، نور و ظلمت ، حرکت و سکون ، عمل اور بے بسی ، قدرتیں اور مجبوریاں ، لگاؤ اور بے لاگی ، عذاب و ثواب اور خیر و شر ، انکار و اقرار ، مادیت اور روحانیت ، خارجیت و داخلیت ، حرارت اور ٹھنڈک غرض کہ ضدین کے بے شمار جوڑے (Pairs of opposites) ٹکرا ٹکرا کے ایک ہو جاتے ہوئے اونچی شاعری کے نغموں میں نظر آتے ہیں یہاں بے شمار لااله کے نعرے باھم گھل مل کر الااللہ کا نعرہ بن جاتے ہیں ہزاروں 'نہیں' مل کر ایک 'ھاں' بن جاتے ہیں ۔ ڈاسنا وسکی کہتا ہے ۔ کہ سزائے قتل پا کر ہر مجرم پھانسی کے تختے پر حضرت عیسیٰ مسیح سے مشابہ معلوم ہونے لگتا ہے ۔

لیکن ــ ھاں اس معاملے میں ایک ''لیکن'' بھی ہے ۔ اپنے تمام طمطراق کے باوجود یہ ضروری نہیں کہ جہان نما شاعری فانی کی نئی متغزلانہ شاعری کیطرح دل کو لگے ۔ چکبست کی شاعری لاثانی فن کارانہ شاھکار ہے ۔ کتنی سجی بجی ہے ۔ کتنی پر تکلف ہے ۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی ۔ اس کے ساتھ ھی کافی مختلف العنوان سماجیت کی اس میں کتنی پٹ ہے اور اس کے نغموں کا بھی قریب وھی زمانہ رھا ہے جو فانی کے نغموں کا زمانہ تھا ۔ لیکن فانی کے پھول ابھی تازہ ہیں ۔ اور چکبست کے نغمے افسردہ ہو چلے ہیں ۔ فانی کی ''تنگنائے غزل'' کی بزم اب تک سجی ہوئی ہے ۔ وھاں آ کر دل بیٹھا سا جاتا ہے لیکن اٹھنے کو جی نہیں چاھتا اور بزم چکبست میں ''چل چلاؤ'' لگے ہوئے مدت ہو چکی ہے ۔ بات کیا ہے ؟ بات یہ ہے کہ شاعری میں پائندگی اور ھمیشگی کے صفات اس وقت آتے ہیں جب جہان رنگ و بو کو ورائے رنگ و بو بھی بنا دیا جائے ۔ جب کسی اور عالم میں پہنچ کر زمان و مکان آنکھیں جھپکانے لگیں ۔ جب شدید احساس تحیر میں بدلنے لگے ، جب محدود اور غیر محدود میں چشمکیں ہونے لگیں ۔ جب لفظ و بیان اپنے لغوی حدود توڑنے لگیں ، جب شاعر کا خلوص رموز بے خودی سے آشنا ہونے لگے ، جب یہ بھری ہوئی دنیا ایک جاگتا ھؤا خواب نظر آنے لگے ۔ میری یہ گذارش ہے کہ اگرچہ فانی کی غزل میں بجائے حیات و کائنات کے فانی کی حیات و کائنات ملتی ہے لیکن فانی کی اتم کتھا (Spiritual Autobiography)

میں جو معصوم تحیر ہے ، اس کے خلوص کا جو انداز ہے ، اس میں ہمیشگی کی جو ایک تھرتھری سی اور ایک جھلک سی ہے ، اس کے آنسوؤں کے قطروں میں جو ایک نیا ساز سرمدی ہے وہ چکبست کے یہاں نہیں ہے یعنی نغمگی کا وہ راز نہیں ہے -

اسی سے آٹھ رہے ہیں شعلۂ ہائے ساز سرمدی
بس ایک سوز بے اثر بس ایک ساز بے صدا

اس لئے محدود اور نامکمل ہوتے ہوئے بھی فانی کی غزل وہ حسین کمزوریاں ، وہ نازک بے بسی ، وہ پرخلوص و معصوم سعی بے حاصل اپنے اندر رکھتی ہے کہ آج بھی ، کل بھی ، برسوں بھی اور شاید دنیا کے بدل جانے پر بھی اس میں زندگی کے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی آنکھیں پڑتی رہیں گی - اور کبھی کبھی اس طرف کان لگ جایا کریں گے - مستقبل کی دنیا محض تنقید کا مدرسہ نہ ہوگی محض نکتہ چینی کا نام کلچر نہ ہوگا ، محفل حیات و محفل ادب وہ جگہ نہ ہوگی کہ ع

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

مستقبل بیتے ہوئے جگوں کو بھلا نہ دے گا - زندگی کا ہر بھیس میں خیر مقدم کریگا ہومر اور والمیک ، فردوسی ، اور خاقانی کی دنیا ہمارے لئے غیر مانوس دنیا نہیں ہے - ہمارے بعد کی انسانی دنیا کے لئے فانی کی شخصیت اور اُن کی آواز ایسی چیزیں نہ ہوگی - جسے لوگ پہچان نہ سکیں - فانی کی زندگی گھائل زندگی سہی لیکن ہے وہ بھی زندگی - جب وہ مستقبل کی زندگی کو آواز دے گی تو وہ زندگی بھی اُس کی آواز پر آواز دے گی - فانی خود کہہ گئے ہیں -

آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت
یہ تو ہؤا کہ موت مری زندگی ہوئی

ایسے اشعار کو جنازے بازی یا مرگھٹ کا رونا کہنا تنقید نہیں ہے جھلاہٹ ہے جس پر خود فانی بھی مسکرا دیتے - فانی کے شعور اور تخیل کو علیل اور بیمار کہنا بجا اور برحق لیکن یہ بھی ہم کیوں

بھول جائیں کہ تاریخ انسانیت بیمار پڑ پڑ کر اپنے کو صحت یاب بناتی ہے - شاعر کی زندگی بسا اوقات انسانی تاریخ کے ان بحرانی وقفوں کی نشانی اور علامت ہوتی ہے جو بیک وقت زندگی اور موت کے امکانات کے حامل ہوتے ہیں - شاعر عذاب زندگی اور گناہ زندگی کا کفارہ کرتا ہے - وہ دنیا کی نجات کے لئے صلیب یا پھانسی کے تختے پر چڑھتا ہے ، اس کا غم دنیا کے غم کا اسہال (Catharsis) ہے - وہ اپنے دل کی کسک میں دنیا کی کسک کو جذب کر لیتا ہے - اپنے آنسوؤں سے دھو کر زندگی کی گرد آلود فضا کو صاف کر دیتا ہے - دن جھلکدار اور رات سہانی ہو جاتی ہے - میرے مندرجہ ذیل اشعار میں شاید اس اصول کی طرف اشارہ ملے :-

تاریخ زندگی کے سمجھ کچھ محرکات
مجبور اتنی عشق کی بیچارگی نہیں

نکل رہیں گے ہزاروں نشاط کے پہلو
ابھی فسانۂ غم کو تمام ہونا ہے

حضرت ایوب کا قول ہے - "تو پہلے ایک قوم کو وسعتیں دیتا ہے پھر اُسے سیدھا کرتا ہے"-(Thou enlargeth a nation)

فانی کے کچھ اشعار سناؤں ؟

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

یا

محو تماشا ہوں میں یارب یا مدھوش تماشا ہوں
اس نے کب کا پھیر لیا منہ اب کس کا منہ تکتا ہوں

گو ہستی تھی خواب پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی
چونک اٹھے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں در زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

کسی کے غم کی کہانی ہے زندگی فانی
زمانہ اک فسانہ ہے مرنے والوں کا

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

کسی کے ایک اشارے میں کس کو کیا نہ ملا
بشر کو زیست ملی موت کو بہانہ ملا

وحشت دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو جوش پرستی ہے

کیا ہے خلق مجھے باوجود علم گناہ
یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

مذاق تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا
بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا

احساس غیر بادہ گوارا ہؤا مجھے
لا جام ساقیائے مینا گداز کا

عجلت پرواز جب ملنے بھی دے راہ گریز
یوں تو کھلنے کو قفس کا در کھلا اکثر کھلا

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہونچی تری جوانی تک

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا *

بچ رہا تھا ایک آنسو دار و گیر ضبط سے
جوش غم نے پھر اسی قطرے کو دریا کر دیا

مری آنکھوں میں آنسو کیا بتاؤں ہمنشیں کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارا ہے بہہ جائے تو دریا ہے

---

* مشہور ہندی دوہے کا مصرع ہے :— گونگے کا سپنا بھئو سمجھ سمجھ پچھتائے—فراق

وہ جلوہ مفت نظر تھا نظر کو کیا کہئے
کہ پھر بھی ذوق تماشا نہ کامیاب ہؤا

اس جان تمنا سے بے پردہ نہ کر شکوہ
وہ تجھ سے خفا ہے تو جینے سے خفا ہو جا

حسن حیرت تو میسر ہے تماشا نہ سہی
تری محفل میں ہیں گو نقش بہ دیوار ہیں ہم

جئے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

بچھ گئے راہ یار میں کانٹے
کس کو عذر برہنہ پائی ہے

ہر بے گنہہ کو دعوئ بخشش ہے روز حشر
گویا گناہ کی بھی ضرورت نہیں رہی

نہ بن پڑا کوئی عذر جفا کسی سے تو ہائے
ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

جب پرسش غم وہ کرتے ہیں کیا جانئے کیا ہو جاتا ہے
کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی کچھ درد سوا ہو جاتا ہے

دنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی بسنا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

اٹھا بھی دے نگہ ما سوا نگہ کا حجاب
یہ دیکھنے ہی کا پردہ ہے دیکھتا کیا ہے

تیرے گھر کی زمیں ارے توبہ
ذرہ ذرہ ہے آسماں انجام

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہؤا

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی ہیں نگاہیں کہ دھؤاں دل سے اٹھا

چشم ساقی کی وہ مخمور نگاہی توبہ
آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آ رہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

لذب فنا ہرگز گفتنی نہیں - یعنی
دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے

فصل گل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی
دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی

اب جنوں سے بھی توقع نہیں آزادی کی
چاک داماں بھی بہ اندازۂ داماں نکلا

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے
یہی بہت ہے کہ جینا حرام ہو جائے

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

بہار نذر تغافل ہوئی خزاں ٹھہری
خزاں شہید تبسم ہوئی بہار ہوئی

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

اور بندے ہیں جن کو دعویٰ خدائی ہے
تھی ہماری قسمت میں بندگی خدا ہو کر

ہوں اسیر فریب آزادی
پر ہیں اور مشق حیلۂ پرواز

خاک فانی کی قسم ہے تجھے اے دشت جنوں
کس سے سیکھا ترے ذروں نے بیاباں ہونا

طلب محض ہے سارا عالم
کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی میں ادا بانکپن کی تھی

محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

راز نیرنگئی حقیقت ہوں
میں ہوں فانی حقیقت نیرنگ

مایۂ اوراک ہستی ہوں تکلف بر طرف
زندگی میری دروغ مصلحت آمیز ہے

ہر نفس عمر گذشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

ہو غم ہستی جاوید گوارا کیوں کر
جان کیا دیں کہ بہت جان سے بیزار ہیں ہم

نہ آ قریب کہ پروردۂ فنا ہوں میں
بنا ہے برق کے تنکوں سے آشیاں صیاد

اُن کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا
اک جوش تھا کہ محو تماشائے جوش تھا

کس کی کشتی تہہ گرد اب فنا جا پہنچی
شور لبیک جو فانی لب ساحل سے اُٹھا

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات
جب مزاج یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید
کچھ اب کے بوئے کفن دامن بہار میں ہے

آج روز وصال فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں نازو نیاز

امیر اور داغ کی خوش فکریوں کے بعد فانی کی گھٹی ہوئی چٹیلی آواز غالباً زندگی اور ادب کی تاریخی لوازمات میں سے تھی - وہ امیر و داغ کے قہقہے تھے جو فانی کی فریاد وفغاں بن گئے تھے -

میں نے فانی کو دیکھا نہیں تھا لیکن یہ غم آ گیں خوش نصیبی مجھے ضرور نصیب ہوئی کہ اُن کے مرنے سے پہلے ان کی آواز میں نے سن لی تھی ، آہ آنسو میں ڈوبی ہوئی وہ آواز جو دلوں میں اُترتی چلی جاتی ہے ، یوں تو میں ریڈیو نہیں سنتا لیکن نہ جانے کیوں ۱۹۴۱ ء کی جنوری میں جب بھوپال کا مشاعرہ ہو رہا تھا میں نے اپنا ریڈیو ٹیون کر لیا - فانی کے نام کا اعلان ہؤا - محبت اور قدر شناسی سے میرا

دل امنڈ آیا ، میں بے چین ہو کر گوش بر آواز ہو گیا فانی نے عجیب ڈوبی ہوئی آواز میں وہ غزل سنائی ۔

جب پرسش غم وہ کرتے ہیں کیا جانئے کیا ہو جاتا ہے
کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی ، کچھ درد سوا ہوجاتا ہے

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا وجود آنسوؤں میں تحلیل ہو جائے گا ۔ اُن کی دوسری غزل اسی مشاعرے میں جگر نے پڑھی ''ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان سے دور'' لیکن سنا ان سنا برابر رہا کم سے کم میرے لئے ۔ شاید فانی کی یہ آخری غزلیں تھیں اور عجب کیا یہ باقیات فانی علیگڑھ میگزین کے اس فانی نمبر میں شائع ہوں ۔

ہندوستان کی بدلتی ہوئی زندگی اور شاعری کی طرف سے اے تصویر غم و مصور الم ، اے لاثانی فن کار ، اے ہماری تہذیب کے ، انسانی شرافت کے ، ہمارے دکھ درد کے نمائندے ، اے درد زندگی کے مترنم ساز ، اے تبسمش تکلمے ، تکلمش ترنمے ، اے انسانی زندگی کے مجبوریوں اور کمزوریوں کو اپنے آنسوؤں سے سینچ کر پاک بنا دینے والے ۔ اے ناز حیات ہماری ڈبڈبائی آنکھوں کا سلام لے ۔ تو ہماری دنیا ہے ۔ ع

دنیا گذر گئی غم دنیا لئے ہوئے

حسرت

(ایک مطالعہ)

زندگی یا شاعری کا ایک دور ختم نہیں ہو چکتا کہ دوسرا دور شروع ہو جاتا ہے امیر و داغ کے دور کے زمانہ ہی میں اگلے دور تغزل کی پیش گوئی یا جھلک جلال، حالی، شاد عظیم آبادی، آسی غازی پوری کی غزلوں میں سنائی اور دکھائی دیتی ہے۔ امیر کی غزل گوئی میں ایک داخلی قسم کی خاموش تبدیلی، ایک نئی نرمی تھی اور سنجیدگی اور تحت النغمہ سوز و ساز جلیل کے ہاتھوں پیدا ہو رہا تھا۔ یہ سب ہو رہا تھا لیکن ابھی فضا پر امیر و داغ ہی کی آواز باز گشت چھائی ہوئی تھی۔ اسی دھند لکے میں جب دونوں وقت مل رہے تھے یا یوں کہیئے کہ جب شاعری کا تبدیل موسم ہو رہا تھا۔ انھی نکلتے پیٹھتے دنوں میں آج سے پچاس برس پہلے حسرت نے ایک نئی دھن میں غزل سرائی شروع کر دی جس میں کچھ وہ پرانی دھنیں بھی ملی ہوئی تھیں جنھیں ہمارے کان بھول چکے تھے۔ اس طرح گویا اردو غزل کی ڈھائی سو برس کی تاریخ میں حسرت کا تغزل ایک نشاۃ ثانیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

انیسویں صدی عیسوی کی آخری دہائی اور خصوصاً بیسوی صدی عیسوی کی پہلی دہائی میں امیر و داغ کے علاوہ جن متغزلین کا نام آیا ہے وہ کسی ایک مدرسۂ شاعری کے نمائندے نہیں ہیں۔ ان سب کے یہاں اگر کوئی صفت عام ہے تو وہ جذباتی خلوص اور سچائی ہے اور تصنع و سطحیت سے احتراز۔ خلوص سب کے یہاں ہے لیکن ایک انفرادی شان اور تیور سے۔ اس سلسلہ میں یعنی غزل کی احیا کے معاملے میں حسرت کے متعلق ایک بات میں ایک عرصہ سے سنتا آیا ہوں

جو غور کرنے پر ٹھیک نہ اترے گی - وہ بات یہ ہے کہ اردو غزل بے جان اور خشک چیز ہو چکی تھی اور حسرت نے آسے پھر سے زندہ کیا - جلال ، حالی ، شاد ، آسی اور جلیل غزل کو مردہ و خشک ہونے سے پہلے ہی بچا چکے تھے حسرت کے تغزل کی قدر و قیمت یہ کہہ کر نہیں بتائی جا سکتی کہ حسرت نے امیر و داغ کے بعد اردو غزل جو مر چکی تھی آسے پھر سے جلا دی - غزل کے حق میں حسرت کی آواز صدائے قم کی حیثیت نہیں رکھتی - حسرت کے تغزل کی سحر کاری بالکل دوسری ہی چیز ہے -

اگر حسرت اور ان کا رنگ تغزل عالم وجود میں نہ آتا تو بھی اردو غزل نئی زندگی کا ثبوت دیتی اور اس میں صدق و خلوص و شعریت آ کر رہتی - عزیز لکھنوی محشر لکھنوی ، نوبت رائے نظر ، فانی ، یاس ، اصغر ، جگر اسی پیش گوئی کی تکمیل ہیں جو جلال و جلیل کی آوازوں میں گونج رہی تھی اور جو شاد ، حالی اور آسی کے نغموں میں واضح ہو چکی تھی - خود حسرت کی غزل بھی انہی نغموں کی ایک پھوٹتی ہو کرن ہے - حسرت اور ان کے ہمعصر ایک ہی قوس قزح کی جھلکیاں اور جھلملاہٹیں ہیں - حسرت کے ہم عمر متغزلین حسرت سے بالکل متاثر نہیں ہیں نہ ان کا تغزل حسرت کی غزل سرائی کا کسی طرح مرہون منت رہے - وہ حسرت سے اور حسرت آن سے بالکل الگ ہیں - میں نے حسرت کی کامیاب تقلید ، ان کے لب و لہجہ کی قریب قریب بجنسہ تکرار ، صرف جلال الدین اکبر اور جلیل قدوائی کے یہاں دیکھی ہے اور یہ دونوں عمر میں حسرت سے اندازاً تیس برس چھوٹے ہیں - جس طرح میر ، ناسخ و آتش ، امیر و داغ کے زمانہ کی قریب قریب پوری شاعری آن آستادوں کی آواز کی پرچھائیں معلوم ہوتی ہے - اسی طرح گذشتہ چالیس پچاس برس کی اردو غزل کسی ایک یا دو استادوں کی آواز کا عکس نہیں ہے - اس دور میں ہر چوٹی کا غزل گو اپنے ہمعصروں سے بالکل الگ ہے اور ذرا بھی متاثر نہیں ہے - آردو غزل اب تقلید و تتبع کی منزلوں سے آگے نکل چکی ہے - صرف زبان و بیان و اسلوب میں نہیں بلکہ جذبات و تخیل و تفکر و ادراک و شعور میں بھی ہر غزل گو کی جداگانہ حیثیت ہے -

ہاں تو جب حسرت کی غزل گوئی نے آنکھ کھوئی تو حقیقی غزل

گوئی کئی انداز سے شروع ہو چکی تھی - پھر حسرت نے کیا کیا ؟ پہلے ان شعرا کی کچھ نغمہ سرائیاں سنئے جو حسرت سے پہلے اردو غزل میں نشاط ثانیہ پیدا کر رہے تھے :-

جلال :-

وہ دل نصیب ہوا جس کو داغ بھی نہ ملا
ملا وہ غمکدہ جس کو چراغ بھی نہ ملا
گئی تھی کہہ کے کہ لاتی ہوں زلف یار کی بو
پھری تو باد صبا کا دماغ بھی نہ ملا

شاد عظیم آبادی :-

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینا اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے
یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

حالی :-

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت درد جگر کہاں

آسی غازی پوری :-

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے او باد صبا
یاد گار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

عبرت گورکھپوری :-

زمانے کے ہاتھوں سے چارا نہیں ہے
زمانہ ہمارا تمہارا نہیں ہے

جلیل :-

نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

دیکھا آپ نے حسرت سے کئی برس پہلے کے متغزلین نے داغ و امیر کی کڑی زمین کو کس طرح نرمانا اور سیراب کرنا اور اس میں نئی کاشت کرنا شروع کر دی تھی۔ غزل کی نشاۃ ثانیہ شروع ہو گئی تھی اور ابھی حسرت نے زبان نہیں کھولی تھی - جب تھوڑے ہی دنوں بعد حسرت کی آواز بلند ہوئی تو اس کے آگے پیچھے یہ نغمے بھی گونج اٹھے :—

فانی بدایونی :—

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات
جب مزاج یار کچھ برھم نظر آیا مجھے

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید
کہ اب کے بوئے کفن دامن بہار میں ہے

یاس :—

ہر شام ہوئی صبح کو اک خواب فراموش
دنیا یہی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی

پیام زیر لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

عزیز لکھنوی :—

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی،
اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

خامۂ قدرت نے دل کا نام یہ کہہ کر لکھا
ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائیں گے

اقبال :—

رہیں عشق میں نہ وہ گرمیاں، رہیں حسن میں نہ وہ شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

نہ بچا بچا کہ تو رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

محشر لکھنوی :—

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں کسی شاخ چمن پہ بار نہ ہو

مدتیں ہو گئی ہیں چپ رہتے
کوئی سنتا تو ہم بھی کچھ کہتے

صفی لکھنوی :—

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

ثاقب لکھنوی :—

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

بینظیر شاہ :—

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مردے نکل گئے
وہ مری جبیں نیاز تھی کہ وہیں دھری کی دھری رہی

بڑی احتیاط طلب ہے وہ جو شراب ساغر دل میں ہے
جو چھلک گئی تو چھلک گئی جو بھری رہی تو بھری رہی

اصغر گونڈوی :—

جو مجھ پہ گذری ہے شب بھر وہ دیکھ لے اے ہمدم
جھلک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری

عارض نازک پہ ان کے رنگ سا اک آگیا
ان گلوں کو چھیڑ کر میں نے گلستاں کر دیا

جگر مراد آبادی :—

یوں زندگی گزار رہا ہوں ترے بغیر
جیسے کوئی گناہ کئے جا رہا ہوں میں

وہ رو رو کے گلے مل مل کے رخصت ہوتے جاتے ہیں
مری آنکھوں کی یارب روشنی کم ہوتی جاتی ہے

ان اقتباسات سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ غزل کی نشاۃ ثانیہ جو جلال سے شروع ہوئی تھی اب ابتدائی منزلوں سے گزر چکی ہے۔ بیسویں صدی کا تغزل اب اپنی پوری جوانی پر ہے یہ کسی اگلے دور کی صدائے باز گشت نہیں ہے۔ اب اسی دور میں حسرت کی وہ نغمہ سرائی سنئے جو انہیں ان کے معاصرین سے صاف الگ کر دیتی ہے اور انہیں نمایاں امتیازی شان بخشتی ہے :—

امید وار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

گرفتار محبت ہوں اسیر دام محنت ہوں
میں رسوائے جہاں آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں

مرے اصرار مضطر میں نہاں تھی میری مایوسی
ترے اقرار آساں سے ترا انکار پیدا ہے

نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
حقیقت کھل گئی حسرت ترے ترک محبت کی
مجھے تو اب وہ پہلے سے بھی بڑھکر یاد آتے ہیں

گنہگار تھے باصفا ہو گئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

رنگ تیری شفق جمالی کا
اک نمونہ ہے بے مثالی کا
آئینہ ہے تبسم لب دوست
حسن خوباں کی بے ملالی کا

حال مجبورئی دل کی نگراں ٹھہری ہے
دیکھنا وہ نگہ ناز کہاں ٹھہری ہے

کیونکر کوئی سنائے انہیں شوق کی وہ بات
جو پڑ گئی ہو کشمکش التماس میں

حسن ہے بے نیاز عشق و ہوس
ہم بھی ناکام ہیں عدو ہی نہیں

آنکھوں کو انتظار سے گرویدہ کر چلے
تم تو یہ خوب کار پسندیدہ کر چلے

اتنی سی شے کا تم سے تقاضا کرے گا کون
دل لے کے ہم سے آنکھ چرانا نہ چاہیئے

روش حسن مراعات چلی جاتی ہے
ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے

دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے
رسم پابندئی اوقات چلی جاتی ہے

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا
گفتگو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

رشک اس طرۂ گیسو پہ ہیں کیا کیا مجھ کو
وہ لٹکتا جو پڑا ہے ترے رخسار کے پاس

تری نوازش پیہم سے ڈر یہی ہے کہ دل
کچھ اور بھی نہ کہیں ناصبور بن کے رہے

اس قدر جلد جو پیمان وفا توڑ دیا
آپ ہی کہیئے بھلا آپ کو زیبا ہے یہی

وہ چپ ہو گئے مجھ سے کیا کہتے کہتے
کہ دل رہ گیا مدعا کہتے کہتے

حسرت کے معاصرین کا جو نمونۂ کلام آپ دیکھ چکے ہیں وہ ولی دکنی و سراج دکنی سے لے کر امیر و داغ تک کسی شاعر کی یاد

نہیں دلاتے ۔ ان معاصرین میں ہر ایک کا رنگ سو فی صدی انفرادی ہے صرف ایک دوسرے کے مقابلے میں نہیں بلکہ پہلے کی بھی تمام غزل گوئی کے مقابلے میں ۔ ہر ایک نے بالکل ذاتی محسوسات اور انفرادی وجدان کو نئے سانچے میں ڈھال کر نئے انداز سے مترنم کر دیا ہے ۔ ان معاصرین کا کلام پڑھ کر کسی اور شاعر کی یاد ھی نہیں آتی ۔ کہیں کہیں اگر پہلے کے کسی شاعر کی پرچھائیں ان معاصرین کے کلام پر پڑتی ہے تو دور سے پڑتی ہے اور وہ بھی کہیں کہیں اور کبھی کبھی لیکن جو اقتباسات میں نے حسرت کے کلام سے پیش کئے ھیں وہ بیان حسن و اظہار عشق میں صاف مصحفی کی یاد دلاتے ھیں ۔ معاملہ بندی اور ادا بندی میں جرأت کی یاد دلاتے ھیں اور داخلی و نفسیاتی امور کی طرف اشارہ کرنے میں عموماً نئی فارسی ترکیبوں کے ذریعے سے مومن کی یاد دلاتے ھیں ۔ لیکن حسرت محض مصحفی ، جرأت و مومن کی آواز بازگشت نہیں ھیں ۔ وہ ان تینوں پیش رووں کے انداز بیان وجدان اور ان کے فن شاعری کی انتہا و تکمیل ھیں یعنی وہ ان تینوں کے رنگ میں ان تینوں سے آگے بڑھ جاتے ھیں ۔ حسرت کے ھاتھوں اردو غزل کے سب سے پر عظمت و بلند نمونوں کی نشاۃ ثانیہ نہیں ھوئی بلکہ مصحفی ، جرأت ، مومن ، کے رنگ تغزل کی نشاۃ ثانیہ ھوئی ۔ مصحفی، جرأت ، مومن ہر ایک کی شاعری میں جو رنگ دبے ھوئے تھے ، ان کے دلوں میں جو چور تھے ان میں جو امکانات چھپے ھوئے تھے وہ سب حسرت کی غزل میں ابھر آئے اور نکھر گئے ۔ مصحفی ، جرأت ، مومن کی شاعری کے وعدے جواب تک تشنۂ تکمیل تھے ۔ حسرت کی غزل میں اس طرح پورے ھو گئے کہ اب اس رنگ کی شاعری میں ترقی کی گنجائش ھی نہیں رہ گئی ۔ یہ بھی یاد رہے کہ حسرت کی کوئی غزل (سوا ان غزلوں کے جو بالا علان جرأت و مصحفی کے رنگ میں کہی گئی ھیں) اس رچاؤ اور سنگار اور اس کمال بیان سے کہہ دینا مصحفی ، جرأت ، مومن کے لئے فرداً فرداً ناممکن سا تھا ۔ ہر ایک کے رنگ میں یا ”تقلید“ میں جو غزلیں حسرت نے کہی ھیں جوں کی توں وہ غزلیں مصحفی ، جرأت ، مومن نہ کہہ پاتے ۔ یہ مشابہت کچھ اسی طرح کی ہے جیسے میر کے بعض ھمعصروں کے کلام کی مشابہت میر کے کلام سے ۔ اگر صبا ، رند اور آتش کے استاد ھوتے تو تینوں کے کلام میں مشابہت کے باوجود آتش کے کلام کی جو امتیازی شان ہے ، وھی امتیازی شان مشابہت کے با وصف حسرت کے کلام میں

بمقابلۂ مصحفی ، جرأت و مومن نظر آتی ہے - یعنی مشابہت ہوتے ہوئے بھی ایک شان برتری - حسرت نے تین چاشنیوں کو ملا کر ایک نیا قوام بنایا ہے - تین رنگوں کو ملا کر ایک رنگ بنایا ہے - حسرت کے یہاں ایسے اشعار بہت ہیں جن میں رنگینی اور البیلاپن اور بندش کی سلاست اور اعتدال مصحفی کی یاد دلاتے ہیں ادا بندی و معاملہ بندی یعنی خارجی نقل و حرکت جرأت کی اور فارسی ترکیبوں کے ذریعہ داخلی اشارے یا نفسیاتی تحلیل و تجزیہ مومن کی یاد دلاتے ہیں - اس لحاظ سے حسرت کے متعلق یہ کہنا انصاف پر مبنی ہو گا کہ وہ اپنے اصلوں سے زیادہ اصلیت کے مالک ہیں - یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حسرت کی غزلوں کا مرکزی رجحان اور بنیادی عنصر وہی ہے جو جرأت کے رنگ تغزل کا ہے اس کے بعد مصحفی اور مومن کے رنگوں کا اضافہ ہوتا ہے - بہر حال حسرت کے ان تین استادوں سے اپنی شاگردی کو ایک الگ استادانہ رنگ دے دیا ہے اگر ان کے یہ تین معنوی استاد مطلع ہیں تو حسرت حسن مطلع ہیں - حسرت کی مندرجہ ذیل غزل پر ایک نظر ڈالئے :-

دل میں کیا کیا ہوس دید بڑھائی نہ گئی
رو برو ان کے مگر آنکھ اٹھائی نہ گئی

ہم رضا شیوہ ہیں تاویل ستم خود کرلیں
کیا ہؤا ان سے اگر بات بنائی نہ گئی

یہ بھی آداب محبت نے گوارا نہ کیا
ان کی تصویر بھی آنکھوں سے لگائی نہ گئی

آہ وہ آنکھ جو ہر سمت رہی صاعقہ پاش
وہ جو مجھ سے کسی عنوان ملائی نہ گئی

ہم سے پوچھا نہ گیا نام و نشاں بھی ان کا
جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

دل کو تھا حوصلۂ عرض تمنا سو انہیں
سر گذشت شب ھجراں بھی سنائی نہ گئی

غم دوری نے کشاکش تو بہت کی لیکن
یاد ان کی دل حسرت سے بھلائی نہ گئی

پہلے شعر میں جرأت کا رنگ صاف جھلک رہا ہے - یہ مجبوری اس شدت احساس کی مجبوری نہیں ہے جو جلیل کے مصرعہ ''وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں'' میں ہے - حسرت کی مجبوری میں جرأت کی شاعری کی گدگدی ہے - دوسرے شعر میں ایک داخلی اور نفسیاتی اشارہ ہے جو مومن کی یاد دلاتا ہے خاص کر تاویل ستم کا ٹکڑا - تیسرے شعر میں مصحفی کا رنگ جھلک رہا ہے چوتھا شعر بھی مومن ھی کی یاد دلاتا ہے نفسیاتی اشارے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی ہنگامہ خیزی ، شرر باری اور گرما گرمی کی وجہ سے ، پانچواں شعر جرأت کے رنگ کو بہت رچا کر پیش کرتا ہے - چھٹا شعر پھر مصحفی کی یاد دلاتا ہے اور مقطعے میں مصحفی و مومن کے رنگوں کا امتزاج نظر آتا ہے -

ایک بات کی طرف حسرت کی غزل کے متعلق بہت کم اشارہ کیا گیا ہے - مصحفی ، جرأت ، مومن کا ذکر تو حسرت پر تنقید کا جزو بن چکا ہے لیکن میر کے ان معاصروں کا ذکر اس سلسلہ میں نہیں کیا جاتا - جن کا اعتدال احساس و اعتدال بیان حسرت نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے مثلاً میر سوز یا شاہ حاتم یا قایئم چاند پوری یا بیدار یا اس دور کے صف دویم کے دوسرے شعرا جو میر و سودا کے مرتبہ کو نہیں پہونچ سکے لیکن بیان کی صفائی سلاست اور روانی میں جن کی شاعری ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے - خود مصحفی کا کلام ان صف دوم کے شعرا کا بہت حد تک ہم نوا ہے اور حسرت کو بھی ان شعرا کا انداز بیان بہت مرغوب تھا - ان شعرا کے یہاں غم عشق وہ بلندالمیہ نہیں بن سکا ہے ، جو میر کے یہاں بن گیا ہے - ان کے یہاں غم ایک ھلکی چٹکی یا میٹھا درد یا دبی چوٹ ہے - ایگ ھلکی خلش ہے ھلکا مسوس اور خفیف سی ٹیس یا کسک ہے - نشاط بھی وہ منزلیں ان کے یہاں طے نہیں کر سکا اور نہ سوز و ساز اپنے اندر پیدا کر سکا - جس کی جھلک سودا کے یہاں ملتی ہے اور جس کی پوری جلوہ گری آتش کے کلام میں نظر آتی ہے -

عام طرز بیان اور طرز احساس کا جہاں تک تعلق ہے - حسرت پر مصحفی جرأت و مومن کا جتنا اثر ہے اس سے زیادہ کہیں زیادہ اور کہیں نمایاں اثران پر میر و سودا کے صف دویم کے شعرا کا نظر آتا

ہے - وہی سادگی ، وہی معصومی وہی آمد کا رنگ وہی بے تکلفی وہی ہلکا پن جو جرأت و مصحفی سے پہلے کے صف دویم کے شاعروں کے یہاں ملتا ہے وہی حسرت کے یہاں بھی ہے ، بلکہ اس دور کے بعد حسرت کے یہاں ملتا ہے - حسرت کی شاعری کے یہ سر چشمے جرأت و مصحفی سے پہلے پھوٹ چکے تھے - سوز حاتم ، قایم ، بیدار کا رنگ تو حسرت اڑا چکے تھے لیکن انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میر کا رنگ وہ نہیں اڑا سکے اور ہار مان کر کہہ دیا کہ :- ''مگر دل میں ہوائے شیو ہائے میر پھرتی ہے'' - حسرت کے کلام میں جو آسان بیانی (Effor Tlen nas) کے ساتھ ساتھ ایک مستقل اور مسلسل گنگناہٹ پائی جاتی ہے وہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ میر و سودا کے ہمعصروں کی آواز بھی اچھی طرح نہیں کھلی وہ حسرت کی غزل کا حسب نسب یعنی اس کے خاندانی سلسلے کو میر و سودا کے نسبتاً کمتر معاصرین سے ملا دیتی ہے مثلاً بیدار کی صرف ایک غزل دیکھئے جس سے حسرت کا تغزل کس قدر مشابہ ہے :-

سبزۂ خط ترے عارض پہ نمودار ہؤا
حیف اس آئینۂ صاف پہ زنگار ہؤا

آج آتا ہے نظر دن مری آنکھوں میں سیاہ
رات تجھ زلف میں دل کس کا گرفتار ہؤا

تجھ بن اے زہرہ جبیں رات مرے گھر کے بیچ
نغمۂ مطرب و نے نالۂ بیمار ہؤا

غم جدا ، درد جدا ، نالہ جدا ، داغ جدا
آہ کیا کیا نہ ترے عشق میں اے یار ہؤا

اس کو کیا کہئے یہ ہے اپنے نصیبوں کا قصور
جتنا چاہا میں اسے اتنا ہی بیزار ہؤا

آج اس راہ سے کون ایسا پریر و گذرا
کہ جسے دیکھتے ہی شیفتہ بیدار ہؤا

بیدار کی ایک اور غزل دیکھئے ایسی ہے کہ حسرت کا کلام چھپائیے اور اسے نکالئے ، حسرت کے یہاں یہ نقش اول نقش ثانی ہو کر عروج کمال کو پھونچ گیا -

هم کلام اس سے میں اک بار نہ ہونے پایا
تھا مرے جی میں سو اظہار نہ ہونے پایا

پھنس گیا پہلے ہی دل زلف میں تیری ظالم
زخمئی غمزۂ خونخوار نہ ہونے پایا

ہجر میں چشم نے رو رو کے بصارت کھوئی
آہ دیدار رخ یار نہ ہونے پایا

تو نے اے شرم کیا پردہ نشیں طفلی سے
گرم اس شوخ کا بازار نہ ہونے پایا

حیف پژمردہ ہؤا غنچۂ دل کھلتے ہی
زیب یک گوشۂ دستار نہ ہونے پایا

آشنا ہجر میں یکدم بھی ترے اے مہ رو
خواب سے دیدۂ بیدار نہ ہونے پایا

یہی وہ رنگ تغزل ہے جسے خود مصحفی نے اپنایا اور جسے انہوں نے غیر معمولی ترقی دی لیکن وہ بھی میر و سودا تک نہیں پہونچ سکے ۔ حسرت نے یہ رنگ تغزل بالواسطہ مصحفی سے نہیں لیا بلکہ براہ راست اس کے اصلی سرچشموں سے لیا اور مصحفی نے جو اسے ترقی دی تھی اسے بھی حسرت نے اپنی غزل کی لپیٹ میں لے لیا ، پھر جرأت اور مومن کے رنگوں کو بھی اس میں ملا دیا ۔ حسرت اردو غزل کی تاریخ میں سب سے بڑے مقلد ہیں لیکن انہوں نے تقلید کو تخلیق بنا دیا ہے ۔ یہاں ایک مسئلہ قابل غور ہے وہ یہ کہ حسرت نے میر و سودا ، غالب و آتش کے رنگ کی تقلید کی ہوتی تو ترقی دینا تو کجا وہ ان استادوں کی غزل کی گرد کو بھی نہ پہونچتے ۔ حسرت کی فطنت (Genius) دویم درجے کی فطنت ہے ۔ اسی لئے وہ دویم درجے کے شعرا کی طرف کھنچے جن کی شاعری میں ترقی و تکمیل کی گنجائش تھی اور حسرت نے یہ ترقی انتہا تک پہونچا دی لیکن وہ انتہا تک پہونچ کر بھی رہی دویم درجے ہی کی شاعری ، یہ معاملہ ایک بات بتانے سے کچھ اور صاف ہو جائے گا ۔ مومن بمقابلہ میر ، غالب و آتش دوئم درجے کے غزل گو ہیں لیکن ان کی دوئمیت کبھی کبھی اولیت کی منزلوں کو چھولیتی ہے مومن عموماً فارسی ترکیبوں کے ذریعہ داخلی و نفسیاتی حقایق کی طرف اشارہ کر جاتے ہیں ۔ ان کے اس کام میں

وسعت ، رنگا رنگی اور ترقی کی گنجائش تھی اور یہ ترقی حسرت کے ہاتھوں ہوئی - لیکن مومن نے ایسے شعر بھی تو کہے ہیں جو انہیں صف اول کے شعرا کا ہم نوا اور ہم مرتبہ بنا دیتے ہیں خواہ وہ کچھ ہی دیر کے لئے ہو -

خدا کی بے نیازی آہ مومن
ہم ایمان لائے تھے جور بتاں سے

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم توکل خواب عدم میں شب ہجراں ہونگے

ایسے اشعار کے سامنے تقلید و تکرار کی دال نہیں گلتی اور حسرت نے ایسے اشعار نہ کہے نہ کہہ سکتے تھے - یہ بھی ہے کہ مصحفی نے بڑے اشعار اور جرأت کی معاملہ بندی و ادا بندی کی نادر ترین مثالیں بھی ایسے کارنامے ہیں جن میں ترقی کی گنجائش نہیں ہے اور جہاں تک حسرت پہونچ سکے - خیر یہ تو کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ کسی کا بھی بہت اچھا شعر ، کہنے والے یہی کا حصہ ہوتا ہے اور وہ مشترکہ ملکیت ہو ہی نہیں سکتا - حسرت ایک ایسے دور شاعری میں پیدا ہوئے جب ان کے مشہور معاصرین میں سے کسی نے تقلید اور نقالی ، کسی بڑے سے بڑے شاعر کی نہیں کی جب اردو غزل تقلید یا تتبع سے بالکل پاک صاف ہو رہی تھی - اسی دور میں حسرت نے ایسی تقلیدی شاعری کی جس کی مثال نہ اب تک نظر آئی نہ پھر آئے گی - لیکن یہ تقلید اتنی خلاقانہ ہے - اس میں وہ جادو وہ موہنی ہے اس کے پرانے پن میں اتنا نیا پن ہے کہ یہ کہنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ حسرت کی حیثیت ان کے معاصرین میں کسی سے کم ہے - بہ حیثیت مجموعی اور نفس شاعری کے لحاظ سے اگر وہ کسی سے کم ہیں تو

میر ، آتش اور غالب ھی سے کم ھیں - اور کسی سے نہیں -

میں نے کہاں سے نفس شاعری کا ذکر کر دیا ؟ لیکن اب تو زبان قلم سے یہ بات نکل گئی - میں نے حسرت کے منتخب اشعار کا اقتباس دینے سے پہلے ان کے معاصرین کے منتخب اشعار دیئے ھیں ان میں بہت سے اشعار ایسے ھیں جو جہاں تک نفس شاعری کا تعلق ہے حسرت کے اشعار سے بہتر ، زیادہ حقیقی اور زیادہ پر تاثیر ھیں - کچھ اور اشعار معاصرین حسرت کے لیجئے :-

ثاقب لکھنوی :-

چل اے ھمدم ذرا ساز طرب کی چھیڑ بھی سن لیں
اگر دل بیٹھ جائے گا تو اٹھ آئیں گے محفل سے

نا معلوم :-

اور کچھ باتیں کرو اے ھم صفیران چمن
یہ نہ پوچھو کیوں قفس میں مجھ کو آرام آ گیا

بہزاد لکھنوی :-

آ مری کائنات دل میری بہار زندگی
آ ، کہ میں یہ نہ کہہ سکوں مجھ کو خدا نہ مل سکا

شاد عظیم آبادی :-

اے دل مدعا طلب وقت سوال بھی تو ھو
ھم کو بھی نام یاد ہے اپنے گدا نواز کا

عبرت گورکھپوری :-

پوچھو مجھے کہ دھر میں اک کس مپرس ھوں
دیکھو مجھے کہ ھیچ ھوں سب کی نگاہ میں

یاس :-

سمجھتے کیا تھے مگر سنتے تھے فسانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا

جوش ملیح آبادی :-

سمجھے گا اس کا درد کون شورش کائنات میں
تو نے جسے مٹا دیا پردۂ التفات میں

نا معلوم :-

تری آنکھوں سے یہ آنسو کا ڈھلکنا توبہ
میں نے گرتی ہوئی کونین کی قیمت دیکھی

نا معلوم :-

خدا جانے یہ کیسی رہ گذر ہے کس کی تربت ہے
وہ جب گزرے ادھر سے گر پڑے کچھ پھول دامن سے

اختر شیرانی :-

اک محبت تھی مٹ گئی یارب
تیری دنیا میں اب دھرا کیا ہے

کس خاتون کا شعر ہے :-

بے تمہارے میں جی گئی اب تک
تم کو کیا خود مجھے یقین نہیں

جگر بریلوی :-

تم نہیں پاس کوئی پاس نہیں
اب مجھے زندگی کی آس نہیں

اشرف مرحوم :-

ہو لبوں پر تری تصویر ہے سینے سے لگی
کفر آیا ترے وحشی کو نہ اسلام آیا

اس طرح کے اشعار مزاج اور وجدان کو جس طرح متاثر کرتے ہیں حسرت کے اشعار اس طرح متاثر نہیں کر سکتے - لیکن حسرت کا مکمل کارنامہ اور ان کی مجموعی حیثیت اپنے کو منوا کر رہتے ہیں -

حسرت نے دویم درجے کی شاعری کو قدر اول کی چیز بنا دی ۔ ان کی گلنار شاعری کاغذی پھول نہیں ہے بلکہ ایک سدا بہار اور سدا سہاگ چیز ہے ۔

حسرت نے تین قسم کی غزلوں کا ذکر کیا ہے ۔ فاسقانہ ، شاعرانہ اور عاشقانہ حسرت کی مراد یہ ہے کہ مثلاً داغ ، امیر ، ریاض کی اکثر غزلیں فاسقانہ ہیں ۔ یگانہ یا جگر کی غزلیں عموماً شاعرانہ ہیں ۔ میر سوز ، بیدار ، جرأت ، مومن کی زیادہ سے زیادہ غزلیں اور خود حسرت کی سو فیصدی غزلیں عاشقانہ ہیں ۔ یوں تو اچھی خاصی تقسیم ہے ۔ لیکن جہاں تک عاشقانہ غزل کا تعلق ہے ، مندرجہ ذیل سب اشعار عاشقانہ غزل کے تحت میں آتے ہیں :۔

غالباً جرأت :۔

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

داغ :۔

وہ کہہ رہے ہیں مجھ سے مری مان جائیے
اللہ تری شان کے قربان جائیے

نا معلوم :۔

ہاں ہاں تمہارے حسن کی کوئی خطا نہ تھی
میں حسن اتفاق سے دیوانہ ہو گیا

انور دہلوی :۔

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے
پسینا پوچھئے اپنی جبیں سے

نظام رامپوری :۔

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ

حسرت کا پورا کلام ، اس مضمون میں انتخاب دیکھ لیجئے - حسرت کے معاصرین سے جو انتخاب اس مضمون میں دیئے گئے ھیں ان کے بھی قریب قریب سب اشعار نہ فاسقانہ ھیں نہ محض شاعرانہ ھیں بلکہ سو فیصدی عشقیہ ھیں - مومن کے جو اشعار کچھ پہلے نقل کر چکا ھوں انھیں بھی دیکھیں - اب ذرا یہ عشقیہ اشعار بھی دیکھئے :-

میر :-

جفائیں دیکھ لیاں کج ادائیاں دیکھیں
بھلا ھؤا کہ تری سب برائیاں دیکھیں

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ھم
سو اس عہد کو ھم وفا کر چلے

وجہ بیگانگی نہیں معلوم
تم جہاں کے ھو واں کے ھم بھی ھیں

سودا جو ترا حال ھے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تونے اسے کس آن میں دیکھا

دکھلائے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
گاھک نہیں واں کوئی مگر جنس گراں کا

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ھے سودا
ساغر کو مرے ھاتھ سے لینا کہ چلا میں

آتش :-

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ھوئے
میں جا ھی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

مرا پیام صبا کہیو میرے یوسف سے
نکل چلی ھے بہت پیرھن سے بو تیری

نسیم صبح سے مرجھایا جاتا ھوں وہ غنچہ ھوں
وہ گل ھوں میں جسے شبنم بلائے ناگہانی ھے

خراب مٹی نہ ھو کسی کی کوئی نہ مردود دوستاں ھو
جدا ھوا شاخ سے جو پتا غبار خاطر ھؤا چمن کا

غالب :-

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہؤا ہوگا
قیامت ہے سر شک آلود ہونا تیرے مژگاں کا

تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

اب آپ نے دیکھ لیا کہ عشقیہ غزل ایسی بھی ہو سکتی ہے جسے خود حسرت اپنی شاعری کے لئے باعث ننگ سمجھتے اور ایسی بھی عشقیہ غزلیں کہی گئی ہیں جہاں تک حسرت کی رسائی نہیں - میر ، غالب ، آتش کو جانے دیجئے - سودا کے جو اشعار ابھی آپ نے پڑھے - کچھ مومن کے اشعار بھی اور معاصرین حسرت کے وہ عشقیہ اشعار جو اس مضمون میں درج ہیں - جہاں تک عاشقانہ غزل میں نفیس شاعری کا تعلق ہے - وہ حسرت کی بہترین غزلوں کے بہترین اشعار سے بہ ہر لحاظ بہتر اور بلند ہیں - لیکن اس بر تر ہئیت کے باوجود حسرت کے کلام کی دلکشی میں مطلق کمی نہیں پیدا ہوتی - شاعرانہ اور عاشقانہ غزل کی تقسیم کہیں کہیں بیکار ثابت ہوتی ہے مثلاً ان اشعار میں :-

غالب :-

کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

تیرے قد رعنا سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

سودا :—

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ھے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اصغر :—

ھاتھ میں اس نے جام مے لیکے جو مسکرا دیا
عقل کو سرد کر دیا روح کو جگمگا دیا

ایسے اشعار میں شاعرانہ اور عاشقانہ غزل گوئی کا سنگم ملتا ھے۔ جذبات کی سچی مصوری ھے لیکن ربط خیالات یا تنوع تصور ایسے اشعار کو بیک وقت عاشقانہ و شاعرانہ بنا دیتے ھیں۔

کہی ھوئی بات پھر دھرانی پڑتی ھے۔ حسرت کے نزدیک میر ، سودا ، غالب ، آتش اور بیشتر غزل گو شعرا نے معشوق سے بات چیت کرنے تک غزل کو محدود نہیں رکھا۔ اس موضوع تک غزل کو محدود رکھا۔ یعنی غزل کو غزل رکھا ، میر و سودا کے ان معاصرین نے جو صف دویم کے شعرا ھیں۔ یقین نے ، سوز نے بیدار نے اور اسی سطح کے دوسرے شعرا نے جنھوں نے حسرت کے نزدیک صحیح معنوں میں غزل کو "شرک" سے بچائے رکھا۔حسرت معاملہ بندی ، ادا بندی یا خالص جذباتی شاعری کو بے آمیزش غزل گوئی سمجھتے تھے اس لحاظ سے صف دویم کے متقدمین کے بعد یعنی سو برس سے زیادہ کے بعد حسرت ھی نے غزل کو پھر سے زندہ کیا۔ غزل کے اس محدود معنی میں حسرت اپنے دور کے تنہا غزل گو ھیں۔ انہوں نے صف دویم کے متقدمین کے رنگ تغزل کو اتنا چمکایا اسے ایسی ترقی دی اسے اس منزل تک پھونچا دیا کہ اس سے بڑھ کر اس محدود معنوں میں غزل کہنے کا دعویٰ کرنا عجیب بات ھے۔ حسرت کی زبان اور ان کے اسلوب حسرت کی لغت یا انتخاب الفاظ کے بارے میں ایک بات تو یہ کہہ دینا ضروری ھے ، کہ جس نرمی ، حلاوت ، روانی یا بے لاگ طریقے سے اور جس کثرت سے فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبیں ان کی غزلوں میں ملتی ھیں اس کی دوسری مثال شاید کہیں اور ملے۔ اردو شاعروں کے یہاں "فارسیئت" مختلف انداز اور مختلف

پہلوؤں سے جلوہ گر ہوئی ہے - لیکن جس خاموش اور نرم انداز سے فارسیئت حسرت کے اسلوب میں سیر و شکر ہو گئی ہے وہ ایک مثالی چیز ہے - لیکن آردو لغت کا وہ حصہ جو ہندی الفاظ ، محاوروں اور فقروں پر مشتمل و مبنی ہے اس کے بلند ترین یا بہترین امکانات حسرت کے ہاتھوں پورے نہیں ہوئے - آردو کی اردویت کی کچھ بہترین مثالیں یہ ہیں :-

میر :-

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
وہ سو گیا ہے ہاتھ سرہانے دھرے دھرے

غالب :-

بوجھ وہ سر سے گرا ہے جو اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

ذوق :-

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

جلیل :-

مان لیتا ہوں تیرے وعدے کو
بھول جاتا ہوں میں کہ تو ہے وہی

حالی :-

دکھانا پڑے گا آسے زخم دل
اگر تیر اس کا خطا ہو گیا

داغ :-

ہماری طرف اب وہ کم دیکھتے ہیں
وہ نظریں نہیں جن کو ہم دیکھتے ہیں

امیر :—

ضبط کرنا دل خریں نہ کہیں
چوٹ لگ جائے گی کہیں نہ کہیں

جلال :—

وہ تو وہ تصویر بھی ان کی جلال
کہتی ہے تم بات کے قابل نہیں

نا معلوم :—

آئینہ ان کا ٹوٹ گیا میرے ھاتھ سے
میں ان کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رھا

آرزو :—

تارا ٹوٹتے سب نے دیکھا ، یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی
کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا ، کس کا سہارا ٹوٹ گیا

یاس :—

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ھار گئے
اسی زمین میں دریا سمائے ھیں کیا کیا
بلند ھو تو کھلے تجھ پہ زور پستی کا
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ھیں کیا کیا

یا اسی مضمون میں حسرت کے علاوہ جن شعرا کا انتخاب کلام درج ہے ان اشعار میں سانچے میں ڈھلی ھوئی اردو کے نمونے دیکھئے -

ایسے اشعار اردو میں ہزار ھا ھیں اور بلند ترین شاعری کے نمونے ھیں - ان میں جہاں فارسی الفاظ آگئے ھیں وہ نیم خواندہ اور اکثر بے پڑھے لکھے بھی جانتے ھیں - فارسی الفاظ ایسے اشعار میں بیان اور اسلوب پر حاوی نہیں ھو جاتے - حسرت کا قریب قریب پورا کلام فارسیت کے رنگ میں رنگا ھؤا ہے - لیکن یہ فارسیت ان کے یہاں بہت

حسین اور دلکش اور تصنع سے بالکل بری ہے پھر بھی یہ فارسئیت حسرت کی آواز کو مرکزی آواز یا صدائے خلق ہونے سے باز رکھتی ہے - حسرت کے سب تو نہیں لیکن بہت سے اشعار کی زبان ہندوستان میں کسی کی زبان نہیں ہے - وہ صرف حسرت کی زبان ہے - جو لوگ اسے سمجھتے ہیں اور اس سے لذت اندوز ہوتے ہیں وہ بھی اس کی انفرادیت کا احساس کرتے ہیں - یہ نہیں کہ حسرت کے کئی اشعار زبانوں پر چڑھ نہ گئے ہوں ، ایسے اشعار پر فارسئیت حاوی نہیں ہے - لیکن ان کے زیادہ تر اشعار پر فارسئیت حاوی ہے - لیکن گراں نہیں گزرتی - بلکہ اس کی شیرینی ، شگفتگی دعوت گوش و نظر اور دعوت کام و دھن دیتی ہیں - حسرت کی فارسئیت میں ایک خاص دلکشی ہے لیکن اس سے بہتر فارسئیت کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے اور اردو کے کچھ اور شعرا کے یہاں اس کے نمونے بھی ملتے ہیں - میں دوسروں کے یہاں سے کچھ ٹکڑے دیتا ہوں - (۱) آتش—تار تار پیرھن—(۲) غالب —جگر لخت لخت—(۳) یاس—اشارۂ توفیق غائبانہ—(۴) پھر آتش ہی کا یہ مصرعہ—جدا ہو شاخ سے جو پتہ ''غبار خاطر'' ہوا چمن کا - (۵) اصغر—''اک شرار معنوی'' گردش میں ہے اصغر—فارسئیت کے ایسے نمونے فارسی الفاظ کے ایسے استعمال حسرت کی فارسئیت سے زیادہ بلند تر ، شاعرانہ اور پر تاثیر ہیں - حسرت کی فارسئیت کچھ متقدمین اور زیادہ تر مومن کی فارسی ترکیبوں کی تقلید میں ہے اور یہاں حسرت صف دویم کے متقدمین اور مومن سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں— ایسی فارسئیت حسرت سے فن کا ایک مستقل جزو یا عنصر بن گئی ہے - یہ ایک زیر لب فارسئیت ہے - اس کی صوت زیر لبی اسے ایک خاص دلکشی عطا کرتی ہے -

حسرت کی صوتی نرمی ، سلاست ، روانی ، حلاوت ، حسن بندش کی طرف توجہ جانا لازمی ہے—حسرت کی ادا میں روانی ایک نرم بہاؤ ہے ، ایک آہستہ روی ہے ، ایک گنگناہٹ ہے جو کم از کم مجھے بیک وقت داد دینے پر بھی مجبور کرتی ہے اور نا آسودہ بھی چھوڑتی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ وہ عشقیہ جذبات کو صرف چکھتے ہیں انہیں روحانی غذا نہیں بناتے -

دیکھنا بھی تو انہیں دور سے دیکھا کرنا

''انہیں'' کا لفظ حسرت معشوق کے لئے لائے ھیں - لیکن دور سے دیکھا کرنا یہ عمل وہ جذبات کے ساتھ بھی کرتے ھیں یعنی جذبات کو بھی دور ھی سے دیکھتے ھیں مشہور شاعر و نقاد آرنلڈ کہتا ھے کہ آفاق شعرا انسانی جوش و جذبہ کو بیچ سے بھینچ لیتے ھیں - (They clasp the human pessions bueast high) حسرت یہ نہیں کر پاتے - ایک بار حسرت کی غزل کے محاسن کے متعلق پھر ان الفاظ کو دھراتا ھوں جو میں نے ابھی استعمال کئے ھیں - نرمی ، سلاست ، روانی ، حلاوت ، حسن بندش ، آھستہ روی—بڑے خوبصورت الفاظ ھیں اور بڑے خوبصورت صفات کو ظاھر کرتے ھیں - لیکن یہ پر عظمت عشقیہ شاعری کے لئے یہ الفاظ کتنے نا کافی ھیں اگر کہا جاتا ھے کہ مصحفی نے پھر آتش نے پھر شاگردان آتش یا خاندان آتش نے زبان و بیان کی صفائی کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی - لیکن اس کار خیر میں صرف آتش اپنے کلام کے اھم ترین حصے کو دویم درجے کی چیز ھونے سے بچا سکے اور سب دویم درجے کے نہایت خوش گو شاعر ھو کر رہ گئے - حسن بندش روانی یہاں تک کہ ترنم اور نغمگی بھی پر عظمت شاعری کی سب سے نمایاں صفات نہیں ھیں - پر عظمت شاعری میں بہت کچھ اور بھی ھوتا ھے - اگر ان صفات کو شاعری میں سب سے زیادہ اھمیت یا اولیت کا مقام دے دیا جائے تو اس سے جس شاعری کی تخلیق ھو گی وہ رھے گی قدر دویم ھی کی چیز -

اگر بر سبیل تذکرہ اپنی بات کہنے کی مجھے اجازت ھو تو میں یہ کہوں گا کہ میں نے حسرت سے بہت کچھ سیکھا ھے ، بہت کچھ پایا ھے ، بہت کچھ اثر لیا ھے - حسرت ھی سے متاثر ھو کر ایسی ترکیبیں اپنی غزلوں میں لا سکا ھوں جیسے (۱) جنبش سکون نما (۲) یقین شک نما (۳) شکوۂ درگزر نما (۴) تغافلہائے پنہاں (۵) فریب ھمت افزائی (۶) شوخیٔ محتاط (۷) التفات سرگراں (۸) ادائے کوشش اخفائے رنگ و بو - اور اسی قسم کی کئی اور فارسی ترکیبیں—میں پرستاران حسرت میں اپنے کو کسی سے پیچھے نہیں سمجھتا - اور یہ تو کہہ ھی چکا ھوں کہ حسرت اگر کسی سے کم ھیں تو وہ صرف میر ، آتش اور غالب سے -

میر کی نہیں لیکن میر کے زمانہ کی غزل گوئی اور اس کی وہ صفت

جیسے میں نے گنگناہٹ کہا ہے ، جرأت کی معاملہ بندی اور ادا بندی ، مصحفی کا دلکش اعتدال سلاست و روانی اور احساس رنگ (Colour Sense) اور مرنجا مرنج انداز سے ترس کر رہ جانے والی کیفیت (Tantitia) پھر مومن کی فارسی ترکیبوں کے ذریعہ سے حسن و عشق کی نفسیاتی و داخلی کیفیتوں کی عکاسی ان تمام اجزائے ترکیبی سے جیسی غزل گوئی ممکن ہے حسرت اس طرح کی غزل گوئی کے سب سے بڑے شاعر ہیں - اس رنگ میں حسرت کے بہترین اشعار الہامی ہیں - اور ان کا کلام ایسی غزل گوئی کے حق میں حرف آخر کا حکم رکھتا ہے - حسرت کے معاصرین بلکه ہر دور کے اچھے متغزلین سب کی شاعری میں وہ چیز موجود ہے - جسے ہم رس کہتے ہیں - لیکن اُردو غزل کی تاریخ حسرت سے زیادہ یا حسرت کے برابر رسیلی شاعری ہرگز کہیں اور نہ ملے گی - میر سوز اور اُن کے ہمنواؤں کے ہاتھوں جس طرح کی اُردو غزل نے جنم لیا تھا حسرت نے اُسے کنیا سے کامنی بنا دیا - اور یہ کام ایک پیدائشی فنکار عظیم (Born master) ہی کا کام تھا - یہ شاعری قدر اول سے ذرا اُتری ہوئی سہی لیکن یہ کارنامہ قدر اول کی چیز ہے - حسرت کے کلام میں ایک ایسی صفت ہے جو اُن کے معاصرین میں نہیں ہے یعنی وہ صفت جسے اہل لکھنؤ مزہ کہتے ہیں - حسرت کے کلام میں باسی پن شاید پیدا ہو ہی نہیں سکتا -

تو ہم کیا سمجھیں ؟ حسرت کو نشاطیہ شاعر سمجھیں یا المیہ - بلند نشاطیہ یا بلند المیہ تو نہیں لیکن ایک طربیہ صفت حسرت کی غزل میں ضرور رچ اٹھی ہے جس میں ایک حزن خفی کا عنصر بھی گھلا ملا ہؤا ہے - ان کی غزل میں ایک ذہنی گدگدی ، ایک داخلی چھیڑ چھاڑ ایک حسین چھل ایک راس لیلا کا انداز اور راس لیلا کی گلنار فضا ، ایک بے نیازانہ لگاوٹ جس میں فقر و قلندری کی صفت کے ساتھ ساتھ جرأت کی ''چوما چاٹی'' بھی شامل ہے یہ ہے وہ رومانی طربیہ جس کی تخلیق حسرت کے شعور و شاعری نے کی - عجب کیا کہ کرشن کی راس لیلا سے جو حسرت کے مزاج و وجدان کو ایک فطری مناسبت تھی وہی متعدد بار کشاں کشاں انہیں جنم اشٹمی کے موقعوں پر برندا بن اور برسانے تک کھینچ لے جاتی تھی - حسرت کے کلام

اور ان کے معاصرین بلکہ میں تو کہوں گا کسی بھی اور غزل گو کا کلام پڑھ کر ہم یہ بات صرف حسرت کے متعلق کہہ سکتے ہیں ''کیا خوب آدمی تھا'' - اس شخص نے اپنے قلم سے ایسا پھاگ کھیلا ہے کہ ''ھولی ہے'' کی آوازیں فضا میں ہمیشہ گونجتی رہیں گی - حسرت کی غزل ایک نہایت تربیت یافتہ اور رچا ہؤا ٹھٹھول ہے - تلخی ، سمیت ، زندگی سے بیزاری خشونت جو کبھی کبھی بہمیت کا رنگ اختیار کر لیتی تھی ، معشوق سے جذبۂ انتقام ، ناگوار شکوہ و شکایت ، گلا گھونٹ دینے والا احساس ناکامی ان تمام برائیوں سے حسرت نے اردو غزل کو پاک کر دیا - خاص کر شکوہ و شکایت کی ناگوار روایت کو انتہائی خوشگوار اور رنگین روایت بنا دیا - حسرت کی جبین شاعری پر کوئی بل یا شکن نہیں انہوں نے کاروبار حسن و عشق میں بد معا ملگی کا مرتبہ دے دیا - اردو غزل کی یہ رنگین مزاجی تنہا حسرت کا عطیہ ہے - فضاء غزل میں گلال اڑ رہا ہے - حسرت کے باغ میں ہمیشہ بسنت رت کا گلنار سماں رہتا ہے - یہ اور بات ہے کہ جاندادہ بہار قلوب نغمہ بہار سے سیر ہو کر ایسا نغمہ بھی سننا چاہیں - مثلاً :-

عبرت گور کھپوری :-

کیا ڈھونڈھتی ہے باغ میں میرے تو اے خزاں
تو جانتی ہے سب کے چمن میں بہار ہے

یا (نا معلوم) :-

اور کچھ باتیں کرو اے ہم صفیران چمن ،
یہ نہ پوچھو کیوں قفس میں مجھ کو آرام آ گیا

یا غالب :-

قفس میں مجھ سے رو داد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یا ناسخ :-

جنوں پسند بھی کیا چھاؤں ہے ببولوں کی
عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

یا آتش :—

نسیم صبح سے مرجھایا جاتا ہوں وہ غنچہ ہوں

وہ گل ہوں میں جسے شبنم بلائے آسمانی ہے

یا صبا :—

باغباں بلبل کشتہ کو کفن کیا دیتا

پیرہن گل کا نہ آترا کبھی میلا ہو کر

یا جلال :—

جلال باغ جہاں میں وہ عندلیب ہیں ہم

چمن کو پھول ملے ہم کو خار بھی نہ ملا

یا حفیظ جونپوری :—

بیٹھ جاتے ہیں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

یا میر :—

رنگ گل و بوئے گل ہوتے ہیں ہوا دونوں

کیا قافلہ جاتا ہے تو بھی جو چلا چاہے

یا میر ہی کا یہ مصرع :— اب کے بھی دن بہار کے یونہی گزر گئے

یہ ہے بہار کا المیہ بلکہ کئی لحاظ سے زندگی کا المیہ۔ حسرت کے یہاں جو چیزیں کم ہیں۔ وہ ہیں بلند تر سنجیدگی (Higher Seriousness) آفاقیت ، گہرائی ، عظمت ، بلندی ، بلند ہیجان (High Passion) کمیاب یا نادر اعلیٰ لمحات (Supreme moments) احساس لا محدود ، خوابناکی عمیق رمزیت ، استعجاب ، معاملہ بندی سے ماورا حسن و عشق کا مجرد تصور و وجدان نشاط و الم کی وہ آخری منزلیں جہاں تعین کے پردے آٹھ جاتے ہیں۔ کلام حسرت کے صوتیات میں جو ایک رفاقت ہے وہ ان کے تخیل اور شعور میں بھی ہے۔ حسرت کی شاعری میں رگ پٹھے (Muscles) کی کمی ہے۔ ان کی

آواز میں ٹھوس پن (Body) نہیں ہے یعنی ان کی آواز بھر پور نہیں ہے ان کی آواز تحت الہجہ (Undertone) ہے یعنی گنگناہٹ ہے ۔ یہ زیر لب تکلم ابھر نہیں پاتا ۔ ان کے کلام میں بلند فکریات کی کمی کھٹک جاتی ہے ۔ حسرت کے مزاج میں اھٹ آسان سپردگی ہے ۔ وہ عاشقانہ اور شاعرانہ ھٹھ یا ضد ان کے یہاں نہیں جس کا تقاضا یہ ہوتا ہے ۔ ''یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں'' ۔ ان کے وھاں وہ روح فرسا انتشار نہیں ہے جو بحرانی کیفیت پیدا کر دے ۔ ان کی قلندرانہ روا داری وہ تناؤ اور کھنچاؤ ان کے شعور میں پیدا نہیں ہونے دیتی اس کرب سے انہیں محروم رکھتی ہے جس کے بغیر بلند عشقیہ شاعری نا ممکن ہے ۔ حسرت مرنجاں مرنج انسان ، مرنجاں مرنج عاشق ، مرنجاں مرنج شاعر ہیں اور بلند ترین شاعری مرنجاں مرنج چیز نہیں ہے ۔ ایسی شاعری کی مانگیں آسان نہیں ہوتیں ۔ آفاقی شاعر خود بھی ھفت خواں طے کرتا ہے اور کائنات سے بھی ھفت خواں طے کرانے کے بعد کائنات سے بغلگیر و ہم آھنگ ہوتا ہے ۔ بڑی شاعری کائنات و حیات کے ساتھ جلد یا آسانی سے سمجھوتا نہیں کرتی ۔ شاعری بلند ترین سفارت و تدبر ہے حیات و کائنات کی سیاست نہیں ۔ پھر بھی ان کے کلام کی نیم تہہ داری ان کی قدرے لپٹی ہوئی آواز اور ان کی فطرت کی ایک بے نیازانہ شان میں ایک دل کشی ضرور ہے ۔ جن چیزوں کی ان کے یہاں عموماً کمی ہے وہ گنوائی جا چکیں ۔ یہی وہ باتیں ہیں جو حسین ترین غزل گوئی کے باوجود انہیں میر ، آتش و غالب سے پیچھے رکھتی ہے لیکن بہت پیچھے نہیں رکھتیں کون ہے جو حسرت کو اس دور کا سب سے بڑا غزل گو اور اردو غزل میں صف اول کے غزل گو شعرا کا کئی لحاظ سے ہم نوانہ مانیگا ۔

عملی حیثیت سے حسرت کا کردار اردو کے بڑے سے بڑے شعرا سے بلند ہے لیکن عاشق کی حیثیت سے وہ اردو کے بلند ترین غزل گو شعرا کے احساسات و تجربت ہمیں کم دیتے ہیں ۔ ان کی زندگی اول درجے کی ہے ان کی عاشقی اور عشقیہ شاعری بہت حسین بہت پر خلوص بہت سی خوبیوں کی حامل ہے مگر اس میں آفاقیت کم ہے ۔ حسرت کی شاعری کی جبین پر کوئی شکن نہیں ، یہ سچ ہے لیکن اس جبین شاعری پر وہ تیور بھی نہیں ہے اس پر وہ جگمگاھٹیں اور پرچھائیاں

بھی نہیں پڑتیں جو خلافت کائنات یا پیغمبری کی نشانی ہیں ۔ ان کی عشقیہ غزل اگر ہمارے کلیجے کا ٹکڑا نہیں ہے ، پھر بھی کلیجے سے لگائے رکھنے کی چیز ضرور ہے حسرت کی غزل گوئی بھلا دی جانے والی چیز نہیں ہے ۔ ہمیشہ گونجتی رہنے والی چیز ہے ۔ اگر میر ، حسرت کی غزل پر اظہار رائے کرتے تو اُسے چوما چاٹی نہ کہتے ۔ وہ جہان عشق کا ذکر کر کے شاید حسرت سے یہ کہتے کہ :-

سر سری تم جہان سے گزرے
ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا

ہاں تو حسرت کی صدائے زیر لبی بڑے بول اور بلند آہنگی سے کئی لحاظ سے زیادہ قیمتی چیز ہے ۔ حسرت کی شاعری دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ''ایں سعادت بہ زور باز و نیست'' اس میں وجدان کے وہ نوازشات غیبی موجود اور مضمر ہیں جو اردو کے آنے گنے شعرا کو ہی نصیب ہوتی ہیں ۔ مزاج کی یہ تہذیب یا کلچر کردار کی یہ سجاوٹ اور رچاؤ ہر متمدن ادب کے بہترین حصے ہی میں ہمیں ملے گا ۔ حسرت کے یہ وجد آور اشعار اپنا جادو کس سے نہیں منوالیں گے ۔

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الٰہی ترک الفت پر وہ کیونکر یاد آتے ہیں
نہیں آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

آپ کو اب ہوئی ہے قدر وفا
جب کہ میں لائق جفا نہ رہا

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

رونق پیرہن ہوئی خوبیٔ جسم ناز میں
اور بھی شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

یا ہماری ہی یہ قسمت ہے کہ محروم ہیں ہم
یا مگر ان کی محبت کا نتیجہ ہے یہی ،

شوق جب حد سے گزر جائے تو ہوتا ہے یہی
ورنہ ہم اور کرم یار کی پروا نہ کریں

حسن نے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

اے عشق کی گستاخی کیا تو نے کہا اُن سے
جس پر انہیں غصہ ہے انکار بھی حیرت بھی
خود عشق کی بیباکی سب تجھکو سکھا لے گی
اے حسن حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی

کسی پر مٹ کے رہ جانا ہے حسرت
ہمیں کیا کام عمر جاوداں سے

میں کس دن ترے کوچے سے گزارا نہ کیا
تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے
میری تحریر ندامت کا نہ دیجے کچھ جواب
دیکھ لیجے اور تغافل آشنا ہو جائیے
مجھے تنہائی میں جب ملئے تو دیجے گالیاں
اور بزم غیر میں جان حیا ہو جائیے
ہاں یہی میری وفائے بے اثر کی ہے سزا
آپ کچھ اس سے بھی بڑھ کر پر جفا ہو جائیے
جی میں آتا ہے کہ اس شوخ تغافل کیش سے
اب نہ ملئے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

ھائے اے بے اختیاری یہ تو سب کچھ ہو مگر
اس سراپا ناز سے کیونکر خفا ہو جائیے

رنگ سوتے میں چمکتا ھے طرحداری کا
طرفہ عالم ھے ترے حسن کی بیداری کا

برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ھے
ہم نے اس شوخ کو مجبور حیا دیکھا ھے

کیونکر کوئی سنائے انہیں شوق کی وہ بات
جو پڑ گئی ہو کشمکش التماس میں

اک مرقع ھے حسن شوخ ترا
کشمکشہائے نو جوانی کا

جب آن سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا
تو اک پیکر التجا ہو گئے ہم

وہ خواب ناز میں تھے اور نہ تھے اے شوق پابوسی
نہ سمجھی پستیٔ ہمت تری اس لطف ایما کو

وفور اشک پیہم سے ، ہجوم شوق بے حد میں
مری آنکھوں سے ھے اک آبشار آرزو جاری

حسن جب تک رہا نظارہ فروش
صبر کی شرم ساریاں نہ گئیں

سعیٔ احباب کو ناحق ھے رہائی کا خیال
اور ہی کچھ ھے تمنا ترے زندانی کی

دشمن کے مٹانے سے مٹا ہوں نہ مٹوں گا

اور یوں تو میں فانی ہوں فنا میرے لئے ہے

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں

مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

حسرت تری نگاہ محبت کو کیا کہوں

محفل میں رات ان سے شرارت نہ ہو سکی

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں

ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

عشق میں جان سے گزر جائیں

اب یہی جی میں ہے کہ مر جائیں

حسرت کی شاعری کے چہرے پر ایک ایسی سرخی ہے جو شاید ہی کسی اور غزل گو کے چہرۂ شاعری پر نظر آئے اور یہ سرخی چہرہ کو خوبصورتی ہی نہیں دیتی بلکہ اس میں وہ دل آویزی پیدا کرتی ہے جو غم کی سنجیدگی اور سوز و ساز کی درد مند حلاوت کا نتیجہ ہے پھر بھی بلند ترین آفاقی شاعری کے چہرے پر یا تو ایک غیبی جھلک ہوتی یا کبھی کبھی اس کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ حسرت مقامات حسن و عشق سے ہنستے کھیلتے اور چھیڑ کر گزر جاتے ہیں۔ لیکن یہ سیر سرسری بھی کتنی رنگا رنگ و فرحت بخش ہے کتنی طربناک ہے کتنی سبک رو ہے "یہ سوز و ساز کم کم" بڑی پیاری چیز ہے ہم نہیں چاہتے کہ ہم سے یہ چھین لی جائے۔ میں یہ سوال اٹھا کر بے جواب دئے چھوڑ دیتا ہوں۔ کہ بیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی کے بعد غزل کی نشاۃ ثانیہ میں سب سے بڑا حصہ حسرت کا ہے یا کسی اور کا؟ لیکن اگر میرے کتب خانے سے امیر و داغ سے لے کر

آج تک کے مشہور غزل گو شعرا کے دواوین چوری ہو جائیں تو مجھے ہر دیوان کے چوری جانے کا غم ہو گا لیکن حسرت کے دیوان کے چوری جانے کا سب سے زیادہ قلق ہو گا !

مصنف کی دوسری کتابیں

من آنم	خطوط کا مجموعہ
اردو غزل گوئی	تنقیدی مجموعہ

بادۂ شبانہ

اختر انصاری

اردو شاعری میں ، اس مجموعہ کلام کی اہمیت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا - اس لئے کہ اختر اس دور کے ایک ایسے شاعر ہیں جو خون جگر ہی سے لکھنا جانتے ہیں - ان کے شعر غور و فکر کے حامل ہوتے ہیں - جو دلوں میں اتر جاتے ہیں اور بھلائے نہیں بھولتے - خود کہتے ہیں -

میرا طرز سخن نرالا ہے   میں نے نالوں کو لَے میں ڈھالا ہے
میرا مجموعۂ کلام اختر   خون کے آنسوؤں کی مالا ہے

اختر انصاری نے اب تک جو کچھ بھی لکھا ہے - یہ مجموعہ ان سب کا انتخاب ہے - اس میں قطعات بھی ہیں ، غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی ———

یہ کتاب بھی زندہ رہنے والی کتابوں میں سے ایک ہوگی -

قیمت تین روپے

ادارۂ فروغ اردو - لاہور

مطبوعہ نقوش پریس اردو بازار لاہور